اپریل ۶۸ء تا ستمبر ۶۸ء

اپریل تا جون ۱۹۶۸ء
جولائی تا ستمبر ۱۹۶۸ء

ترقی اردو بورڈ
URDU DEVELOPMENT BOARD

اردو نامہ

ترقی اردو بورڈ کا باتصویر مجلہ





سفیر جرمنی نے صدر جمہوریہ کی طرف سے جناب ممتاز حسن کو ''آرڈر آف میرٹ'' کا سب سے اعلیٰ اعزاز پیش کیا۔



غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ترقی اردو بورڈ میں ایک مشاورت منعقد ہوئی ۔ دائیں سے بائیں :
شان الحق حقی ، مرزا ظفرالحسن ، سید محمد جعفری ، پروفیسر کرار حسین اور مجتبیٰ حسین ۔

ترقی اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

اردو نامہ

شمارہ ۳۱ - اپریل تا جون ۱۹۶۸ء

مضامین

شذراتِ لغت

متفرقات

سرورق: مولانا عبدالعزیز میمن (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۷)

سید یوسف بخاری منیجر "اردو نامہ" نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا۔

ترقی اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر ۳۲۱۶۳

*

چندہ سالانہ چار روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی-۵
(پاکستان)

مطبوعہ: دی انٹر سروسز پریس لمیٹڈ، کراچی-۴

اردو نامہ

اس بار " مراسلات ،، کے تحت جناب ڈاکٹر گیان چند کا ایک خط شائع کیا جارہا ہے جس میں انہوں نے لغت کے سلسلے میں بعض امور کی وضاحت طلب فرمائی ہے ۔ جو سوالات انہوں نے اٹھائے ہیں ان کی بابت " اردو نامہ ،، کے بعض سابقہ اداریوں میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا ہے ، مگر ڈاکٹر صاحب نے اچھا کیا کہ مزید وضاحت کا موقع دیا ۔ ناظرین ڈاکٹر صاحب کے خط کے ان نکات کو ملاحظہ فرمائیں جن کی بابت ذیل میں صراحت کی جارہی ہے ۔

۱ ۔ ڈاکٹر صاحب نے توجہ دلائی ہے کہ اردو نامے کے شمارہ نمبر ۷ میں ، یعنی جب سے کہ اس میں اقساط لغت کی طباعت کا آغاز ہوا ، اس سلسلے کو " مختصر جلی نسخہ ،، بتایا گیا تھا انہوں نے دریافت کیا ہے کہ کیا ہمارے پاس اس سے زائد مواد موجود ہے جو ان اقساط میں درج ہورہا ہے ۔

جواباً عرض ہے کہ بے شک ہمارے پاس الفاظ و اسناد کا اس سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے جو " اقساط لغت ،، میں شائع ہوتا رہا ہے ۔ ابتدائی اقساط میں زیادہ اختصار برتا گیا تھا ، خصوصاً دکنی مثالوں کے معاملے میں ، لیکن اب یہ التزام کے ساتھ شائع کی جارہی ہے ۔ ان اقساط کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ مسودہ علی العموم اہل الرائے اصحاب کی نظر سے گزر جائے اور کتاب کی طباعت سے پہلے زیادہ سے زیادہ ترمیم کی جاسکے ۔ خصوصاً مثالیں جہاں نہیں ہیں مہیا ہوسکیں ۔ افسوس ہے کہ اس طرف کم ہی اصحاب نے توجہ فرمائی ۔ اب سے پہلے ایک بار ایسے الفاظ کی فہرست شائع کی گئی تھی جن کی سند ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی ۔ اس کے جواب میں ایک بھی اشارہ یا حوالہ وصول نہیں ہوا ۔ مطبوعہ اقساط میں بعض فروگزاشتوں کی گرفت تو ضرور کی گئی ہے ، اور ہم اس کے شکر گزار ہیں مگر صرف ایک دو ہی اصحاب ایسے ہیں جنہوں نے ان فروگزاشتوں کو پر کرنے میں ہماری تھوڑی بہت مدد یا رہنمائی فرمائی ۔ یہ اقساط جلی حروف میں اس لیے شائع کی جاتی ہیں کہ لوگ آسانی سے ان کو پڑھ سکیں ۔ اصل لغت میں جگہ بچانے اور ضخامت کو مناسب حدود میں رکھنے کی خاطر نسبةً " خفی ٹائپ استعمال کرنا ہوگا ۔

۲۔ دوسرا سوال زبان کی حدود کی بابت ہے یعنی کون سا لفظ اردو شمار کرنے کے لائق ہے اور کون سا نہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض اجنبی الفاظ کے استعمال کی مثالیں دی ہیں، مثلاً اکبر کے ہاں انگریزی الفاظ کا استعمال یا بعض مغلق نویسوں کے ہاں عربی لغات کا صرف ۔ ہمارے نزدیک زبان کی حدود کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے ۔ جو الفاظ اردو مصنفین نے اردو

الفاظ کے طور پر استعمال کیے ہیں ہم انہیں مع حوالہ و مثال شامل کرلیتے ہیں۔ متن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ لفظ کی مثال کیا ہے، آیا صرف نقل و اقتباس کے طور پر آیا ہے یا بلا تکلف اردو لغت کے طور پر برتا گیا ہے۔ یہی صورت محاورات کے ساتھ بھی ہے۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہوجائے گا کہ مثال کس مصنف کی ہے، وہ کس عہد یا مقام سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے نزدیک کتنا معتبر یا مستند ہے۔

اصولاً مرتبین لغت نہ واضعین لغت ہیں نہ ناسخ و مصدق۔ ان کا کام زبان کا جائزہ لے کر اس کے نتائج مرتب کر دینا ہے۔ یہی جدید لغت نگاری کا اصول ہے۔ غالباً ہندی شبد ساگر نے بھی عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو ڈاکٹر صاحب نے نقل فرمائے اسی اصول کے تحت شامل رکھے ہوں گے اگرچہ اس میں مثال و حوالہ کا التزام نہیں ہے۔ زبان بڑی وسیع اور کثیر الاستعمال چیز ہے اسے ہر طبقے ہر گروہ، ہر پیشے اور ہر مذاق کے لوگ بولتے ہیں اور ہر عہد میں بولتے آئے ہیں۔ لغت ایک لسانی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ جائزہ جتنا مکمل اور وسیع ہوگا اتنا ہی مفید ہوگا۔

البتہ مآخذ پر کچھ حدود کا عائد ہونا لازم تھا۔ ہم استیعاب کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ جو مآخذ ہماری دسترس سے باہر تھے، یا بدیہی طور پر اہم یا معیاری نہیں تھے، وہ خارج رہے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے امور میں بھی ہم نے اپنے اختیار و تمیز سے کام لیا ہے، مثلاً متن کو جانچنے میں کہ لفظ کس طرح صرف ہوا ہے۔ اکبر کے ہاں "باتئی" کا لفظ ہمارے نزدیک نقل و اقتباس کے ذیل میں آتا ہے، اکبر کی اپنی زبان نہیں۔ برخلاف اس کے عجائب القصص میں قندز صریحاً شاہ عالم کی اپنی زبان ہے۔ ("ایک مسند قاقم و قندز کی کہ جس کی قیمت باہر عقل سے تھی۔") واضح رہے کہ یہ ایک تاریخی لغت ہے جس میں تمام متروک اور متداول الفاظ حوالہ و تاریخ کے ساتھ درج کیے جا رہے ہیں، تاکہ زبان میں عہد بہ عہد اخذ و ترک کا جو عمل ہوتا رہا ہے واضح ہوجائے۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب نے تلفظ کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے۔ بے شک یہ بھی خاصا ٹیڑھا مسئلہ تھا، مگر ہم نے اس معاملے میں وہی سلامت روی اختیار کی ہے جو ہمارے سائنسی طریق عمل کا لازمہ ہے۔ یعنی اپنے موضوع کا جائزہ اور اس کے نتائج کا اندراج۔ ہمارا موضوع اردو زبان ہے جو اپنے بولنے اور لکھنے والوں کے ذریعے پہچانی جاتی ہے۔ بعض الفاظ کا تلفظ قافیے یا وزن کے ذریعے واضح ہوجاتا ہے، مگر اکثر نہیں بھی ہوتا۔ اس سلسلے میں سابقین کے بیان پر اعتبار کرنا پڑتا ہے، یا پھر آخری صورت میں اپنے ذاتی مشاہدے پر۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مورد الفاظ کے اردو تلفظ کو اصل پر فوقیت ہونی چاہیے البتہ بعض صورتوں میں اختلاف بھی مشاہدے میں آتا ہے، یعنی اہل علم ایک طرح بولتے ہیں اور عوام دوسری طرح۔ جن عربی یا دوسرے اجنبی الفاظ کا اردو تلفظ درج کیا جاتا ہے، اشتقاق کے خانے میں ان کی اصل بھی درج کردی جاتی ہے۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب کو اس بات کے جاننے کا بھی اشتیاق ہے کہ دکنی زبان کا کس حد تک احاطہ کیا گیا۔ انہوں نے تاکید فرمائی ہے کہ "لغت دکنی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام کتابوں کے اچھے الفاظ کو خصوصی طور پر شامل کرے۔،، یہ بات ان کے لیے موجب طمانیت ہوگی کہ ہم نے دکنی ادب کو خاصی اچھی طرح کھنگالا ہے۔ اور دکنی ہی پر موقوف نہیں، یہ واقعہ ہے کہ اردو کے تمام ادوار کا تفصیلی مطالعہ اور اس کے لغات کا احاطہ اس وسیع پیمانے پر کبھی نہ ہوا تھا، اور ایسے الفاظ و محاورات کبھی یکجا نہ ہوئے تھے جتنے کہ اب ہوگئے ہیں۔ ہمارے پاس تقریباً دس لاکھ اسناد فراہم ہیں جو گویا ہماری لغت کا خام مواد ہے۔ ان میں سے کس قدر لغت میں صرف ہوں گی یہ کہنا مشکل ہے۔ بے شک بہت سی سندیں فاضل بھی ہیں اور بہت سی مسترد ہوجائیں گی۔ یہ مختلف مآخذ سے مختلف اوقات میں، مختلف لوگوں نے اخذ کی ہیں، اس لیے تواردناگزیر تھا۔ تاہم اس مقدار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ الفاظ و اسناد جمع کرنے میں کتنی کاوش کی گئی ہے۔

معنی کی چھان بین ایک الگ مسئلہ ہے، اور یہ بعض صورتوں میں کتنے درد سر کا باعث ہوتا ہوگا اس کا صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ پھر ایک مرحلہ اشتقاق نگاری کا بھی ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں جنہوں نے اپنی صورت اس طرح بدل لی ہے کہ شناخت مشکل ہے یا ان کی اصل اس طرح گم ہو گئی ہے کہ ڈھونڈے نہیں ملتی۔ ان مسائل میں تحقیق و تفحص جاری ہے۔

ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے، نیز اس امید میں کہ شاید ان کی توجہ سے ہمارے کچھ عقدے حل ہوجائیں۔ ذیل میں دو فہرستیں ایسے الفاظ کی شائع کر رہے ہیں جن کی اسناد ہمیں نہ مل سکیں یا اشتقاق معلوم ہے۔

(س - ح - ح)

سندیں درکار ہیں

مسودہ لغت (جلد اول) میں اندراج کے لیے حسب ذیل الفاظ کے استعمال کی سندیں درکار ہیں۔ اہل علم سے توقع ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرمائیں گے:

اب سب ہونا　(نزع کا عالم ہونا)

ابابیلیا　۱۔ (سیاہ پر، سینہ سفید، کبوتر)
۲۔ (مارا مارا پھرنے والا آدمی)

اباحتی　۱۔ (وہ شخص جو حرام کو مباح رکھتا ہو)
۲۔ (فرقۂ اباحیہ کا پیرو)

اباحت　۱۔ (حرام اور مردار کو جائز قرار دینے کا عمل)
۲۔ (فرقۂ اباحیہ کا طریق عمل)

ابارنا　(باقی رکھنا، جمع کرنا)

اباس　۱۔ (سڑاند)
۲۔ (خمیر)

اباسی　۱۔ (سڑا ہوا)
۲۔ (خمیر اٹھا ہوا)

ابا لنا　۱۔ (ابکائی لینا)
۲۔ (قے کرنا)

ابالا　۱۔ (جوش دیا ہوا جیسے پانی یا دودھ)
۲۔ (پانی وغیرہ میں ڈال کر پکایا ہوا جیسے انڈا یا گاجر وغیرہ)
۳۔ (اچھالا جیسے ایک ابالا آیا اور پانی کئی گز اچھلنے لگا)

ابالی یا ابالی ہنڈیا　(گھی اور مسالے کے بغیر پکایا ہوا سالن)

ابامن　(ہون جو کسی دیوتا یا بندے کی تعظیم کے لیے کیا جائے)

اِبدا　(ظاہر، نمایاں کرنے کا عمل)

اَبدا ابد　(ہمیشہ ہمیشہ)

ابدج　(برساتی کیڑے مکوڑے)

ابدبا　۱۔ (جہالت، نادانی و بےخبری)
۲۔ (ناپاک اور خراب علم)

ابر چھٹنا　(مطلع صاف ہونا، گھٹا کھلنا)

ابر محیط

ابرش　(چتکبرا، کبرا)

ابرن سبرن　(سچی جھوٹی خبر)

ابرنجن　(ہاتھ پاؤں کے زیور خصوصاً پہنچی، پایل)

ابرو پر میل آنا

ابرو کشیدہ　(بھویں تانے ہوئے، تیوری چڑھائے ہوئے، ناراض)

ابرہ چڑھانا　(استر پر ابرہ چسپاں کرنا، پرانے کی جگہ نیا ابرہ لگانا)

ابرہ دینا　(ابرہ چڑھانا)

ابڑ دھبڑ　۱۔ (بے سرے پن، ناموزونیت یا بے ضابطگی و بے سلیقگی کے ساتھ)
۲۔ (گڑبڑ، گھبراہٹ)

ابس　(بے بس)

ابکا　(ڈوری یا رسی کا پھندا)

ابدنی آنا (سد بہ نفرت ہونا)

ابکیت (وہ کویتا جس کے الفاظ گنے ہی نہیں رہ جاتے)

ابکوں باکوں (وسج) ۱-(ابھر ابھر کے غوطہ کھانے کی کیفیت)
۲-(دھکڑ پکڑ، تذبذب)
۳-(امید و یاس کا عالم)

ابلانا (ابلنا کا تعدیہ)

ابلائی ۱-(کمزوری ناتوانی)
۲-(نازک اندامی)

ابلی (مبروص، جس کے جسم پر چھیپ ہو)

ابلوان (ابالنے کو ، بہم جوش)

ابلیست ۱-(سبطنت ، خباثت)
۲-(شرارت ، مفسدہ پردازی)

ابن الغرض (گوں کا یار)

ابنائے عصر ۱-(دنیا کے لوگ)
۲-(دنیا دار لوگ)

ابنہ (علم مناثخ)

ابوالاجساد (گندھک)

ابوتی (وسع) (بھبھوت)

ابہام کرنا (انگوٹھا لگانا)

ابی دبی (گلی ڈنڈا)

ابیل دبیل (دینے والا، بایع)

ابھارے لینا ۱-(پنپنا)
۲-(لہرا لہرا کر اوپر اٹھنا پانی یا ہوا میں)

ابھاگی (سبز قدم (مرد))

ابھرن ۱-(ابھار کی کیفیت)
۲-(اونچائی، نمود)

ابھون (وسع) (نفی)

ابھی راگ (موسیقی کی زبان کی ایک بیماری)

چاپ ۱-(ایک رسم کا نام)
۲-جنم اشٹمی کے موقعے کا چڑھاوا)
۳-(دھونے نل جاول وغیرہ کا ندرانہ جو دوست کی واپسی پر بھیجا جاتا ہے)

چاپٹ (سلے ہوئے اناج کی بھوسی، جو کر وغیرہ)

چانر (جری، بہادر)

چاٹو (جوڑا)

چاٹی (دودھ کی ھانڈی)

چار ٹوک (چار ٹکڑے یا پھانکوں والی چیز)

چار ناری (اکبر اعظم و جہانگیر کے وقت کا چوکھونٹا روپیہ)

چاڑ (پاپوش سازی کا ایک سینگ کا اوزار)

چالی ۱-(بانس کی نیلیوں کا ٹھاٹر)
۲-(زین)
۳-(شریر، چالباز)

چالیسا ۱-(چالیس سے منسوب)
۲-(چالیس برس کی عمر کا آدمی)
۳-(۱۷۸۳ء کا قحط)
۴-(چالیس پہلوانوں کو پچھاڑنے والا شخص)
۵- (وید کے چالیس متبرک اشلوک)

(باقی دیکھیے صفحہ ۱۰۹ پر)

افادات میمنی

عربی لغت نگاری کے موضوع پر ترقیٔ اردو بورڈ میں

علامہ عبدالعزیز المیمنی کے خطبات

تقریر استقبالیہ منجانب جناب ممتاز حسن صاحب، صدر، ترقیٔ اردو بورڈ

"حضرت مولانا! اولاً تو میں ترقی اردو بورڈ کی طرف سے آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس ادارے کی اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ یہ آپ کے ارشادات سے فیض یاب ہو اور اس کے ذریعے سے پاکستان کے اصحاب علم کو فائدہ پہنچے۔ دوسرے آپ سے اجازت چاہوں گا کہ چند سوالات عربی لغت کے متعلق جو میرے ذہن میں آئے ہیں آپ کی خدمت میں پیش کروں، اور مزید یہ کہ جب آپ خطاب فرما رہے ہوں تو اس کے دوران میں بھی کہیں کہیں سوال پوچھ سکوں۔ یہ چند سوال ہیں جو میرے ذہن میں آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی سوال ہوں جو مجھے نہیں سوجھے، بہر حال لغت کے متعلق جو جناب کا علم ہے اس کا اندازہ کرنا میرے لیے تو ناممکن ہے، بھلا آپ سے کیا سوال پوچھوں گا۔ مجھے امید ہے کہ ان سوالات کے علاوہ بھی جو کچھ آپ مناسب سمجھیں گے ارشاد فرمائیں گے۔ سوالات یہ ہیں:

اول: عربی زبان کتنی قدیم ہے؟ اس کی قدامت کا کیا اندازہ آپ لگاتے ہیں؟ یہ میں نے اس لیے پوچھا کہ پہلے پہل جب یہ زبان ہمارے سامنے آتی ہے تو ایسی ترقی یافتہ صورت میں آتی ہے اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس قدر بلند پایہ زبان معلوم ہوتی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ کسی نیم مہذب یافتہ یا غیر مہذب یافتہ قوم کی زبان ہوگی۔ مجھے اکثر ایسا گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسی قدیم تہذیب اور تمدن کی زبان ہے جو شاید فنا ہو گیا اور ہمیں اس کی بابت فی الحال علم نہیں۔ یہ پہلا سوال تھا۔

اس کے بعد میں جناب سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ عربی لغت کی تدوین کی ابتدا کب ہوئی؟ عربی کے بڑے بڑے لغت نگار آپ کی نگاہ میں کون ہیں؟ اور اگر آپ یہ بتا سکیں کہ سب سے بڑا لغت نگار آپ کسے سمجھتے ہیں تو وہ بھی ہمارے لیے باعث ہدایت ہوگا۔ پھر یہ کہ ہندوستان اور پاکستان

کا پایہ عربی لغت نویسی میں کیا ہے؟ یہاں بھی کسی نے اچھی لغت لکھی ہے؟ ہم امام صاغانی کا نام تو آپ سے سنتے ہیں لیکن اس کے علاوہ اور لوگوں کا بھی تذکرہ اگر ہوجائے تو بہت مناسب ہو۔ پھر یہ کہ عربی لغت نگاری کی خصوصیات کیا ہیں؟ وہ کون سی چیزیں ہیں جو عربی لغت نگاری اور عربی لغت نگاروں کو دوسری زبان کے لغت نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں؟

اور آخری سوال جناب کی توجہ کے لیے یہ ہے کہ عربی لغت نگاری نے دوسری زبانوں اور ان کی لغت نگاری پر کیا اثر ڈالا؟

یہ سوال میں نے آپ سے استفادے کے لیے پیش کیے ہیں۔ اب جناب کو اختیار ہے کہ جس ترتیب سے اور جس سمت پر چاہیں گفتگو فرمائیں۔

حضرت علامہ عبدالعزیز المیمنی کی پہلی تقریر کا متن

"میرے محترم حضرت ممتاز صاحب! قبل اس کے کہ ان سوالات کے جوابات شروع کروں آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ مغربی پاکستان میں جہاں عربی قریب قریب مٹتی جارہی ہے وہاں آپ ایک ٹمٹماتا چراغ نہیں بلکہ ایک روشن چراغ بلکہ ایک بجلی کا چراغ ہیں اور آپ کو ان چیزوں سے دلچسپی ہے ورنہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ پاکستان میں عربی کا خاتمہ ہی سمجھنا چاہیے! الحمدللہ۔ جن سوالات سے آپ نے دلچسپی کا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم سوالات ہیں۔ یہاں بولنے کے لیے بھی اور انہی جیسی چیزیں میرے دماغ میں بھی نہیں۔ لہذا میں آپ کو مبارکباد دوں گا کہ آپ نے جو سوالات میرے سامنے رکھے ہیں یہ وہی ہیں جن کو رکھا جانا چاہیے تھا اور وہ اس قابل ہیں کہ ان کی طرف توجہ دی جائے۔

آپ کا جو پہلا سوال ہے اس کا جواب میں مختصراً پیش کروں گا کیونکہ میرا خیال ہے کہ عربی لغت نویسی اور اس کے تدریجی ارتقا کے متعلق جو باتیں معلوم ہیں ان کو اگر پیش کیا جائے گا تو ایک صحبت کی بجائے متعدد صحبتیں درکار ہوں گی۔"

ممتاز حسن صاحب: "امید ہے کہ جناب ان صحبتوں سے بھی ہمیں بہرہ یاب کریں گے۔"

علامہ صاحب: "آپ دعا کیجیے کہ مجھ میں جان رہے تو اگر مجھ سے ہوسکے گا تو میں کوشش کروں گا کہ ان کو پورا کروں۔"

بہر حال آپ صاحبان کا میں بہت شکر گزار ہوں گا کہ اس ماحول میں جس کا میں نے عرض کیا یعنی یہ کہ عربی زبان قریب قریب مٹ رہی ہے اور یہاں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں نظر

آرھی ، ایسی حالت میں چند مبارک صورتیں یہاں جمع ہو گئی ہیں جن سے میں متوقع ہوں کہ آخر تک بھی تشریف رکھیں گے اور کچھ سنیں گے اور میرے متعلق کوئی چیز ہوئی یا ضرورت کی کوئی چیز ہوئی تو وہ بھی پیش کریں گے جیسے ممتاز صاحب نے کچھ سوالات پیش کیے ہیں ۔"

ممتاز حسن صاحب : "مگر وہ بھی تو کہا ہے کسی نے کہ ان الکرام قلیل . . . ."

علامہ صاحب : جی ہاں میں تو نہیں گھبراتا بلکہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ پوری توجہ دے کر ان چیزوں کو سنیں اور اگر ان میں کوئی چیز ایسی ہو جس کو میں بیان نہ کرسکوں تو آپ میری ہدایت کیجیے گا ، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے ، آنحضرت نے فرمایا ہے "ارشدوا اخاکم فانہ ضل ۔" اپنے بھائی کو ٹھیک راستہ بتاؤ وہ راہ راست سے منحرف ہو گیا ہے ۔ یہ آنحضرت کا فرمانا ہے ۔ آپ مجھے بتائیں گے تو میں خوشی سے اس چیز کے متعلق بھی جو کچھ بھی میرے پاس ہوگا عرض خدمت کردوں گا ۔ اچھا پہلے تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں بہت اختصار سے پندرہ بیس منٹ میں عربی شاعری اور عربی زبان کی قدامت کے متعلق جو معلومات میرے پاس ہیں وہ پیش کروں ۔ قبل اس کے کہ میں عربی شاعری اور زبان کی طرف توجہ دوں پہلے یہ عرض کروں گا کہ جزیرۃ العرب کے دو حصے تھے ۔ ایک شمالی اور ایک جنوبی ۔ جنوبی حصہ ہمیشہ متمدن رہا ہے قدیم زمانے میں اور رومی اور یونانی زبانوں میں اس کا تذکرہ آتا ہے اور یہی ذریعہ تھا ہندوستان کی خوشبوئیں اور مصالحے حاصل کرنے کا ۔ ایران سے بھی ان کے تعلقات تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے کچھ ہی پیشتر اصحاب فیل کا واقعہ پیش آتا جو عربی کی تاریخ میں بہت ہی اہم واقعہ ہے ۔ اور اس سے پیشتر جنوبی عرب کے اندر یہودیت آئی اور یہودیت کے بعد نصرانیت اور ان دونوں کے آنے کے سلسلے میں عجیب عجیب واقعات ہوتے ہیں کہ اگر ان کو بیان کرنے بیٹھوں گا تو غالباً عربی لغت ایک طرف رہ جائے گی ۔ ان سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ہاتھ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کو لیں گے اور اس میں جزیرۃ العرب کو دیکھیں گے تو اس کے مقالہ نگار کے نزدیک (اور وہ صحیح خیال پر ہے) سب سے اہم واقعہ عربوں کی تاریخ میں سد مأرب کا تھا ۔ مأرب جو ایک شہر ہے یمن کا اس کے باہر ایک بند بنایا گیا تھا اور اس بند کی وجہ سے جنوبی عرب کی آب پاشی ہوا کرتی تھی ۔ اس آب پاشی کے ذریعے ان کی کاشتکاری ہوتی تھی اور جب وہ بند ٹوٹا ہے تو اس کی وجہ سے جنوبی عرب کے کتنے علاقوں پر کتنے ہولناک اثرات ہوتے ہیں اور وہ قبائل جو ان کے اطراف میں رہتے تھے اور گذارہ کرتے تھے وہ کہاں کہاں چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے کیا کیا ، یہ بھی ایک لمبی داستان ہے ۔ میں اس کو نہیں چھیڑوں گا ورنہ ممتاز صاحب کے جو سوال ہیں وہ بالکل رہ جائیں گے ۔

اب میں چلتا ہوں شمالی عرب کی طرف اور جنوبی عرب کو بالکل چھوڑتا ہوں حالانکہ وہ بہت کچھ کہنے کے قابل ہے ۔ تو لیجیے صاحب شمالی عرب کا یہ حال ہے کہ تہامہ ، غور اور یمن کے علاوہ جو علاقہ خلیج فارس کی طرف ہے اس کو آپ چھوڑ دیں تو باقی حصہ شمالی عرب کہا جاسکتا ہے آگے چل کر شام سے پہلے بلاد الجوف ہے اور جوف عربی میں شمال کے علاقے کو کہتے ہیں جو شام سے قریب تر ہے ۔ وہاں تک یہ زبان تھی ۔

عربوں کے قبائل مختلف تھے اور ایک قبیلے کا دوسرے کی طرف جانا اس زمانے میں ایسا آسان نہیں تھا تو ان کی زبانوں میں ایک خاص قسم کا اختلاف پیدا ہوگیا ۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہندوستان کی بابت آپ نے دیکھا ہوگا ۔ اردو میں دہلی والوں کا کوئی محاورہ ہے ، بہار والوں کا کوئی اور ہے لکھنو والوں کا کچھ اور ہے ۔ عربوں کے یہاں بہت سی چیزوں کے لیے ہر قبیلے میں دوسرے الفاظ ہیں ۔ ایک لفظ ایک معنی کے لیے ایک قبیلے نے استعمال کیا ۔ دوسرا قبیلہ اس لفظ کو نہیں جانتا ۔ جب میں عرب گیا تھا ۱۹۳۶-۳۵ء میں تو میں نے دیکھا کہ وہاں مثلاً شام میں ٹماٹر کو کہتے ہیں 'بنادورہ' اور جزیرہ العرب اور مصر وغیرہ میں آپ جائیں گے تو وہ لوگ کہتے ہیں اوطہ کہ جس کا اصل ہے قوطہ اور قاف کو وہ لوگ الف بولتے ہیں تو اس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ آج بھی ان الفاظ میں کیسا اختلاف ہے یہ بھی ایک چیز نانک لیجیے آپ کی اگر دلچسپی ہوگی تو اس سلسلے میں اور کچھ کہوں گا کہ مترادفات کی عربی میں بڑی بھرمار ہے ۔ تین سو ساڑھے تین سو ہجری کے زمانے میں حمزہ بن الحسن الا صبہانی نے جو بہت بڑا جید عربی لغت ، اور شاعری اور تاریخ کا ماہر اعظم ہے اور جس کی ایک بہت ہی اہم کتاب ہے ، "سنی ملوک الارض والانبیاء" جو آج سے ڈیڑھ سو پونے دوسو سال پہلے کلکتے میں غالباً پہلے پہل چھپی تھی اور قریباً اسی زمانے میں سینٹ پیٹرس برگ میں بھی چھپی تھی ۔ بہر حال ایک بہت بے مثال انسان ہے ۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے " کتاب الموازنہ بین الفارسیۃ و العربیہ" بدنصیبی ہماری کہ فقہ اللغۃ ثعالبی میں قدم قدم پر اس کتاب کا حوالہ ملتا ہے مگر وہ کتاب آج دنیا سے مٹ گئی ہے ۔ صرف دارالکتب المصریہ میں اس کا ایک نسخہ ہے جو پانی میں غرق ہوچکا ہے ، اور جو کچھ رہ گیا ہے وہ بسا غنیمت ہے ۔ خیر تو حمزہ کہتا ہے کہ لفظ داھیہ بمعنی آفت اس کے لیے عربی میں چار سو کلمے ہیں یا میں چار سو کلمے لکھتا ہوں ۔ ہوں گے تو زیادہ ۔ ایک اور حیرت انگیز چیز جو میں آپ سے عرض کروں گا اور درخواست ہے کہ آپ اس پر غور فرمائیں وہ یہ کہ عرب قوم ، جیسا کہ ممتاز صاحب نے فرمایا ، واقع میں بہت محیر العقول ہے کہ با وجود نا تعلیم یافتہ ہونے کے کیا کچھ کر رہی تھی دنیا میں ، اور کیا کچھ کر چکی تھی ؟ یہ کتاب فقہ

اللغہ" ثعالبی جو محمود غزنوی کے زمانے میں لکھی گئی ہے بڑی نفیس کتاب ہے ۔ اس میں اس نے حمزہ الا صبہانی کی کتاب سے چوبیس گھنٹوں کے لیے چوبیس نام دیے ہیں ۔ آپ انگریزی اور فرانسیسی اور حتی یورپ یا ایشیا کی زبانیں ہیں ان میں کوئی زبان ایسی بتا سکتے ہیں کہ ہر گھنٹے کے لیے علیحدہ نام اس میں ہو ؟ اس کتاب کے ایک سو پچاس صفحے پر آپ دیکھیں گے کہ حمزۃ بن الحسن الا صبہانی کی کتاب سے چوبیس گھنٹوں کے چوبیس نام دیے ہیں، الگ الگ ۔ والعھدۃ علیہ ثعالبی لکھتا ہے کہ ساری ذمہ داری اس کے اوپر یعنی حمزۃ بن الحسن کے اوپر ہے ۔ میں نے بھی ان کی کتاب کے علاوہ یہ تفصیل اور کہیں نہیں دیکھی ۔ مگر بہر حال وہ آدمی ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے جعل اور دجل سے کام لیا ہو اور وہ الفاظ تو سب عربی میں موجود ہیں ۔

بدنصیبی ہماری کہ اس کتاب کا حصہ میں نے عرض کیا تھا صرف ایک سقیم نسخہ دارالکتب المصریہ میں ہے ۔ میں نے اس کو دیکھا اور میری یاد داشتوں میں نوٹ کیا ہوا ہے اور افسوس اس کا ہے کہ وہ دنیا سے فنا ہو جائے گی ۔

اب سوال یہ ہے کہ قدیم زمانے میں عربی کی کیا حالت تھی ۔ بدنصیبی یہ کہ عربوں کے یہاں لکھنے پڑھنے کا کوئی رواج نہیں تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ رواج کچھ شروع ہوا اور آنحضرت کی آپ داد دیجیے کہ کتنا بڑا کام کیا ہے جس کو ہم کبھی بھلا نہیں سکتے ۔ اور وہ یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں وہ کفار قریش جو انبار وغیرہ کی طرف گئے تھے اور وہاں سے عربی زبان خط انباری زبان میں لکھنا سیکھ آئے تھے، ان لوگوں سے کہا گیا کہ تم لوگوں میں سے ایک ایک آدمی جو گرفتار ہو کر آیا ہے اگر وہ زر فدیہ ادا کرے تو اسے چھوڑا جائے گا ۔ ان میں کچھ ایسے لوگ نکلے جو زر فدیہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھے ۔ ان کی بابت آپ نے فرمایا کہ اچھا ایسے لوگ جو زر فدیہ ادا نہیں کرسکتے ان سے کہا جائے کہ وہ دو دو مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں ۔ اس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت نے کتنی اہم چیز کی طرف توجہ دی ہے کہ اس کی جتنی داد آج ہم دیں وہ کم ہے ۔ چنانچہ اس طرح کم و بیش تیس آدمی ایسے تھے کہ جنھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ۔ پھر آنحضرت اب کو معلوم ہوگا کہ یہودی جو معاہدے آنحضرت سے ہوتے تھے ان کو عبرانی میں لکھتے تھے اور عبرانی یہاں کوئی جاننے والا تھا نہیں ، معلوم نہیں وہ کیا کا کیا لکھ جاتے تھے یہودی "غدر، یعنی بڑے غدار کہلاتے تھے، تو اس لیے آنحضرت نے حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا اور انھوں نے غالباً ایک مہینے یا اس سے کم مدت کے عرصے کے اندر عبرانی زبان تھوڑی بہت سیکھ لی ۔ اس سے یہ ایک بات تو معلوم ہوئی کہ اس وقت تک عبرانی کا رسم الخط چل پڑا تھا ۔

میں کوئی چار پانچ مرتبہ دمشق جاچکا ہوں اور وہاں پر دو شہروں کے نام مجھے یاد نہیں۔ ان میں سے ایک تو میں بدنصیبی سے بھول گیا اور ایک ابھی تک یاد ہے، وہ ہے معلولا۔ معلولا میں اس وقت تک شامی (Syriac) بولی جاتی ہے۔ میرے ساتھ اوسل خدیوی میں ایک یہودی پڑھتا تھا جو پیرس یونیورسٹی کا ڈاکٹر تھا۔ اور وہ Syriac کا ماہر تھا اس کو یونیورسٹی نے بھیجا تھا کہ تم جاکر کے دمشق میں رہو اور وہاں سے معلولا جایا کرو اور جیسے Syriac کے ڈکشنریوں کے اندر الفاظ پائے جاتے ہیں ان سب کا موجودہ الفاظ سے مقابلہ کرو اور دیکھو کہ کیا کیا تفاوت ہوا ہے اور کتنے کلمے ایسے ہیں جو بولے جارہے ہیں اور ہمارے یہاں لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ تاکہ ہم اپنی ڈکشنری کو لمبا چوڑا کریں۔ اب جناب ممتاز صاحب کے سوال کا ایک تھوڑا سا گوشہ میں نے چھو لیا ہے وہ یہ ہے کہ عربی لغت نویسی کا کہاں کہاں اثر پہنچتا ہے۔

اچھا پھر میں جب فلسطین گیا تھا تو مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ عبرانی زبان میں غالباً تین ہزار یا چار ہزار کے قریب کل مادے ہیں اور ان سے کام نہیں چلتا۔ اس لیے موجودہ یہودیوں نے یہ سوچا ہے کہ ہم اپنی زبان کو مکمل کریں، اور عربی کے جو مادے ہیں ان کو عبرانی طریقے کے اوپر ڈھال کر ان میں سے عبرانی اوزان کے مشتقات بنانے شروع کریں۔ چنانچہ مجھے اس وقت یہ بتایا گیا تھا کہ اس ترکیب سے آٹھ نو ہزار تک ان کی ڈکشنری میں الفاظ جمع ہوگئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ عبرانی نے عربی سے کتنا فیض پایا۔ یہی سریانی کا حال ہے۔ اچھا اور اس کے علاوہ آئندہ میں اس سلسلے میں اگر یاد رہا اور ادھر پہنچ گیا تو مزید ضرور کچھ نہ کچھ عرض کروں گا۔

تو عربی زبان کا احوال یہ ہے کہ بدنصیبی سے عربوں کے یہاں کاغذ نہیں تھا۔ سب سے پہلے قتیبہ بن مسلم نے جب ماوراء النہر کا علاقہ فتح کیا ہے تو سمرقند کے اندر چین کے کاغذ بنانے والے پہنچے ہوئے تھے۔ صحیح سنہ میرے پاس ہے، مگر ٹھیک یاد نہیں غالباً ڈیڑھ سو پونے دو سو ہجری کے قریب تھا۔ تو گویا اس وقت بغداد میں پہلی مرتبہ کاغذ آیا۔ کاغذ کے آنے سے پہلے جن چیزوں پر لکھا جاتا تھا ان کے نام میں عرض کرتا ہوں۔ اونٹوں کے کندھوں کی ہڈیوں پر لکھا جاتا تھا اور دوسری ہڈیوں پر بھی۔ درختوں کے تنوں کے اوپر لکھا جاتا تھا اور بردی کا بنا جو بھوج پتر کی طرح ہے اور جس کا مصر میں رواج ہے اس پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اور جب عمرو بن العاص مصر گئے تھے اور مصر فتح کیا تھا تو انہوں نے اسی بردی کے اوپر معاہدے کیے تھے۔ وہ معاہدے میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں یہ دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے پڑھنے میں بھی میں نے کچھ دلچسپی لی تھی۔ تو اس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ عمرو بن العاص کے زمانے میں عربی خط کی

کیا شکل تھی کیونکہ یہ خط تو آئندہ چل کر جیسے جیسے زبان ارتقا پا رہی تھی، خط بھی ارتقا پا رہا تھا۔ تو جاھلیت کے زمانے سے متعلق بدنصیبی سے ہمیں زیادہ سے زیادہ جو معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے جو اغانی میں ابو الفرج الاصبہانی نے لکھا ہے کہ آل نعمان بن المنذر کے پاس ایک دفتر تھا اور اس دفتر میں انہوں نے تمام وہ قصیدے جو نابغہ اور دیگر شعرا منحل وغیرہ نے ان کی مدح میں لکھے تھے وہ سب اس میں نوٹ کیے گئے تھے۔ مگر پھر اس کا کچھ پتا نہ چلا کہ کیا ہوا؟ بہر حال کچھ لوگوں کو معلوم تھا اور یہ یقینی بات ہے: اگر آپ چاہیں تو فہرست ابن ندیم کو دیکھ لیں ابن ندیم نے جو چیزیں اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں جاھلیت کے زمانے سے لے کر کے اس کے اپنے زمانے تک کی عربی میں، زیادہ تر ہرن کے چمڑوں پر لکھی گئی تھیں یا شتر مرغ کے چمڑوں پر لکھی گئی تھیں، ان کا وہ ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیا کیا کتابیں لکھی گئی تھیں۔ یہ غالباً پہلی کتاب ہے یا واحد کتاب ہے جس نے حضرت علی کے قرآن مجید کی ترتیب جن سورتوں کے اوپر تھی وہ سورتیں سلسلے وار تفصیل کے ساتھ بیان کردی ہیں۔ آپ کو کسی اور کتاب میں شاید ہی یہ چیز ملے۔ مجھے تو یقین نہیں ہے کہ ذہن سے سوا اس کتاب کے تو یہ گویا پھر بعد کو جو حضرت علی کا نسخہ بتایا جاتا ہے اس سے مراد لی گئی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کے نسخے کی ترتیب بھی ہے۔ حضرت علی کے نسخے کی بھی کچھ ترتیب ہے اور یہ ترتیب جو آپ کے سامنے ہے یہ حضرت عثمان بن عفان والی ہے۔ خیر اب میں اور پیچھے ہٹ جاؤں جاھلیت کے زمانے کی طرف تاکہ یہ معلوم ہو کہ جاھلیت میں عربوں کے پاس اپنی زبان کے سلسلے میں کیا تھا۔

سنئے برادران! آجکل جو کتبے دریافت ہونے ہیں پتھروں کے اوپر ان میں سے جنوبی عرب کے کتبوں کو تو چھوڑ دیجیے کیونکہ وہاں یہ عربی زبان نہیں تھی۔ بات میں بات یاد آجاتی ہے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک شمالی عرب کا باشندہ سیف بن ذی یزن حمیری بادشاہ کو جب اسے فتح حاصل ہوئی مبارکباد دینے کے لیے یمن گیا، بادشاہ اس وقت ایک پہاڑ پر شکار کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ اس کو دربان نے اطلاع دی کہ ایک مضری آیا ہے۔ یہ لوگ اس زمانے میں ان کو یعنی شمالی عرب کے لوگوں کو مضری کہتے تھے کیونکہ وہ مضر بن نزار بن معد بن عدنان کے سلسلے کے ہیں تو دربان نے اطلاع دی کہ ایک مصری آیا ہوا ہے، بادشاہ نے کہا کہ اس سے کہہ دو ''ثب،، جب ہم شکار سے فارغ ہوجائیں گے تو دیکھیں گے۔ اب بدنصیبی یہ کہ اس کی زبان میں یعنی عربی زبان میں جسے ہم عربی کہتے ہیں ثب کے معنی ہیں' کود پڑ' تو اس نے اپنی زبان سے ایک فقرہ کہا جو فقہ اللغہ' ابن فارس میں درج ہے یعنی کہ ثب کے معنی کود پڑ، اس کے جواب میں وہ کہتا ہے، ''اذا لتجدنی مطواعاً أیها الملک،، اے بادشاہ اگر آپ مجھے ایسا حکم کریں گے تو میں سر آنکھوں

سے بجالاؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے وہیں سے کود کر جان دے دی۔ جب بادشاہ شکار سے فارغ ہوا تو اس نے پوچھا کہ وہ حضری جو آیا ہوا تھا کہاں ہے؟ درباریوں نے کہا کہ آپ نے ثب کہا تھا بادشاہ بولا ثب کے معنی تو ہیں بیٹھو، انتظار کرو۔ یہ کیا ہوا ہے؟ درباریوں نے کہا کہ صاحب اس کی زبان میں تو ثب کے معنی ہیں کود پڑو چنانچہ وہ کود پڑا اور جان دے دی۔ بادشاہ نے کہا: بھائی ہماری زبان میں ثب کے معنی یہ نہیں ہیں۔ ہم تو ثب کے معنی یہی لیتے ہیں کہ بیٹھو، انتظار کرو۔ چنانچہ یہ بھی مشہور ہے کہ موثبان ایک بادشاہ کا لقب تھا جنوبی عرب کا۔ موثبان، "م۔و۔ث۔ب۔ا۔ن"، اور اس کو موثبان اس لیے کہتے تھے کہ وہ کبھی چڑھائی کرتا ہی نہیں تھا۔ تو گویا وہ بیٹھا رہنے کا عادی تھا، آرام فرمانے والا۔ اس لیے اس کو موثبان کہتے تھے۔ پھر تو بادشاہ نے جب یہ سنا کہ حضری نے کود کر جان دے دی تو اس نے کہا: "لیس عندنا عربیت" ہمارے یہاں عربی زبان نہیں ہے (اس میں بھی عربی جاننے والے پوچھیں گے کہ عربیت کیوں کہا؟ کہنا تو یہ چاہیے کہ لیس عندنا العربیۃ مگر بات یہ ہے کہ ان کے یہاں لمبی ت تھی اور وہ ت جو ہ بن جاتی ہے وقف کی حالت میں وہ ان کے یہاں ہے نہیں۔ من دخل ظفار حمر وہ آدمی جو ظفار شہر کے اندر آجائے گا جو کہ ہمارے اور شمالی عرب کے پاس حد فاصل ہے اسے حمیری میں بات کرنی چاہیے اسے عربی نہیں بولنی چاہیے تو معلوم ہوا کہ عربی کے علاوہ یہ کوئی اور شے ہے۔

اچھا اور جو کتبے آج دریافت ہوئے ہیں ان کے متعلق مجھے اپنی تحقیقات سے یہی معلوم ہوا ہے کہ ان میں حبشی زبان کے الفاظ بہت کثرت سے ہیں اور عربی کے بھی ہیں۔

عربی میں حبشی الفاظ بہت ہیں چنانچہ یہ شیطان جو ہے، جو ہمیں اتنا یاد آتا ہے یہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ یہ بھی وہیں سے آیا ہے۔ اس کے علاوہ پچاسوں لفظ ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ عربوں کے یہاں اسلام سے پیشتر لکھنا پڑھنا تو تھا ہی نہیں تو ان کی تحریری یادگاریں تو رہ ہی نہیں سکتی تھیں لہذا ہمیں کچھ اور ڈھونڈنا پڑے گا۔

ایک بادشاہ تھا جو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اوس شہر میں جو بصریٰ کہا جاتا ہے یعنی عراق اور شام کے مابین کا علاقہ جس کو حوران کہا جاتا ہے اس کا سنہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ غالبا ساڑھے پانچ سو کے لگ بھگ تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی پچاس برس پہلے ہوگا۔ تو وہ جب مر گیا تو انہوں نے اس کی قبر کے اوپر ایک کتبہ لکھا اور وہ نبطی زبان کے حرفوں میں لکھا ہے۔ اس سے ایک چیز پر گرد دیکھیے وہ یہ کہ عربی زبان تو تھی دیس میں مگر اس کا

اپنا رسم تحریر نہیں تھا ورنہ نبطی میں لکھنے کے معنی کیا؟ تو خیر اس کو عربی میں پڑھا گیا ہے۔ زبان عربی ہے اور خط نبطی۔ اور نبطی وہی ہے جس کو انگریزی میں Nabataens کہتے ہیں تو اس کی مجھے پوری تو عبارت یاد نہیں ہے جو یاد رہ گئی ہے وہ سناتا ہوں:

تی نفس مرالقیس بر عمرو ـ تی ـ یہ کے معنی ہذا یا ہذہ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی میں ی ـ یہ، ذی ـ ذہ یہ سب کلمے موجود ہیں۔ تو گویا وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، اور نفس عربی میں مونث ہے بشرطیکہ قبر کے معنی میں مراد نہ لیا گیا ہو۔ نفس کے وہی معنی ہیں جو کہ آپ اردو میں نفس کے معنی سمجھتے ہیں اور وہاں اس نے قبر کے معنی میں استعمال کیا ہے اور لفظ بھی اس کے لیے مونث کا استعمال کیا ہے۔ اور مرء جو ہے وہ امرؤ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ہمارے یہاں نحو کی کتابوں میں لکھا جاتا ہے امرؤ القیس۔ اس قسم کے جتنے کلمے ہیں ان سب میں ایک خصوصیت ہے وہ یہ کہ جو دو حرفوں کے اوپر اعراب آیا ہے۔ تو امرؤ، بہ حالت رفع ہے۔ امرأ بہ حالت نصب، میں امرئ بہ حالت جر میں۔ تو گویا دو دو حرف ہیں کہ جن کے اوپر رفع، نصب اور جر ظاہر ہوا۔ ایک کے اوپر نہیں ہوا ہے۔ اچھا تو اس زمانے کی جو میں نے تحریریں دیکھی ہیں ان سے یہ معلوم ہوا کہ الف وہ غائب کردیتے تھے اور اس کا ثبوت تو آپ کے پاس اب تک موجود ہے۔ وہ یہ کہ قدیم کتابیں جو ملتی ہیں تیسری، چوتھی، پانچویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی، ان کے اندر آپ دیکھیں گے اور دور کیوں۔ اپنے کلام مجید ہی کھول لیجیے بسم اللہ الرحمن الرحیم میں دیکھ لیں تو رحمن میں م اور ن ملے ہوئے ہیں اور (الف) ندارد۔ نعمان کو نعمن لکھتے ہیں اور عثمان کو عثمن لکھتے ہیں الف نہیں لکھتے۔ تو گویا الف کو وہ ایک زائد حرف سمجھتے تھے مستقل حروف میں سے نہ تھا۔

جنوبی عرب میں جو کتبے ملے ہیں عربی سے ان کے سمجھنے میں شاید بہت تھوڑی مدد ملے۔ بہت کچھ حبشی زبان سے ملے گی، اور سبب اس کا یہ ہے کہ یمن اور حبش ان دونوں کے بیچ میں ذرا سا بحر احمر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور بعثت کے مابین کا جو زمانہ تھا اس میں حبشیوں کا اثر یمن میں باقی تھا اور یہ جو ان کے بادشاہ تھے ابرہہ الاشرم مسروق ارباط وغیرہ یہ یمن چار بادشاہ ہوئے تھے اور ان بادشاہوں کو ہٹانے بھگانے کے لیے سیف بن ذی یزن حمیری، خسرو پرویز کے پاس گیا تھا اور وہاں سے مدد مانگی تھی اس نے سوچا کہ اتنے دور دراز ملک میں ہم اپنے آدمیوں کو بھیج کر کیا کریں گے، تو اس کا وزیر جو تھا اس نے ایک بڑی اچھی تدبیر بتائی کہ تمہارے یہاں بہت سے قیدی موجود ہیں وہ ہمیشہ ابد الآباد کے لیے جیل خانوں میں

رهنے والے هیں ۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان سے کہا جائے کہ تم اس لڑائی پر چلے جاؤ اور وهاں لڑو ۔ اگر جیت گئے تو وهاں رہتے سے آزادانہ زندگی گزارو گے ۔ چنانچہ ان کو بھیجا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مبعوث ہوئے هیں اس وقت جو آدمی وهاں موجود تھے ایرانی الاصل اور جو یمن کے گورنر تھے خسرو پرویز کی طرف سے یا اس کے خاندان نسلوں کی طرف سے ، ان میں تئی ایک کے نام تو حدیثوں میں آئے هیں ، مگر وہ مسلمان نہیں تھے ۔

اچھا پھر اب جو کتبے ملے هیں ، سرے میں دو نسخے هیں اس کتبے کے جو ابرهه الاسرم نے لکھوایا تھا ۔ ایک بند جو ٹوٹنے آیا تھا قدیم ہونے کی وجہ سے اور اس کی مرمت کی ضرورت پڑی تھی ۔ اس نے اس کی مرمت کروائی تھی ۔ ورنہ ملک تباہ ہو جاتا ۔ اس نے کتنی محنت اور کتنی مدت میں اس بند کو تیار کیا تھا اس کی تفصیل اس کتبے میں ہے ۔ آج کل کے سبائی اور حمیری زبان کے جاننے والوں نے بہت کوشش کرکے اس کا مطلب نکالا ہے ۔ تفصیلات جو هیں وہ بہت دلچسپ هیں ۔ بات میں بات نکل آتی ہے اس زمانے میں روپے پیسے کے ذریعے معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا بلکہ جیسے همارے یہاں قاعدہ ہے ٹس کے یا الموسم کے ٹکڑے بنا کر دیتے هیں کہ بھائی تم ایک ٹوکری مٹی کی اٹھا کر لاؤ گے تو تم کو ایک یہ ملے گا ۔ اسے جمع کرو تو اس کے بدلے میں اپنے پیسے ملیں گے ۔ جیسے همارے یہاں کا رواج ہے ایسا هی وهاں تھا ۔ ان لوگوں کو معاوضہ دیا جاتا تھا اناج کی شکل میں ۔ تو یہ سب تفصیلات اس کتبے میں لکھی ہوئی هیں مگر میں نے اس کو بہت غور سے دیکھا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی آٹھواں حصہ بمشکل تمام سمالی عربی کا ہوگا کہ جو اس میں کبھی کام آجاتا ہے ۔ اس سے زیادہ نہیں ۔ یہ بھی هماری بدنصیبی کہ اسلام کے زمانے میں حمیری اور سبائی زبان جاننے والوں کی تعداد کم سے کم تر تھی ۔ مشہور تر آدمی اس سلسلے کے همدانی (الحسن) تھے جنھوں نے کتاب الاکلیل لکھی ہے ، نیز جزیرہ العرب پر ان کی کتاب (صفۃ جزیرہ العرب) بڑی معرکہ آرا کتاب ہے اکلیل دس جلدوں میں ہے ، جس میں کی تین چار جلدیں دریافت ہو گئی هیں اور چھپ گئی هیں ۔ اور پروفیسر نولدیکے جو جرمن اورینٹلسٹ تھا وہ اس دنیا سے حسرت لے کر گیا ہے کہ کسی طرح وہ کتاب الاکلیل کو دیکھ سکتا ۔ اس کے زمانے تک آٹھویں جلد کا ایک ٹکڑا ملا تھا جو ملر نے لیڈن سے چھاپا تھا مگر وہ نانمام تھا ۔ اس کے بعد پھر یہ پورا مل گیا اور متعدد نسخے ملے ۔ اب پہلی دوسری ، دسویں یہ سب جلدیں چھپ گئی هیں ۔ باقی چار کے علاوہ نہیں هیں ، اور اس کا سبب یہ بیان کرتے هیں کہ بہت سے قبائلی یمن کے ایسے تھے کہ جن کے مثالب یعنی ان کے عیوب اس کتاب میں آگئے تھے ، تو وہ یہ نہیں چاهتے تھے کہ یہ جلدیں باقی رهیں اس لیے انھوں نے بہت روپیہ خرچ کیا اور محنتیں کیں اور اس کتاب کے نسخے جہاں جہاں سے مل

سکے لے کر تلف کردئیے ۔ یہ آج کا نہیں بہت پہلے کا قصہ ہے ۔ چنانچہ یہ کتاب آپ کے سامنے پڑی ہوئی ہے انبا' الرواہ ؟ بدنصیبی کہیے یا خوش نصیبی مصنف کے والد بزرگوار یمن میں تھے ۔ جب یمن میں ان کا انتقال ہوگیا تو ان کا کتب خانہ یمن سے ان کے پاس بھیجا گیا جو صاحب حلب کے وزیر تھے ۔ بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے اور یہ وہی ہیں کہ یاقوت نے معجم البلدان ان کے نام پر معنون کی ہے ۔ اتنے بڑے عالم ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ والد کے ترکے کے اندر انبیل کی جو جلدیں ملی تھیں وہ صرف یمن حاضر ہیں اور باقی جلدیں غائب ہو گئی ہیں ۔ اور یہ خود مصنف جو ہیں انہوں نے ۶۳۳ھ کے قریب یہ کتاب لکھی ہے ۔ چنانچہ یوں بھی کتابیں ضائع ہوئی ہیں ۔

ہم اب میں پھر واپس آتا ہوں ، عربوں کے قدیم کلام کی طرف ، ابن ندیم یہ کہتا ہے کہ حسن اتفاق سے ایک خطبہ جو آنحضرت کے دادا عبدالمطلب نے دیا تھا ہرن کے چمڑے پر لکھا ہوا میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ۔ اس کی بابت وہ کہتے ہیں کہ اسے خط میں لکھا ہوا تھا جیسے لونڈیوں کا خط ۔ اور یہ بالکل صحیح ہے اس لیے کہ وہ قوم جن کے یہاں تعلیم نہیں ہے اور پھر یہ کہ ابھی کچھ اصول و ضوابط وغیرہ نہیں بنائے گئے ہیں ، رسم الخط نہیں مقرر ہوا ہے تو پھر لامحالہ یہی شکل ہوگی ۔

آج ایک کتابت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی اور ایک امیر معاویہ کے زمانے کی موجود ہے ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحریر تو میں نے دیکھی ہے جبل سلع پر جو کوہ احد کے بالمقابل ہے ۔ افسوس کہ سیری ٹانگوں نے اجازت نہ دی کہ میں چڑھ سکتا مگر بہر حال چڑھنے والے گئے ہیں اور انہوں نے اس کا فوٹو لے لیا ہے جو ہمارے پاس موجود ہے ۔ مگر ایک مرتبہ میں خود وادی عقیق کی طرف گیا تھا اور وہاں جو پہاڑ ہیں ان کے اندر میں نے کبھی تلاش کی تھی تو مجھے ایک کتبہ ملا تھا : " ابوبکر و عمر یستغفران اللہ " یہ الفاظ ہیں یعنی ابوبکر اور عمر خدا سے استغفار کرتے ہیں ۔ اب حیران ہوں کہ یہ کیا ہے ۔ یہ ظاہر بات ہے کہ پچھلے زمانے کے آدمیوں کو تو کوئی ضرورت تھی نہیں کہ ان پتھروں میں کھود کر عبارت لکھیں اور خط بھی ایسا ہی ہے جیسا اس زمانے میں ہو سکتا تھا ۔ نیز میں نے قسطنطنیہ میں مسلمانوں کے قدیم آثار دیکھے ہیں ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دو تلواریں ہیں اور میرا تو خیال ہے دونوں صحیح ہیں ، مگر ایک کے متعلق تحریر نہیں ہے اور ایک کے اوپر ان کے نام کی تحریر ہے ۔ وہ خط خود بتاتا ہے کہ انہی کے زمانے کا ہے ۔ اس میں نہ کوئی لقب ہے نہ کوئی آداب ، صرف عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کچھ نہیں ۔

بہت سے آدمی یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت کے زمانے میں کوفی خط ہوا کرتا تھا ۔ یہ غلط ہے ۔ کوفی خط مصنوعی خط ہے اور یہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں معمولی شکل میں تھا اور دوسری صدی میں اس کا مزید اتقان اور تنمیق کی گئی ہے ۔ اس سے پیشتر کوفی خط ہرگز نہیں تھا اور جو ہے وہ کچھ ہیں ہیں ہے ۔ اس کو آپ خط نسخ نہیں کہہ سکتے البتہ نسخ اور خط رقاع سے بہت قریب ہے ۔

اب جبکہ میں تحریروں کی طرف آگیا ہوں تو قدیم تحریروں کی بابت کچھ اور بتا دوں ۔ ایک امیر معاویہ کے زمانے کا کتبہ ہے جو طائف کے ایک پہاڑ کے اوپر ہے اور پچھلے دنوں وہ نقل شدہ میرے پاس تھا ۔ ممکن ہے میری کتابوں میں کہیں مل جائے ۔ تو وہ بالکل اسی کے زمانے کا ہے ۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں یہ اس واسطے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ورق بردی کے اوپر عمرو بن العاص کے زمانے کے کتبے مصر میں دیکھے ہیں ، ان سے ملتا جلتا ہے ۔ پھر یہ کہ جو کتابوں کی لکھائی میں تکلف و تصنع کو دخل نہیں تھا ان کے خطوط میں نے دیکھے ہیں نیز ایسے آدمیوں کے ہاتھ کی تحریریں دیکھی ہیں جو خطاطین میں شمار نہیں ہو سکتے ہیں ۔ وہ سب یہ بتاتی ہیں کہ اس زمانے میں یہ خط ایسا ہی تھا ۔ البتہ ابن خلکان جو اپنی وفیات الاعیان میں لکھتا ہے کہ خط نسخ کے موجد ابن مقلہ ہیں ، یہ غلط ہے ۔ ابن مقلہ سے بہت پہلے کا خط نسخ میں نے دیکھا ہے ۔ میرے پاس شاید ایک دو مثالیں موجود ہیں ۔ خیر یہ تو عبارت نثر کی بابت تھا جو میں نے آپ کو بتایا ۔

اس سلسلے میں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جس کو ممتاز صاحب نے نہیں چھیڑا تھا ، مگر میں مجبور ہوگیا ہوں کہ اس کی بابت کہوں ۔ وہ یہ کہ عربوں کا حافظہ اس غضب کا ہے کہ اگر آپ اجازت دیں اور میری باتوں کو مبالغے پر محمول نہ کریں ، تو میں ضرور عرض کروں کہ روئے زمین کی کسی قوم کا حافظہ ایسا دیکھا نہ سنا ۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے احمد بن سعید یا (جو بھی نام ہو میرا دماغ تھکا ہوا ہے) وہ ایک رئیس اکبر تھا ۔ اس کی مجلس میں اپنے زمانے کے یعنی دوسری صدی ہجری کے آخر کے دو عربی کے ملک الشعراء حاضر تھے ، ایک ابو تمام اور ایک بحتری جن کا نام دنیا میں مشہور ہے ، تو بحتری نے ایک قصیدہ لکھا اس کا مطلع آپ کو سناتا ہوں :

أ أفاق صب من هوى فأفيقا

مجھ سے پہلے کوئی عاشق ایسا ہوا ہے کہ جس نے عشق کو چھوڑ دیا ہو جو آج تم مجھ سے توقع کرتے ہو کہ میں عشق بازی چھوڑ دوں ،

أم خان عهداً ام أطاع شفيعا

کوئی ایسا احمق ہوا ہے کہ اپنے دوست سے جو عہد تھا اس سے پھر گیا ہو یا اپنے کسی سفارشی کا کہنا مان لیا ہو۔

اس قصیدے میں غالبا سانھ ستر بیت کے قریب ہوں گے۔ میں اتنا ضرور عرض کردوں کہ میں عربی کے جن شعرا کو سب سے بہتر مانتا ہوں ان میں یہ بحتری بھی ہے۔ ابو تمام کا درجہ بہت اونچا ہے مگر زبان جو نیاری ہے وہ بحتری کی ہے۔

ممتاز حسن صاحب: ''دونوں کے حماسہ ہیں''۔

علامہ میمنی: ''حماسہ تو ایک دوسرا موضوع ہے۔ اب یہ الگ ایک مسئلہ چھڑے گا۔،، ممتاز صاحب کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ ابو تمام نے پہلے حماسہ لکھا تھا پھر بحتری نے اس کی نقل اتارتے ہوئے ایک حماسہ لکھا، پھر اور لکھے گئے۔ اس کے لیے پھر کوئی وقت رکھیے تو میں عرض کروں گا۔

خیر جب یہ قصیدہ پورا ہوچکا تو اس وقت ابو تمام وہاں موجود تھا۔ ابو تمام کا حال سنیے۔ بحتری نوجوان تھا اور ابو تمام بھی جوان تھا مگر بالکل جوان نہیں کہہ سکتے۔ ادھیڑ پن سے ذرا پہلے کا دور تھا۔ کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں تھا۔ مگر بڑا استاد تھا ابو تمام۔ یہ وہ آدمی ہے جس نے عربی شاعری کو پرانی روش سے ہٹا کر نئے رنگ میں ڈھالا اور غضب کیا ہے۔ اس کا کلام اس بلا کا ہے کہ عقل کام نہیں کرتی۔ تو جب بحتری کا قصیدہ ختم ہو گیا تو ابو تمام نے کہا، ''صاحبزادے! ،، وہ بیچارہ حیران ہو گیا۔ '' تم نے کمال کردیا۔ میرا قصیدہ چرا کر اور میری ہی موجودگی میں اور میری آنکھوں کے سامنے تم یہاں اس کا صلہ لینے آئے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی! حماسے کام نہیں لیا،، ؟ حیران! اب بحتری بدحواس ہوا۔ بیچارہ جانتا تھا کہ رات بھر محنت کی ہے اور جان کھپائی ہے۔ کہتا ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں اُکھڑ گئے اور بدحواس ہوگیا۔ اس پر احمد بن سعید جو ممدوح تھے اور بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے، ''سنا تم تو میرے رشتے میں ہو۔ یہ تو میرے رشتے میں بھی نہیں ہے، اور تمھیں ضرورت کیا تھی اس قصیدے کو کھولنے کی؟ خواہ مخواہ یہ قصیدہ ان کا لے کر تم نے مجھے سنایا۔ بغیر اس قصیدے کے جو جی میں آتا ہوتا لے گئے ہوتے۔

تمہارا گھر ہی تو ہے یہ۔۔" لیجیے صاحب تو بحتری کہتا ہے یہ ایک اور میرے بھاگنے کا سامان ہوا۔ اب میں کھڑا ہوا اور دروازے تک گیا تو لڑکھڑا رہا تھا۔ کبھی دروازے سے چمٹتا تھا کبھی دیواروں کو تھامتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو ابو تمام کو رحم آگیا، اور وہ خود چل کر آیا اور بولا: "سنا یہ تمہارا قصیدہ ہے، گھبراؤ نہیں، مطمئن رہو۔ مجھے یہ امید تھی کہ میں اس دربار کا شاعر تھا تو تم مجھ سے پوچھ کر اپنا قصیدہ شروع کرو گے، کوئی اور بات نہیں تھی۔۔" تو ایسی سی بات کے لیے اس کی جان لے لی۔ اچھا جو اصل بات تھی وہ تو رہ ہی گئی۔ وہ یہ کہ پہلے احمد بن سعد نے کہا کہ بھائی اس کا تو آسان ترین حل یہ ہے کہ آپ یہ قصیدہ سنا دیجیے اگر آپ کا ہے تو۔ ابو تمام نے کہا ہاں ہاں، بالکل، لیجیے بسم اللہ اور اس نے پورا قصیدہ من و عن سنا دیا۔

اب اس کے ساتھ ڈاکٹر یوسف صاحب جو یہاں موجود ہیں اور عربی میں بہت فاضل ہیں، جانتے ہیں کہ ذیل میں حضرت عبد اللہ بن عباس نے جو عمر بن ابی ربیعہ کا پورا قصیدہ صرف ایک بار سن کر دہرا دیا تھا اور اس پر نافع بن الازرق خارجی نے اعتراض کیا تھا کہ فلاں کلمہ یوں نہیں تھا یوں تھا حالانکہ عبد اللہ بن عباس نے صحیح پڑھا تھا۔ غلطی نافع بن الازرق کی تھی۔ یہ واقعہ اور ابو العلاؒ معری کے سلسلے میں تو اگر کوئی صاحب چاہیں تو میں نے جو کتاب لکھی ہے ابو العلاؒ پر اس میں ایسے کئی حیرت انگیز واقعات ہیں جن میں سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ ابو العلاؒ کے یہاں پڑھنے کے لیے جو ابو زکریا تبریزی تبریز سے آئے ہوئے تھے اور اپنے کندھوں کے اوپر تہذیب ازہری کا نسخہ اٹھا کر لائے تھے اور یہاں آکر ابو العلاؒ کی آخری عمر میں ان سے پڑھتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کچھ لوگ تبریز سے حج کرنے کے لیے خانہ کعبہ گئے تھے، اور مدینہ منورہ میں زیارت کر کے شام چلے گئے تھے انہوں نے کہا کہ ہم تو ابو زکریا تبریزی کے پاس جائیں گے ان کے والد کا پیغام پہنچانے کے لیے، مگر اتفاق عجیب کہ تبریزی اس وقت تھا نہیں، تو ابو العلاؒ نے کچھ اشارہ کر کے اور عربی کے تین چار سادے کلمے بول کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک آدھ آدمی کچھ ٹوٹی پھوٹی سمجھتا تھا۔ ابو العلاؒ نے ان سے کہا کہ تم لوگ اگر ایسا کرو کہ تمہارا جو پیغام ہے وہ مسلسل بولتے چلے جاؤ تو میں کوشش کروں گا کہ اس کو پہنچا دوں۔ کاغذ واغذ کا کوئی سوال نہیں تھا۔ تو وہ کہنے لگے کہ صاحب اپنی عربی ہماری کہاں ہے کہ ہم آپ کو پیغام سنا سکیں انہوں نے کہا اس کی پروا نہیں کسی زبان میں بھی ہو۔ تم میرے پاس بیٹھ جاؤ اور مجھے سنا دو۔ اگر مجھے شبہ ہو جائے گا تو کوئی کلمہ پھر پوچھ لوں گا۔ چنانچہ انہوں نے آذربائیجان کی زبان میں پیغام سنایا۔ عربی

میں آتا ہے بالا ذربدہ، یعنی آذربائیجان کی زبان میں انہوں نے سنایا۔ جب تبریزی آئے تو انہوں نے کہا "کہ بھئی تمہارے مہمان آئے تھے کچھ اس حلیے کے تمہارے وطن سے، اور وہ بیچارے بہت چاہتے تھے کہ تم سے ملیں اور تمہیں کچھ پیغام دیں میں نے ان کا پیغام محفوظ کر لیا ہے۔ اب تم بیٹھ جاؤ، میں تمہیں سناتا ہوں"، چنانچہ انہوں نے آذری زبان میں سنایا۔ پھر ابو العلاؔ کہنے لگے کہ مطلب کیا ہوا؟ وہ بتاؤ۔ تبریزی سے پوچھتے ہیں؟ اپنے شاگرد سے کہ مطلب کیا ہوا؟ کہنے لگے صاحب وہ میرا فلاں رشتے دار مر گیا اور میرا فلاں رشتے دار کا یہ ہوا اور پھر کہنے لگے کہ فلانے کو قتل کردیا۔ اس قسم کے واقعات تھے، اچھا ہوا کہ ان کا پہلے مجھے علم نہ ہوا ورنہ پڑھائی ختم ہوگئی ہوتی۔

عربوں نے پہلے پہلے اپنی زبان کے علوم کو محفوظ رکھنے کے لیے جس چیز پر سب سے زیادہ بھروسا کیا وہ ہے حافظہ، کاغذ واغذ ان کے پاس کہاں تھا؟

بات یہ یاد آتی ہے۔ جب میں تونس گیا تھا تو قیروان شہر کی جامع عقبہ میں جو دنیا کے عجائبات میں سے ہے، ایک مقصورہ ہے جہاں معز بن بادیس خود نماز پڑھا کرتے تھے۔ بڑا پیارا مقصورہ ہے۔ ایسی نفیس لکڑی کا بنا ہوا ہے، شاید اخروٹ کی ہے کہ آج اس کو ایک ہزار (۱) سال کے لگ بھگ ہوا چاہتے ہیں، گھن کا نام نہیں ہے، کوئی اثر نہیں ہوا، بے انتہا خوبصورت۔ اس کے پیچھے امام کی جو جگہ ہے، اس کے پیچھے ایک کمرہ ہے۔ معز بن بادیس کے زمانے کے مصاحف اور مالکی مذہب کی کتابیں ہیں جن میں موطا امام مالک اور اس کی شرحیں، ان کے نام تو مجھے یاد ہیں۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں اور میرے پاس ان کے فوٹو بھی موجود ہیں۔ خیر یہ تو میں نے سب دیکھی ہیں یہ سب ہرن کے چمڑے کے اوپر ہیں اور شاید کوئی ایک آدھ کتاب شتر مرغ کے چمڑے پر بھی ہو۔ اچھا شتر مرغ کا جہاں ذکر آیا تو ایک بات عرض کروں گا کہ جامع القرویین فاس کا، جو قدیم پایہ تخت ہے مراکش کا، اس کا کتب خانہ دنیا میں بے نظیر مانا جاتا ہے، اور جامع القرویین زمین پر مسلمانوں کی سب سے پہلی یونیورسٹی ہے، تو وہاں کے لائبریرین میرے دوست ہیں۔ عابد فاسی ان کا نام ہے۔ تو ان سے میں نے کہا کہ حافظ تم ایسا کرو کہ کچھ کتابیں وہ دکھاؤ جو تمہارے نزدیک بہت اچھی ہوں۔ کہنے لگے ہاں ہاں! یوں کرکے وہ ایک کتاب اٹھا کر لائے۔ اس کا نام تھا کتاب البیان و التحصیل لابن رشد (الجد) یعنی دادا کی لکھی ہوئی ہے جو قرطبہ کے قاضی القضاۃ تھے اور بہت

(۱) اقدم منبر (سنہ ۴۰۹ ھ) من خشب علیہ کتابۃ بالجامع القدیم بالجزائر ۔ ڈاکٹر یوسف

بڑے عالم تھے۔ آپ کے عالم تھے۔ سنہ کتابت ۲۰۰ ہے۔ اس وقت تو مجھے پورا پورا اندازہ نہ ہوا مگر بعد میں کتابیں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ بہترین کتاب ہے جو دنیا میں لکھی گئی ہے .... ابھی تک چھپی نہیں ہے۔ شتر مرغ کے چمڑے کے اوپر لکھی ہوئی ہے۔ میں حیران ہوں چمڑا کہاں سے لائے۔ ایسی خوبی سے کمایا ہے اور اتنا باریک بنایا ہے کہ میری عقل گم ہو گئی۔ اچھا اور آپ جانتے ہیں شتر مرغ کے چمڑے کے جب ورق بنائیں تو کچھ حصہ خالی جگہ کا اس کے اوپر رہتا ہے وہاں حسان لگائی ہیں۔ اس طرح کے بہت سے نسخے ہیں اور میں نے دیکھے ہیں۔ ان کے فوٹو میرے پاس یہاں بھی موجود ہیں۔

سمار صاحب: "مولانا! خط ان نسخوں کا کیا ہے؟"

علامہ سمنی: "مختلف خط ہیں دیکھیے ایک تو مغربی خط ہوتا ہے۔ اس کو مجوہر و مدور مغربی کہتے ہیں۔ وہ اب بھی چلتا ہے۔ میرے پاس بہت سی کتابیں ہیں۔ میں جب سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے لیے کام کر رہا تھا۔ تو مجھے یہ خیال آیا کہ بہت سی مغربی کتابیں لاتا ہوں اور ہمارے پاس اس زمانے میں کس کو شوق ہے کہ وہ مغربی کتابیں پڑھے اور پڑھنا بھی چاہے تو کیسے پڑھے۔ مثلاً فاس کی تاریخ جو ابن ابی زرع کی ہے وہ تین چار مرتبہ چھپی ہے مگر وہی خط مجوہر مغربی میں چھپی ہے۔ تو اس کو یہاں کے لوگ تو نہیں پڑھ سکیں گے۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو کیوں پڑھنا سکھائیں۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی آپ لوگ داد دیں گے میں نے کیا کیا کہ کلام مجید کا ایک نسخہ جو مغربی خط میں چھپا ہوا تھا وہ حاصل کرلیا۔ میں نے کہا مسلمانوں کو آدھا پونا کچھ تو ہر ایک کو کلام مجید حفظ ہے تو وہ کلام مجید کو پڑھا کریں گے۔ اور چونکہ پہلے اپنے خط نسخ میں پڑھنے کے عادی ہیں اس لیے قرآن کے ذریعے بڑی آسانی سے خط مجوہر مغربی کے پڑھنے کی مشق ہو جائے گی۔ اندلس کے خط کی تو کتابیں ہیں۔ میں نے جس کتاب پر کام کیا تھا سمط اللآلی اس کا نسخہ جو ہے اندلس ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اور ڈاکٹر یوسف صاحب نے دیکھا ہے کہ ایک کتاب کا مائکرو فلم میرے پاس ہے جو چھ سو سے کچھ اوپر میں اندلس میں لکھی گئی تھی .... الحواشی والطرر علیا کامل المبرد دونوں میں تھوڑا ہی فرق ہے۔ تو یہ خط کے متعلق آپ کے سوال کا جواب ہوا۔ اب ہم ان خطوط کے قصے میں جائیں گے تو بات کہیں سے کہیں پہنچے گی۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عربوں کے یہاں تحریر کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا تو تیر تو یاد کمتر رہتی ہے اور جو عبدالمطلب کی تحریر ابن ندیم نے دیکھی ہے وہ تو کوئی غالباً پانچ یا چھ کمے

(باقی آئندہ)

سنسکرت اور پراکرتیں

خلیل صدیقی

"اردو نامہ" شمارہ نمبر ۲۸ میں عین الحق فرید کوٹی کے مضمون کا حوالہ بالا عنوان دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ مضمون میں تاریخی و تقابلی لسانیات کے اس اہم موضوع پر داد تحقیق دی گئی ہوگی، لیکن مضمون کا جائزہ لینے پر یہ توقع تو پوری نہ ہوئی البتہ قدم قدم پر سخن گسترانہ موقعے ضرور نظر آئے اور یہ محسوس ہوا کہ عنوان اور متن میں دور ہی کا سا تعلق ہے۔ یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ دو مختلف موضوعات "سنسکرت پر مقامی اثرات" اور "سنسکرت اور اردو" سے متعلق دو نہایت سرسری اور مختصر مضامین جنہیں لسانیات کی مدد سے ترتیب دئے گئے ہیں، اور ان سے ایک مسئلہ کہ نتیجہ بھی مستنبط کرلیا گیا ہے۔ ان کے درمیان مقامی زبانوں پر سنسکرت کے صوتی اثرات کے فقدان کا ذکر، محض گریز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلا حصہ تمہید ہے اور دوسرا بقول مضمون نگار، ان کے مافی الضمیر کی کوشش۔ حسب ذیل لب لباب سے اس حقیقت کا اندازہ ہوسکتا ہے:

پہلا حصہ۔ "نووارد آریاؤں کی زبان نے سندھ کے ساتھ مقامی اثرات (صوتی، صرفی، نحوی، لغوی) کو قبول کیا" لہذا سنسکرت خالص آریائی زبان نہیں۔ اس سے متاثر ہونے والی مقامی زبانیں یا پراکرتیں ہند آریائی نہیں ہیں۔

گریز۔ "آریا مقامی صوتی آہنگ (؟) کو ذرہ بھر بھی متاثر نہ کرسکے۔"

دوسرا حصہ۔ سنسکرت تصریفی ہے، اردو اور شمالی برصغیر کی دوسری زبانیں غیر تصریفی (؟)۔ سنسکرت اور اردو نحو میں بڑی مغائرت ہے۔ سنسکرت اور اردو کے لغوی اشتراک کی یہ توجیہ بھی کی جاسکتی ہے کہ سنسکرت نے اردو کی بنیادی زبانوں سے استفادہ کیا ہوگا۔

نتائج۔ (ا) نووارد آریاؤں کی زبان پر مقامی اثرات کے اثر و نفوذ سے سنسکرت وجود میں آئی۔

(ب) برصغیر کی شمالی زبانیں (بشمول اردو) اور ان کی بنیادی پراکرتیں برصغیر کی قدیم زبانوں سے ماخوذ ہیں۔

(ج) قدیم ہند آریائی کا وجود ایک مفروضہ ہے اور ہڑپائی تہذیب کی دریافت اس کی نفی کرتی ہے۔

مضمون کے متن، طرز استدلال، اقتباسات و حوالہ جات، اصطلاحات وغیرہ کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عنوان کے اجزائے ترکیبی اور ان سے متعلق مضمون نگار کے نقطۂ نظر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

جب تک یہ واضح نہ ہوجائے کہ فاضل مضمون نگار سنسکرت سے کون سی زبان مراد لیتے ہیں، اس وقت تک موضوع کے صحیح حدود نظر کے سامنے نہیں آسکتے۔ بعض لوگوں مثلاً کاڈویل نے ویدوں کی زبان کو ویدک سنسکرت قرار دیا ہے۔ گریرسن، کلاسیکی سنسکرت کی جھلک "براہمنوں" اور "سوتروں" میں دیکھتا ہے، گویا اس کے نزدیک ویدک زبان بول چال کی سنسکرت تھی۔ بھنڈار کرنے "براہمنوں" "یاسک منی" کی لغت اور پانینی کی "استادھیائے" کو درمیانی عہد کی سنسکرت قرار دیا ہے۔ اس سے یہ مبادر ہوتا ہے کہ اس کی رائے میں اس سے پہلے کی زبان (ویدک ؟) سنسکرت نہیں تھی۔ ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے ویدک زبان کو ویدک سنسکرت بھی کہا ہے۔ اے۔ سی۔ ولنر، سنسکرت سے متعلق اشتباہ یوں ظاہر کرتا ہے کہ "جب تک یہ فیصلہ نہ کرلیا جائے کہ سنسکرت کس زبان کو کہتے ہیں، اس وقت تک سنسکرت اور پراکرتوں کے رشتے متعین نہیں کیے جاسکتے۔ اگر سنسکرت سے قدیم آریائی یا ویدک زبان مراد لی جائے تو یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تمام پراکرتیں سنسکرت سے ماخوذ ہیں، اور اگر اس کے خلاف سنسکرت پانینی اور پتنجلی کی زبان ہے تو یہ کہنا غلط ہے کہ پراکرتیں سنسکرت کی بیٹیاں ہیں۔"(۱) مضمون نگار نے سنسکرت کی تاریخی حیثیت اور اس کی لسانی خصوصیات وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی ہے، صرف چند مستشرقین کے اقتباسات کی مدد سے اس پر مقامی اثرات کا سرسری ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر مکڈانل اور اولڈن برگ کے اقتباسات میں ویدک زبان کا ذکر ہے۔ کاڈویل، بنفے، کٹل، گنڈرٹ کے اقتباسات میں سنسکرت کا۔ بعد میں یہ نتائج مستنبط کیے گئے ہیں کہ (۱) سنسکرت خالص آریائی زبان کی ترجمان نہیں (۲) سنسکرت اس زبان کا نام ہے جو نووارد آریائی زبان پر مقامی زبانوں کے اثر و نفوذ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ اس طرح کے بیانات اور اقتباسات سے، جب کہ ان میں خلط مبحث بھی ہو اور سخن گسترانہ سوقعے بھی، سنسکرت سے متعلق مضمون نگار کا تصور واضح نہیں ہوتا۔ کم از کم وہ اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ مذہبی تفاخر اور طبقاتی شعور نے برہمنوں میں زبان کی تنظیم کا رجحان پیدا کیا۔ تنظیم نو کے بعد ان کی زبان "سمسکرت دا کم" پھر سمسکرت اور پھر سنسکرت کہلائی، اسے سہا بھاشا بھی کہا گیا اور دیوبانی بھی۔ پراچیہ آریاؤں کی زبان کو اختلاف کی وجہ سے "اشدھ" کہا گیا، عوامی زبانیں پراکرتیں یعنی فطری کہلائیں اور دراوڑی اور "بھاشا" (سنسکرت میں نافیہ یا حقارت کے معنی دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کاڈویل نے اس سے چھوٹی یا معمولی پراکرت مراد لیا ہے)۔

۱۔ "مبادئ پراکرت" صفحہ ۲ بحوالہ "اردو زبان کا ارتقا"، صفحہ ۶۳

پراکرتوں سے متعلق بھی کوئی مربوط بات نہیں لکھی گئی ہے۔ پراکرتوں کا ذکر چھ بار آیا ہے۔ دو مرتبہ مستنبط نتائج کے سلسلے میں ایک بار ایک حوالے سے اور تین مرتبہ اقتباسات کے ذیل میں۔ صاحب مضمون نے پراکرتوں کو عوامی زبان بھی کہا ہے (اردو نامہ شمارہ ۲۸ صفحہ ۴۴) اور قدیم زبانوں سے ماخوذ بھی بتایا ہے (اردو نامہ شمارہ ۲۸ صفحہ نمبر ۴۸) نیز "آریاؤں کے کلاسکی ادب،، کے حوالے سے "اسر بھاشا،، بھی قرار دیا ہے۔ ایسا مبہم حوالہ علمی مباحث میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ "اسر بھاشا،، کا مترادف پراکرت یا "غیر آریائی بھاشا،، بھی محل نظر ہے۔ شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آریا اپنے ہی ان ہم نسلوں کو اسوروں کی اولاد اور ان کی زبان کو "اسندھ بھاشا،، کہتے تھے جو مشرق میں آباد ہو کر "براتیہ،، کہلائے تھے۔ جن آریاؤں سے مذہب سے غفلت برتنے اور روایات کا احترام نہ کرنے کی وجہ سے احتراز کیا گیا انہیں "وساوا،، کہہ کر حقیر سمجھا جاتا تھا بلکہ "آن آریا،، بھی کہہ دیا جاتا تھا۔

بنفے کے اقتباس میں تحریف بھی کی گئی ہے۔ اس نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ "پراکرتوں میں مروجہ کئی ایک صرفی و نحوی ترکیبیں سنسکرت میں سرایت کر گئیں۔،، اس نے تو صرف یہ کہا ہے کہ جب سنسکرت بول چال کی زبان نہ رہی تو بھی وہ مذہب اور ثقافت کے ترجمان کی حیثیت سے ان وسیع علاقوں پر بھی مسلط رہی جہاں اس سے متفرع بولیاں ہی نہیں بلکہ ایسی بولیوں کا بھی چلن تھا جو مختلف الاصل تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صرف وہ اسالیب جو پراکرت میں داخل ہو گئے تھے بعد میں سنسکرت میں بھی اختیار کرلیے گئے بلکہ،،۔۔۔ (۱) بنفے کے اس اقتباس سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ پراکرت کو آریاؤں کے ورود سے قبل سے مقامی زبان قرار دیا گیا ہے۔ اس میں تو پراکرت کے ایک خاص کردار کا ذکر ہے، وہ یہ کہ اس کے ذریعے سے سنسکرت میں وہ اسالیب بھی داخل ہوئے جو پراکرت خود مستعار لے چکی تھی۔ اس بیان سے پراکرت کے کسی لسانی رشتے یا نسبی حیثیت پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ میکڈانل کے حوالے سے جو اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ پراکرتوں کے سن عیسوی سے کئی صدی پہلے کے لب و لہجے کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن یہ واضح نہیں کرتا کہ پراکرتیں "غیر آریائی،، تھیں۔ ڈاکٹر رام ولاس شرما کے اقتباس سے سنسکرت اور پراکرتوں میں ماں بیٹیوں کے رشتے کی توثیق ہوتی ہے اور مضمون نگار کے نقطۂ نظر کی تردید۔ اقتباس یہ ہے کہ "عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سنسکرت نے بگڑ کر پراکرت کا روپ دھار لیا اور اس نے آگے چل کر اپ بھرنشوں کو جنم دیا، جس سے موجودہ زبانیں وجود میں آئیں۔ ہندی گرامر کی خصوصیات کا نہ تو اپ بھرنشوں

۱۔ بحوالہ کالڈویل صفحہ ۴۶۲

میں نشان ملتا ہے اور نہ پراکرتوں میں۔ میرے اپنے خیال میں شمالی برصغیر کی زبانوں کی بنیادیں ان زبانوں پر استوار ہوئیں جو ارستہ قدیم میں سنسکرت کے پہلو بہ پہلو مروج تھیں۔ ،، ڈاکٹر سرما سنسکرت، پراکرتوں، اپ بھرنسوں، جدید ہند آریائی کے سلسلۂ ارتقا کی صرف آخری کڑی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ اپ بھرنسوں کی صرفی و نحوی خصوصیات پراکرتوں میں اور پراکرتوں کی خصوصیات سنسکرت میں نہیں ملتیں بلکہ وہ پراکرتوں اور اپ بھرنسوں میں ہندی کی صرفی و نحوی خصوصیات کے فقدان کی طرف اشارہ کرتے ہیں (یہ بات بھی محل نظر ہے)۔ وہ جن زبانوں کو ہندی وغیرہ کی بنیاد بتاتے ہیں، انہیں سنسکرت کی ہم عصر قرار دیتے ہیں، غیر آریائی نہیں۔ غرض مضمون میں سنسکرت اور پراکرتوں کے تصور سے متعلق جو خلط مبحث ہے اس کے پس نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں سنسکرت کا کوئی واضح مفہوم ہے نہ پراکرتوں کا۔

تاریخی و تقابلی لسانیات کے اس اہم موضوع سے عہدہ برآ ہونے میں خاصی دشواریاں ہیں کیوں کہ اس کا تعلق مردہ زبانوں سے ہے۔ ان کے حروف ہی پیش نظر رہ سکتے ہیں، آوازیں نہیں۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے عموماً ان زبانوں سے متعلق بالواسطہ ہی کچھ جانتے ہیں، براہ راست نہیں۔ اکثر حضرات کا یہ علم متعدد واسطوں پر مبنی ہے۔ ان زبانوں کی کیفیاتی خصوصیات، نقرہ، زیر و بم، صوتی سطح، سماعتی رنگ آرائی، صوتی کیفیت، امداد، رنگی حیثیت وغیرہ کا تھوڑا بہت بالواسطہ علم سنسکرتی، پراکرتی نحویوں اور مستشرقین ہی کا مرہون منت ہوسکتا ہے۔ اس موضوع پر طبع آزمائی کرنے کے لیے سنسکرت اور پراکرتوں کے سیاسی و سماجی پس منظر، ان کی ماہیت اور لسانی حیثیت کو ابھارنے کے ساتھ ان سے متعلق جو خلط مبحث اور افراط و تفریط نظر آتی ہے اور ان کے رشتوں سے متعلق جو نظریات منظر عام پر آچکے ہیں، ان سب کا تنقیدی جائزہ، ان زبانوں کی ارتقائی منزلوں کی نشان دہی اور ان کے مزاج اور صوتی رجحان کو ابھارنا بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں تقابلی لسانیات کے ان نکات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کسی زبان کا ارتقا عبارت ہے، اس کے صوتی و صورِیاتی تغیرات سے، اور لغوی و معنوی تبدیلیوں سے۔ صرفی و نحوی نشوونما سے اس میں تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ لسانی اعتبار سے صوتی اور صرفی و نحوی تغیرات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آوازیں، معانی و نحو کے مقابلے پر زیادہ محسوس اور صریحی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تنقیح ضروری ہے۔ ان کے تغیرات کا اثر صورِیاتی ارتقا پر بھی ہوتا ہے۔ بعض اعتبار سے ان تغیرات کی نوعیتیں ایک سی ہوتی ہیں یا ان کے رجحان متوازی ہوتے ہیں۔ یہ نوعیتیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کی تعمیم مشکل ہے تاہم صحت کے قریب قریب تعمیم کرکے صوتی تغیرات کے قانون مستنبط ہو سکتے ہیں، مستثنیات کی علمی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں نطقی

اور سماعی نقطۂ نظر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے ۔ تسہیلی رجحان کے ساتھ ساتھ نفرہ دور رس اثرات کا موجب ہوتا ہے ۔ گن ، سندھی ، حذف و سقوط ، ادغام ، تبادل ، تکرار ، اضافہ وغیرہ نفرہ اور لہجے ہی کا نتیجہ ہیں ۔ ماقبل یا مابعد آوازوں کے اثرات کے کرشموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ زبان کی بعض اصوات اس کی بعض ساختوں میں معدوم بھی ہوسکتی ہیں ، اس میں ایسی آوازیں بھی بتدریج وجود میں آجاتی ہیں جو اس کی ماں بہنوں میں نہیں ملتیں ۔ یہ آوازیں غیر سببی زبانوں سے مستفاد بھی ہوسکتی ہیں ، اور ترکیبی عضویاتی یا لسانیاتی بھی ۔ صوتی تغیرات ماقبل یا مابعد آواز پر بھی منحصر ہوسکتے ہیں اور اصل آواز کی عضویاتی یا داخلی خصوصیات پر بھی ۔ عضویات نطق انتہائی قریبی ہمسائے ہیں ۔ دانتوں ، ان کے بچھیڑوں ، مسوڑوں ، سخت اور نرم تالو میں فصل ہی کیا ہے ! اسنانی آوازیں نیم اسنانی اور لسانی یا لثوی بن سکتی ہیں ۔ حلقی ماقبل مصوتے کے کرشمے سے حنکی بھی ہوسکتی ہے (حنکی قانون) شدیدہ ، رخوہ میں اور رخوہ ، شدیدہ میں بدل سکتے ہیں (گرم کا قانون) ، مجہورہ ، مہموسہ ہوسکتی ہے اور مہموسہ ، مجہورہ ۔ ان تمام امور سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تقابلی لسانیات کے اصول ، علم اصوات کے غوامض پر گہری نظر اور سنسکرتی ، پراکرتی عالموں اور مستشرقین سے استفادہ ناگزیر ہے ۔ سنسکرت کے سلسلے میں رگ وید ، اتھر وید ، یجر وید ، سمہ وید ، اسناد دھاتے (پانینی) ۔ نروکتا (یاسکا) ۔ رامائن (تلسی داس) "مہا بھارت" وغیرہ سے اور پراکرتوں کے ذیل میں ورروچی ، کرم دیشور ، ترو ترم ، سمہا راجا ، وراھے میہرا ، سارکنڈیہ ، لکسمی دھر ، ہیم چندر وغیرہ سے براہ راست استفادہ ممکن نہیں ۔ تاہم بالواسطہ استفادہ کیا جاسکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صبر آزما ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے سنجیدہ مطالعے اور اس پر غور و فکر کی ضرورت نہیں سمجھی ۔

زیر نظر مضمون کے ابتدائی دو پیرے غیر متعلقہ ہیں ، جن میں کنایۃً ایک بڑا دعویٰ کیا گیا ہے ، اور وہ دعویٰ ہے ایک نئے نظریے کی پیش کش کا ۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے ، اور کوئی مستنبط نتیجہ ، نظریہ کب کہلا سکتا ہے ، یہ بحث فاضل مضمون نگار کے گزشتہ مضامین سے متعلق ہے اور زیر نظر مضمون سے بے تعلق ، اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں ۔ یوں بھی دراوڑی زبانوں اور شمالی برصغیر کی زبانوں کے روابط سے متعلق مستشرقین بہت پہلے بہت کچھ کہہ چکے ہیں ۔ اس ذیل میں ان کی صدائے باز گشت کو نظریہ نہیں کہا جاسکتا ۔

آگے چل کر تقابلی لسانیات کے منصب اور اصول کی طرف سرسری اور مبہم سا اشارہ کرکے یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ استشراقیات نے تقابلی لسانیات کے لیے راہیں ہموار کیں ، لیکن یہ

کوشش بھی لغزش سے مبرا نہیں ۔ فاضل مضمون نگار مشترک سرمایۂ الفاظ کو لسانی رشتے متعین کرنے کی ایک بنیاد قرار دیتے ہیں ، لیکن سرمایۂ الفاظ میں کسی قسم کی تخصیص نہیں کرتے ۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زبان میں دخیل الفاظ کی ریل پیل بھی ہوسکتی ہے ۔ ان الفاظ کی بنیاد پر لسانی رشتے متعین کرنے کی کوشش مضحکہ خیز ہوتی ہے ۔ ان کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ "چند الفاظ مثلاً سر ، پیر ، بھراتر اور اگنی وغیرہ کی ان (اہل یورپ) کی اپنی زبانوں سے مماثلت کے پہلو نے ہی ان کی توجہ دو بہی طرف مبذول کیا تھا ، لیکن کوئی صدی ڈیڑھ صدی کی مسلسل تحقیق و تدقیق کے بعد ہی ان کے باہمی رشتوں کی توثیق و تصدیق کی گئی۔"(۱) شاید تقابلی لسانیات کی تاریخ پر ان کی نظر نہیں ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے ایک اطالوی پادری Fillipo Sassetti نے اطالوی کے چار ہندسوں یعنی otto ،Sette ،Sei اور nove اور سنسکرت ہندسوں میں مماثلت محسوس کی ، لیکن اس کا یہ مشاہدہ اور احساس کسی تحریک کا موجب نہیں ہوا ۔ ۱۷۶۷ء میں ایک فرانسیسی پادری کورڈو نے "فرنچ اسٹی ٹیوٹ" پیرس کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں سنسکرت اور لاطینی کے بہت سے الفاظ کی طرف توجہ دلائی گئی تھی ۔ اس نے سنسکرت لفظ "اسمی" کی تصریف کا مقابل لاطینی تصریف کی مثلی حلمی صورتوں سے کیا تھا ۔ یہ مراسلہ چالیس سال بعد اس وقت شائع ہوا جب دوسرے علما دونوں زبانوں کی باہمی مماثلت منظر عام پر لاچکے تھے ۔ سر ولیم جونس نے ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء میں کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک مضمون پیش کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ سنسکرت ، یونانی اور لاطینی (قدیم فارسی بھی) ہم اصل ہیں ۔ سر ولیم جونس کی اس دریافت نے سنسکرت کے مطالعے اور دوسری یورپی زبانوں سے مقابل کا رجحان پیدا کیا ۔ ۱۸۰۸ء میں سنسکرت اور بعض یورپی زبانوں کے مقابل پر سلیگل کی معرکہ آرا کتاب شائع ہوئی اور اس طرح تقابلی گرامر کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ رسک کی تصنیف "قدیم فارس (Norse) زبان کا ماخذ" میں لسانی رشتوں کے تعین کے جامع اصول اور ہند یورپی زبانوں (بشمول سنسکرت) کے باہمی رشتوں کو بھی مدلل طور پر پیش کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب ۱۸۱۴ء میں مرتب ہوئی ، لیکن ۱۸۱۸ء میں شائع ہوسکی ۔ ۱۸۱۶ء میں بوپ کی کتاب "سنسکرت کا تصریفی نظام ، یونانی ، لاطینی اور جرمانی زبانوں میں" منظر عام پر آئی ۔ ہمبولٹ (۱۷۶۷ تا ۱۸۳۵ء) نے تو ان زبانوں کی مماثلت کی وجہ سے ان کے خاندان السنہ کو سنسکرتی نام ہی سے موسوم کیا ۔ تقابلی لسانیات کے اس دور اول (ابتدائی انیسویں صدی) ہی میں ان زبانوں کے رشتے مصدقہ اور مسلمہ ہوچکے تھے ، گویا سر ولیم جونس کی دریافت کے اٹھائیس تیس سال کے اندر اندر ہی ۔ اس لیے تقابلی لسانیات کو سنسکرت اور یورپی زبانوں

۱۔ (اردو نامہ، شمارہ ۲۸، صفحہ ۳۰)

کے باھمی رشتوں کی توثیق و تصدیق کی منزل پر پہنچانے کے لیے سو ڈیڑھ سو سال کی مسافت طے کرانا ستم ظریفی ھی ھے۔

آریاؤں کے ورود اور زبانوں کے اثر و نامر سے متعلق کچھ سرسری باتیں کہنے کے بعد فاضل مضمون نگار رقم طراز ھیں کہ "دیکھنا یہ ھے کہ نوواردوں نے مقامی زبانوں سے کیا لیا اور ان کو کیا دیا۔ یہ ایک نہایت ھی تفصیل طلب موضوع ھے۔ ھم اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی کوشش کریں گے۔،، لیکن انھوں نے سنسکرت کی خوشہ چینی کا تو خوب ذکر کیا ھے، اس کے فیضان کا اشارہ بھی نہیں کیا۔

اس تمہید کے بعد نووارد آریاؤں کی زبان پر مقامی اثرات کی شدت کی طرف اشارہ کر کے یہ شکایت کی گئی ھے کہ "محققین کی آرا کی طرف توجہ نہ کی گئی۔،، غالباً فاضل مضمون نگار یہ بات نظر انداز کر دیتے ھیں کہ اب سنسکرت یا قدیم ھند آریائی زبانوں کی طرف متوجہ ہونے کا صرف ایک جواز ھے، وہ بھی جدید زبانوں کے رشتے متعین کرنے یا ان کے ماخذ کی دریافت کے سلسلے میں۔ اس اعتبار سے جتنی ضمنی توجہ دی جانی چاھیے تھی وہ دی جاتی رھی ھے۔ اس ذیل میں سنسکرت پر غیر آریائی یا دراوڑی اثرات کی نشاندھی بھی کی گئی ھے (اجمالی ھی سہی)۔ شاید چٹرجی اور ڈاکٹر مسعود حسن خاں اور اختر اورینوی ھی کی مثالیں کافی ہوں۔

جناب عین الحق فرید کوٹی کے نزدیک چند آوازوں کے مشترک نہ ہونے (ان کا یہ خیال بھی درست نہیں) کی وجہ سے سنسکرت اور دوسری ھند یورپی زبانوں میں صوتی اعتبار سے بعدالمشرقین ھے۔ للعجب۔ ھند یورپی زبانوں کے ماھرین کی نظریں اپنی زبان کی اصوات اور تصریف کی توجیہ کے لیے سنسکرت ھی کی طرف اٹھتی رھی ھیں، تقابلی لسانیات کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد سنسکرت ھی کی مرھون منت ھے، قدیم ترین ھند یورپی یا "پروٹو ایرین،، کی تشکیل جدید کرنے والے تمام علما نے سنسکرت کا سہارا زیادہ لیا ھے۔ سلیخر کی تشکیل جدید کے یہ فقرے Vagham garum vaghantan bharam magham سنسکرت اصوات پر زیادہ دلالت کرتے ھیں۔ ورنر سنسکرت کو قدیم ترین ھند یورپی آوازوں کا امین بتاتا ھے۔ یورپ کے ماھرین لسانیات تو اس بات پر متفق رھے ھیں کہ " سنسکرت میں بنیادی طور پر قدیم ترین ھند یورپی صوتی نظام محفوظ رہ گیا ھے لیکن دوسری زبانیں صوتی اور لسانی اعتبار سے بعد کی منزلوں کی نمائندگی کرتی ھیں۔(۱) اور ھمارے ایک فاضل مضمون نگار سنسکرت اور مغربی زبانوں میں "بعدالمشرقین،، دیکھتے ھیں اور بغیر استدلال کے اسے آریائی کہنے کا اچھوت قرار

۱- "زبان، اس کی ماھیت، ارتقا اور آغاز،، (ٹیسرسن) صفحہ ۹۰

دینے کی ٹھان لیے ہیں ۔ ع انقلابات ہیں زمانے کے ۔ ان کی اس سادگی پر مسکرا کر بھی عرض کیا جاسکتا ہے کہ لسانیات کے بحر بے کراں میں کاڈویل اور میکڈانل جیسے ننھے منے قطروں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ۔ انہوں نے سنسکرت کی چند مخصوص آوازوں کو دراوڑی وغیرہ کے فیضان کا کرشمہ قرار دیا ہے لیکن ان آوازوں کی نوعیتوں ہی کے نام لیے ہیں ، مثالوں کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سنسکرت کی ملفوظی یا لنوی آوازوں سے متعلق گریرسن سے کسی قدر اور کاڈویل سے زیادہ استفادہ کیا ہے لیکن کاڈویل کے ایسے بیانات سے ان کے موقف کی تردید بھی ہوجاتی ہے ۔ کاڈویل نے "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" (دوسرا ایڈیشن صفحہ ۵۴) میں لسانی آواز کو "نام نہاد ملفوظی" قرار دیا ہے ۔ اور آگے چل کر "لسانی یا لنوی آوازوں کی اصل" کے ذیلی عنوان کے تحت اپنا یہ نقطہ نظر ایسے طور پر مدلل انداز میں پیش کیا ہے کہ سنسکرت کی لنوی آوازیں t d n دراوڑی زبانوں کی مرہون منت ہیں ۔ انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں سور کے حوالے سے بنفے کا ایک اقتباس بھی پیش کیا ہے اور بوہلر اور سمز کی آرا کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے ، لیکن سچ پوچھئے تو اس تنقیدی جائزے سے بوہلر اور سمز کی کما حقہ، تردید نہیں ہوجاتی بوہلر نے کاڈویل کی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں پیش کردہ اسی نقطہ نظر سے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "جہاں تک t d n کا تعلق ہے ڈاکٹر کاڈویل کی رائے درست ہے لیکن نحویوں کی شہادت اور جدید پنڈتوں کے تلفظ کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنسکرت t, d, n, sh آوازیں بھی اسی طرح کی لسانی ہیں ۔ دوسری اور چوتھی آوازیں (n, sh) زند میں ہو بہو اسی طرح موجود ہیں جس طرح سنسکرت میں اور پہلی (t) تمام ہند یورپی زبانوں میں مشترک ہے ۔ "(۱) کاڈویل نے اس بیان پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ "مجھے یہ علم تھا کہ sh لسانی آواز ہے اور یہ آواز زند اور سنسکرت دونوں میں ہے ۔ یہ حقیقت کہ sh دراوڑی زبانوں میں ناپید ہے اگرچہ سنسکرت میں عام طور مستعمل ہے ، یہ ثابت کرنے کے لیے مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ وہ لسانی آوازیں جو دراوڑی میں سنسکرت سے زیادہ مستعمل ہیں سنسکرت سے مستعار نہیں ۔ میرے دلائل تیسرے "ورگے" کی لسانی یا لنوی آوازوں یعنی t, d, n سے متعلق تھے ۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ t, d آوازیں اپنی مصوتی نرمی کے باوجود لسانی کہلا سکتی ہیں ۔ میں نے "r" کی لسانی خصوصیت غور کرنا ضروری نہیں سمجھا کیوں کہ یہ آواز مختلف ملکوں میں نہایت لطیف و نازک اختلافات کے باوجود یورپ اور ایشیا کی نامیاتی زبانوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور سنسکرت کی لسانی آوازوں (dn) کے ارتقا کے سلسلے میں اتصالی "ر" کے اثر اور فیضان کا علم سبھوں کو ہے ، اور دراوڑی زبانوں میں

۱۔ "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" (دوسرا ایڈیشن) صفحہ ۳۴

اس عمل (اتصالی "ر" کے اثر) کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔"(۱) کاڈویل کے اس اقتباس میں یہ باتیں قابل غور ہیں: (۱) اس نے اپنا نظریہ ṭ, ḍ, ṇ کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے (۲) سنسکرت اور ژند دونوں میں ایک لسانی یا لثوی آواز کا وجود ہے۔(۳) ṛ, ṛh, ṇ لسانی یا لثوی آواز کا وجود ہے۔ (۴) ṭ, ṭh, ṇ لسانی یا لثوی آوازیں ہیں۔ "ṭ ḍ" تمام ہند یورپی زبانوں میں مشترک ہے اس لیے اس کی لسانی خصوصیت پر بحث نہیں کی گئی۔(۳) سنسکرت کی لسانی یا لثوی آوازوں (ṭ ḍ ṇ) کے ارتقا میں "ṭ ḍ" کے اثرات کا بڑا عمل دخل ہے۔

تعجب ہے کہ کاڈویل (ṭ ḍ ṇ) کے ارتقا کی ایک موجبہ سے متفق ہونے کے باوجود یہ کہتا ہے کہ "چونکہ یہ آوازیں دراوڑی زبانوں کے بیشتر مادوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں اس لیے ان میں ابتدا ہی سے ہیں۔ لہذا دراوڑی نے انہیں سنسکرت سے نہیں لیا بلکہ سنسکرت ان کے لیے دراوڑی زبانوں کی مرہون منت ہے۔" یہ استدلال غیر منطقی اور ناقابل قبول ہے۔

ویبر کی رائے میں اسنانی آوازیں ماقبل 'ر' کے زیر اثر لثوی میں بدل جاتی ہیں۔ بوھلر نے تحریر کیا ہے کہ "کسی پنڈت یا شستری سے برصغیر کی زبانیں سیکھنے والے ہر انگریز نے یہ غور کیا ہوگا کہ اس کا استاد اس کے تلفظ میں لسانی یا لثوی آوازوں کی نہیں بلکہ اسنانی آوازوں کی تصحیح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ (شاگرد) ہمیشہ اسنانی کی بجائے لسانی یا لثوی آوازیں استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریز لسانی یا لثوی آوازوں سے ہی مانوس ہے۔"(۲) بیمز نے اسنانی اور لسانی یا لثوی آوازوں کے تعلق پر سیر حاصل بحث کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "t اور d ادا کرنے کے لیے ہم ٹوٹی مسوڑھے کو نوک زبان سے چھوتے ہیں۔ جنوبی یورپ والے زبان کی نوک سے نسبتاً نچلے حصے یعنی مسوڑھے اور دانتوں کے اتصال کو مس کرتے ہیں، اس لیے ان کی آوازیں نسبتاً نرم ہوتی ہیں۔ ایرانی اور برصغیر کے باشندے نوک زبان سے دانت کو چھوتے ہیں اور زیادہ نرم آوازیں ت، د ادا کرتے ہیں جو صحیح معنوں میں اسنانی ہیں۔ ہم یورپینوں میں اسنانی آواز کا وجود نہیں۔ اطالویوں میں نیم اسنانی اور ایران اور برصغیر میں خالص اسنانی آوازیں ہیں (۳)۔ سنسکرت کے جن الفاظ میں اسنانی ت، د، ن سے پہلے یا بعد "ر" تھا، ان کا تلفظ "ر" کے نسبتاً دور افتادہ تالو کے در در بر واقع مخرج کے زیر اثر واضح اور صاف نہ رہا۔ اسنانی آوازوں اور "ر" کے مخارج "خطۂ نطق"

۱- دراوڑی زبان کی تقابلی گرامر (دوسرا ایڈیشن) صفحہ ۳۵

۲- بحوالہ کاڈویل صفحہ ۳۶

۳- جلد ۱ ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر صفحہ ۲۳۳، ۲۳۵

کے دو سروں پر ہیں، اس لیے ان کی مسلسل ادائیگی میں ایک طرح کی طوالت محسوس ہوتی تو "ٹ اور ڈ،، کچھ اوپر کے مخرج سے اور اس لیے کچھ درشت ادا کیے جانے لگے۔ صوتی قوانین کے زیر اثر "ر،، کے تحت کے بعد یہ آوازیں مسوڑے کے کچھ اوپری حصے سے اس طرح ادا ہونے لگیں کہ لثوی کہلانے لگیں۔ جب فن تحریر کا آغاز ہوا تو اس وقت تک ان آوازوں کے مخصوص تلفظ عادت کی وجہ سے متعین ہوچکے تھے۔ اس لیے ان کے لیے علٰحدہ حروف بھی وضع کر لیے گئے۔(۱) سچ تو یہ ہے کہ ہم جن آوازوں کو لثوی کہتے ہیں وہ دراصل نوٹانک،، کے مترادف ہیں اور ہمارے لیے یہ آوازیں نہیں بلکہ برصغیر کی اسنانی آوازیں عجیب ہیں،،(۲) ہورنلے یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ یورپ (خصوصاً برطانیہ) کی آریائی زبانوں میں نام نہاد اسنانی آوازوں کا مقابلہ صحیح ہند آریائی اسنانی آوازوں سے کیا جائے تو وہ حقیقی اسنانی نہیں بلکہ کم و بیش لثوی ثابت ہوں گی۔ یہ آوازیں زبان سے جب تالو کے سرے یا اوپر کے مسوڑے کو چھونے سے ادا ہوتی ہیں، اس لیے نیم لثوی کہلائی جاتی ہیں۔ برصغیر کے باشندے تلفظ کے نطق فرق کو بھانپ لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ آوازیں لثوی قرار پاتی ہیں۔ خالص اسنانی آوازیں بھی اتنی ہی غیر آریائی ہوسکتی ہیں جتنی خالص لثوی۔ اغلب ہے کہ ابتدائی آریائی آوازیں اگر خالص لثوی نہیں تو نیم لثوی ہوں گی جو برصغیر میں دو صورتیں اختیار کر گئیں، خالص اسنانی اور خالص لثوی،،۔(۳) اس ضمن میں گریرسن کی رائے بھی سن لیجیے "ایک نظریے کی رو سے جب آریاؤں نے شروع شروع میں برصغیر میں قدم رکھا تو دراوڑی زبانوں کے زیر اثر انھوں نے لثوی آوازیں ٹ، ڈ، اختیار کرلیں، جو ابتدائی ہند یورپی میں مفقود تھیں، لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔ یہ تو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر کے مقامی باشندے اپنی زبانوں کی ٹ، ڈ، ن آوازوں کو مخصوص مخارج سے ادا کرنے کے عادی تھے، غیر شعوری طور پر دوسری نئی زبان کے ٹ، ڈ، ن کو انھی مخارج سے ادا کرنے لگے، لیکن انھیں ہر نئی زبان کے ذیل میں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ دراوڑی اور سنسکرت میں اسنانی آوازیں د، ت، ن بھی، ہیں جن کی ادائیگی زبان اور دانتوں کو چھوتی ہے اور لثوی آوازیں ٹ، ڈ، ن بھی جن کی ادائیگی میں نوک زبان مسوڑے یا تالو کے سرے کو مس کرتی ہے۔ ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ سنسکرت میں لثوی آوازیں مخصوص حالات ہی میں ادا ہوتی ہیں۔ خاص طور پر "ر،، کے زیر اثر ایسی صورت میں نوک زبان کی مکررہ آواز عضویاتی اسباب کی بناء پر تالو کے مرکز سے کچھ ہٹ کر ادا ہوتی ہے، اور ماقبل یا مابعد آواز کو اپنے مخرج سے قریب

۱- اور ۲- "جدید ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر،، صفحہ ۲۳۳، ۲۳۵

۳- "گوڈین گرامر،، صفحہ ۹

کرلیتی ہے۔اس طرح مقبل یا مابعد آواز لثوی ہوجاتی ہے۔ سنسکرت میں بھی یہی فطری عمل ہوتا ہے۔ (اس لیے اس کی لثوی آوازیں معاشی آواز کا کرشمہ نہیں ۔ راقم الحروف)۔ ناروے کی مشرقی اور سوئیڈن کی مغربی زبانوں میں یہی عمل دیکھا جاسکتا ہے ۔ ان کے الفاظ barn, kett, bord forst میں r کے بعد n t d اور s لثوی ہیں ۔ Grandgent نے اسی امریکی انگریزی کی آواز d کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ r کے ماقبل اور مابعد اس کی آواز عام موقعوں کے برخلاف دانتوں کے پچھلے سروں یا مسوڑھے کی مدد سے ادا ہوتی ہے مثلاً dry اور hard میں ۔ ان زبانوں میں فطری طور پر لثوی آوازوں کے ازخود پیدا ہونے کی توجیہ کبھی نہیں کی جاسکتی کہ ازمنۂ قدیم کی زبانوں کا فیضان ہیں ۔ ،، (۱)

لثوی آوازوں سے متعلق مغربی ماہرین میں دو اختلاف آرا ہے ، اس سے یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ لثوی آواز کی ساخت پر بھی متفق نہیں ہیں ، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض مغربی زبانوں میں ان کا وجود ہے اور سنسکرت یا برصغیر کی لثوی آوازیں نہ انوکھی ہیں نہ غیر فطری ۔ ان حقائق کی روشنی میں سنسکرت کی لثوی آوازوں سے متعلق مضمون نگار کے موقف کی مدلل تردید ہوجاتی ہے۔

سنسکرت کی تمام حلقی ، حنکی ، غنائیہ آوازوں سے متعلق بھی ایسا ہی بے بنیاد نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کے ذیل میں صوتیاتی مباحث اور مغربی ماہرین لسانیات کے حوالے کم و بیش ایسی ہی تفصیل کے متقاضی ہیں جیسی لثوی آوازوں کے ضمن میں پیش کی جاچکی ہے ۔ لیکن چونکہ ابھی زیر نظر مضمون کے اور بھی حصے اور پہلو توجہ کے مستحق ہیں اس لیے فی الحال ہم فاضل مضمون نگار کی توجہ تقابلی لسانیات کی تاریخ کے اہم صوتیاتی مباحث خصوصاً گرم کے قانون ، حنکی قانون اور ورنر کے مشہور مضمون ”ہند یورپی عنانیے،، سیک سٹائی اور گاتھک زبانوں کی طرف مبذول کرانا ہی مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا جائزہ مذکورہ آوازوں سے متعلق غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہے ۔

سنسکرت کے صرفی و نحوی پہلو پر معاشی اثرات کا ذکر صرف ایک جملے میں کیا گیا ہے اور تین مستشرقین میکڈانل ، اولڈن برگ ، اور بنفے کی تصانیف سے اقتباسات دئیے گئے ہیں ۔ میکڈانل کے اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلاسیکی سنسکرت ویدک زبان سے مشابہت رکھنے کے باوجود صرفی و نحوی لحاظ سے اس سے کچھ مختلف ہے ۔ اولڈن برگ کے اقتباس کا لب لباب یہ ہے کہ قواعد دانوں نے ویدوں کے بھجنوں کی نئی تدوین کے وقت ان کی قدیم اور طبعی ساخت کو اپنے مروجہ اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ گویا اس نے ویدوں کی زبان اور ”براھمنوں اور

۱۔ ”زبان، اس کی ماہیت ، ارتقا اور آغاز ، صفحہ ۱۹۲

سوتروں،، کی زبان کے صرفی و نحوی اصطلاحات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ مضمون نگار ان اقتباسات کو اپنے لیے مفید مطلب کیوں سمجھ بیٹھے۔ بنفے کا جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، وہ براہ راست ''مکمل سنسکرت گرامر،، نہیں بلکہ ''دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر،، صفحہ ۴۹۲ سے اخذ کیا گیا ہے، اس کے ترجمے میں بھی ایک سخن گسترانہ بات ہے۔ بنفے نے یہ ہرگز نہیں لکھا ہے کہ ''دراوڑیوں میں مروجہ لنی ایک صرفی و نحوی ترکیبیں سنسکرت میں سرایت کر گئیں۔،، یہ مضمون نگار کا تصرف ہے یا مبالغہ یا ترجمے کی لغزش۔ سنسکرت کے تاثرات کے اس مفروضہ پہلو کی مدلل وضاحت اور صرفی و نحوی تقابل اور شواہد کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اگر فاضل مضمون نگار سنسکرت کے اخذ و اشتقاق کے طریقوں یا تالیف و ترتیب الفاظ کے اصولوں، اسما مانعہ کے ذیل میں عدد، جنس، حالتوں، صلات ان کے متصرفات، اسما مطلقہ کے مشتقات، وضعی و ثانوی مادوں، مصادر، حاصل مصدر کی صورتوں، فعل معاون کے انداز، تعدیہ، معروف و مجہول کی کیفیتوں، افعال کی صورتوں، گردان کے قاعدوں وغیرہ میں سے کسی کو بھی دراوڑی زبانوں کی گرامر کے اس پہلو کے مماثل دکھا کر دراوڑی مثالوں کو قدیم تر ثابت کردیتے تو ان کا نقطہ نظر سنجیدہ اور غور طلب ہو سکتا تھا اور صحیح معنوں میں لسانیاتی کہلا سکتا تھا۔

سنسکرت پر مقامی اثرات کی بیشتر سنی دہنی لغوی اثرات کے بارے میں بھی صرف چند مستشرقین کے اقتباسات پیش کر کے انتہائی مبالغہ آمیز دعویٰ کیا گیا ہے، لیکن شواہد پیش کرنے اور لسانی استدلال اختیار کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ گریرسن اور میکڈانل کے اقتباسات میں متنازعہ فیہ امور بھی ہیں، لیکن چونکہ ان میں اثرات کا بالکل سرسری سا اشارہ ہے، اس لئے ہم ان امور کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کالڈویل کے اقتباس میں حسب مرضی تصرف کیا گیا ہے۔ اس نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ ''بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کتنے ہی دراوڑی الاصل الفاظ سنسکرت کے لغوی سرمائے میں داخل ہوچکے ہیں،،۔ وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ : "I have long felt persuaded that some words of Dravidian origin have found their way into Sanskrit vocabularies."[1] اس تقابل سے تصرف کی کرشمہ سازی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس اقتباس میں تصرف (یا ترجمہ کی لغزش ؟) کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس اقتباس کے بعد ہی مضمون نگار کی ایک صریحی غلط بیانی موجب حیرت بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ انھوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ ''کالڈویل نے (اپنی) کتاب میں ایک مکمل باب سنسکرت پر دراوڑی اثرات کے لیے وقف کیا ہے،،۔

۱- ''دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر،، صفحہ ۳۰۵

غالباً ان کا اشارہ ''دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر،، کے باب ھشم کی طرف ہے ، جس میں ان اثرات کے سواھد پیش کیے گئے ھیں ۔ اس مکمل باب کی حقیقت بھی سن لیجیے ۔ یہ باب ۴۹۱ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کے دو حصے ھیں (۱) لفظی مماثلتیں (صفحہ ۴۵۲ تا ۵۰۹) اور (۲) ضمیمہ (صفحہ ۵۱۰ تا ۵۹۷ ۔ پہلے حصے میں تین ذیلی سرخیاں ھیں (۱) ھند یورپی مماثلتیں (۲) سامی مماثلتیں (۳) تورانی مماثلتیں ۔ پہلی سرخی کے ذیل میں مباحث کے تین حصے ھیں (۱) ''سنسکرت کے اعلیاً مستعار الفاظ،، کے زیر عنوان اصولی بحث ۔ جرنل آف امریکن اورینٹل سوسائٹی کے ایک مضمون (۱۸۹۲ء) کا حوالہ جس میں کاڈویل پر سرسری تنقید بھی ، نیز ینفے اور گنڈرٹ کے اقتباسات ھیں ۔ بارہ صفحوں میں کل ۶۸ الفاظ سے بحث کی گئی ہے جس میں ۳۱ کاڈویل کی ۴۲ گنڈرٹ کی ۱۳ کٹل کی تحقیقات کا نتیجہ ھیں ۔ (تلگو زبان کے ماھر لسانیات ، سنسکرت ، تلگو ، کنٹری کے پروفیسر ، Ceded Districts کالج ، اننت پور ، اور آندھرا ھسٹاریکل ریسرچ سوسائٹی ، راج مندری ، مدراس ، کے بانی اور پہلے صدر سی ، نارائن راؤ نے اپنی کتاب ''دراوڑی لسانیات،، میں کاڈویل کے پیش کردہ ۲۱ الفاظ سے متعلق اس کے نقطہ نظر کی تردید کی ہے ۔ (۱) ۲۷ الفاظ کے متعلق یہ ثابت کیا ہے کہ کاڈویل نے غلط الفاظ سے تقابل کیا ہے ۔ (۲) (۲) سنسکرت سے مماثلت کے زیر عنوان ایسے ۳۵ الفاظ کی تفصیل ہے ، جو سنسکرت دراوڑی زبانوں میں مشترک ھیں ، لیکن جن کے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ اصلاً کس زبان سے متعلق ھیں اور کس نے کس سے مستعار لیا ہے ۔ (۳) ''مغربی ھند یورپی مماثلتیں،، کے مباحث یونانی ، لاطینی وغیرہ اور دراوڑی کے مشترکہ لغوی سرمائے کا جائزہ ہے ۔ سامی اور تورانی مماثلتوں کے جائزے کے بعد ضمیمے میں ۷ مختلف موضوعات مثلاً ٹوڈا ، گونڈ ، کھونڈ ، راج محل ، بروھی وغیرہ کی دراوڑی خصوصیات ، جنوبی ھند کے لوک گیت ، شودرا یانڈیز ، دراوڑوں کی جسمانی ساخت اور ان کے قدیم مذھب وغیرہ سے متعلق مباحث ھیں ۔ اس بیان سے یہ واضح ھوجاتا ہے کہ کاڈویل کی کتاب کے باب ھشتم کا بارھویں سے بھی کم حصہ (۱۴۹ میں سے صرف ۱۲ صفحات) دراوڑی اثرات کے ذیل میں ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ کاڈویل نے اپنی کتاب کے پہلے باب ''اصوات،، میں ''لسانی یا لنوی آوازوں کی اصل،، کے ذیل میں سنسکرت کی ان آوازوں کو دراوڑی الاصل قرار دیا ہے ۔ (کاڈویل کے اس نقطۂ نظر کی تردید پچھلے صفحوں پر ھو چکی ہے) ۔ اگر اس حصے کو بھی باب ھشتم کے بارہ صفحوں (یا ۶۸ الفاظ کی بحث) میں شامل کرلیا جائے تو بھی ایک مکمل '' باب ،، نہیں بنتا ۔ کسی ''باب،، کے بارھویں سے بھی کم حصے کو '' ایک مکمل باب ،، کہہ دینا ، انتہائی جسارت ہے ۔

۱- ''دراوڑی لسانیات،، صفحہ ۱۲۶ تا ۱۳۰

۲- ''دراوڑی لسانیات،، صفحہ ۱۸۹ ، ۱۹۰

مضمون نگار نے کنل اور گنڈرٹ کے اقتباسات کا بھی سہارا لیا ہے۔ کنل سے منسوب اقتباس بھی ان کی جسارت کا ایک نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسے ان کا ذہنی کرشمہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کنل کی جن بے شمار مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے کاڈویل نے جس سے قدم قدم پر استفادہ کیا گیا ہے، صرف سترہ الفاظ (a, ā سے اور پانچ ہمہ حروف سے شروع ہونے والے) انتخاب کے لائق سمجھے ہیں۔ اس نے ان سترہ الفاظ ہی کو دراوڑی الاصل قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ "میرے نزدیک کنل کے پیش کردہ ہمہ الفاظ کا تعلق اس لفظی سرمایہ سے نہیں جسے دراوڑی الاصل کہا جاسکتا ہے، بلکہ وہ دونوں خاندانوں میں مشترک ہیں" (۱)۔ تعجب ہے کہ کاڈویل کے واسطے سے کنل کا حوالہ دینے کے باوجود، مضمون نگار نے اس پہلو کو کیوں نظر انداز کردیا؟

ڈاکٹر گنڈرٹ کے اقتباس میں بھی تحریف کی مثال ملتی ہے۔ اس طویل اقتباس کی بیس کٹس کے بعد کہا گیا ہے کہ تعجب ہے کہ "گنڈرٹ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ آج بھی ہمارے ماہرین لسانیات پر صادق آتی ہے"۔ غالباً برصغیر کے ۱۸۶۹ء کے بعد (اسی سنہ میں گنڈرٹ کا مضمون شائع ہوا تھا) سے اب تک کے لسانی کارناموں سے اغماض برتا گیا ہے۔

صاحب مضمون نے سنسکرت پر مقامی اثرات کی سند کا محض دعویٰ کیا ہے اور دس اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے بعض غیر متعلقہ ہیں اور بعض میں تحریف و تصرف سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ ان میں بھی محض ان کے دعوے کی معمولی سی تکرار ہی محسوس کی جاسکتی ہے، لیکن انہوں نے یہ قیاس کرلیا ہے کہ انہوں نے لسانیاتی استدلال کا حق ادا کرکے اپنا موقف ہی ثابت نہیں کردیا بلکہ یہ بھی ثبوت فراہم کردیا کہ سنسکرت سے متاثر ہونے والی پراکرتیں ہند آریائی گروہ میں شامل نہیں کی جاسکتیں۔ بحث کا یہ انداز فنی اور لسانیاتی نقطہ نظر پر دلالت نہیں کرتا۔ اول تو سنسکرت میں غیر آریائی عناصر کی "شدید" کارفرمائی ہی ثابت نہیں ہوتی، دوم یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ سنسکرت ان عناصر سے "بہت" متاثر ہوتی ہے تو بھی اس سے یہ مستلزم نہیں کہ اس کی یا اس سے متفرع ہونے والی زبانوں کی نسبی حیثیت مشتبہ ہوگئی۔ اس طرح کے سرسری اقتباسات کی ترتیب سے پراکرتوں کی نئی نسبی حیثیت کا انکشاف ہرگز نہیں ہوتا۔

پراکرتوں کے لسانیاتی رشتے سے متعلق یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ وہ سنسکرت کی بیٹیاں ہیں اور یہ بھی کہ وہ سنسکرت کی بہنیں ہیں۔ بعض ماہرین نے پراکرتوں کو سنسکرت سے زیادہ قدیم بتایا ہے۔ شام سندر داس کی رائے میں پراکرت کے قدیم روپ میں وید منتر لکھے گئے، اور یہی زبان

۱۔ کاڈویل صفحہ ۳۶۶

سمجھ کر سنسکرت کہلائی۔(۱) گویا ان کے نزدیک قدیم ترین پراکرت، ویدک زبان بھی اور وہی سنسکرت کی ماں ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ایک ایسی عوامی زبان کے قائل ہیں جس میں آریاؤں کی ابتدائی زبان اور دیسی دونوں کا میل تھا، جس کو پہلی پراکرت بھی کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی مانا ہے کہ بعض لوگ اس پہلی پراکرت کو ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت دونوں کی ماں مانتے ہیں۔(۲) ڈاکٹر شوکت سبزواری ایک پراکرت (پالی) کو سنسکرت سے قدیم اور اس کے ماخذ کی ہم عصر ثابت کرتے ہیں۔ لیکن ان مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کرنے والے علمائے لسانیات نے پراکرتوں کو ہند آریائی ہی تسلیم کیا ہے۔ اگر صاحب مضمون کا یہ خیال ہے کہ "پراکرتوں اور ہند آریائی گروہ میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے" تو انہیں مذکورہ نقطہ ہائے نظر کی مدلل تردید کرنی چاہئے اور پراکرتوں کی غیر ہند آریائی خصوصیات کو ابھار کر ان کی نسبی حیثیت کو واضح کرنا چاہئے۔ وہ ویدک زبان، سنسکرت، پراکرتوں اور دراوڑی زبانوں کا صوتی اور صرفی و نحوی تقابل کر کے پراکرتوں کی دراوڑی خصوصیات یا دراوڑی زبانوں کی پراکرتی خصوصیات کو ابھارتے، ویدک میں ان کے خدو خال کی نشاندہی کرتے نیز صوتی اور صرفی و نحوی اعتبار سے پراکرتوں کی سنسکرت سے مغائرت اور دراوڑی زبانوں سے مماثلت واضح کرتے اور لسانی اور نسبی لحاظ سے دراوڑی گروہ سے متعلق ثابت کر کے پراکرتوں اور سنسکرت کے باہمی اخذ و استفادے پر روشنی ڈالتے تو موضوع کا حق ادا ہوسکتا تھا۔ اس سلسلے میں سی نارائن راؤ کی کتاب "دراوڑی لسانیات" سے بہت کچھ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب سادھنا پبلسنگ ہاؤس، اننت پور (مدراس) سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوچکی ہے۔

اپنے نتائج کے استنباط کے ضمن میں صاحب مضمون یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ "سنسکرت خالص آریائی زبان کی ترجمانی کا حق پوری طرح ادا نہیں کرتی۔" اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک زبانوں کی نسبی یا نسلی تقسیم، "نسلیات" کی گروہ بندی سے مطابقت رکھتی ہے، ورنہ وہ "خالص آریائی زبان" کی ترکیب استعمال نہ کرتے۔ کسی زبان کو "خالص" یا "نخالص" کہنا یا اسے کسی نسل سے مختص کرنا لسانیاتی نقطۂ نظر کی توثیق نہیں کرتا۔ ہر زبان اپنے ارتقائی سفر میں متعدد اثرات قبول کرتی ہے۔ ہجرت کرنے والی زبانیں ہی نہیں بلکہ جغرافیے کی حدود میں محصور ہو کر رہ جانے والی زبانیں بھی دوسرے خاندانوں کی زبانوں کے تھوڑے بہت عناصر کو اپنے دامن میں جگہ ضرور دے دیتی ہیں۔

۱- ساھتیہ صفحہ ۲۱ بحوالہ "اردو زبان کا ارتقا" صفحہ ۴۶

۲- "تاریخ زبان اردو" پہلا اڈیشن صفحہ ۳۱

مضمون کے اس مختصر سے حصے میں ، جسے شروع میں ہم نے ''گریز،، قرار دیا ہے ، صاحب مضمون صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ''آریا صوتی اعتبار سے مقامی زبانوں کو قطعاً متاثر نہ کر سکے کیوں کہ جو آوازیں وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ مقامی زبانوں میں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ تعجب ہے کہ کاڈویل سے استفادہ کرنے کے بعد بھی انھوں نے یہ رائے کیوں قائم کرلی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کاڈویل کی کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا بلکہ اپنے مفید مطلب حصوں ہی پر نظر ڈالی ہے۔ کاڈویل نے تمام دراوڑی زبانوں کی لسیوں کو دیوناگری سے مستعار بتاتا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ سنسکرت صفیرے ش ، ش ، ثنا تامل میں مفقود ہیں، لیکن دوسری زبانوں میں سنسکرت کے ید سم اور تدبھو (بلکہ دراوڑی نحویوں کے الفاظ میں ''سمسکر تسم ،، اور سمسکرت بھوا) کے تلفظ ہی میں نہیں بلکہ سنسکرتی اثر کے ماتحت خالص دراوڑی الفاظ کے تلفظ میں استعمال کر کے ان الفاظ کو مسخ کردیے ہیں۔(۱) سنسکرت سا تامل میں آکر ایک حنکی آواز میں بدل جاتا ہے جسے سنسکرت ھا کا مترادف کہہ سکتے ہیں۔ تامل میں مخلوط ہائیوں بلکہ ھا کا بھی سراغ نہیں ملتا۔ بقیہ دراوڑی زبانوں میں سنسکرت کے زیر اثر ہائیے استعمال ہوتے ہیں۔ تلگو کے مخلوط ہائیے بھی سنسکرت سے مستعار ہیں۔ ڈاکٹر بلیک (Dr. Bleek) نے ''جرنل آف دی انتھراپولوجیکل سوسائٹی ۱۸۷۱ء میں یہ ایک مضمون سپرد کیا تھا جس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جب دراوڑی برصغیر میں داخل ہوئے تو ان کے ''افعال،، میں ضمیر شخصی کے اختتامیے اور تذکیر و تانیث کے صیغے نہ تھے، لیکن ان کی ادبی زبان اور پھر پڑھے لکھے طبقے کی بول چال میں افعال کی تذکیر و تانیث کا التزام نمایاں ہوگیا۔ یہ سنسکرت کا اثر نہ ہوگا بلکہ زبان کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہوگا۔،،(۲) بلیک کی یہ توجیہ قابل قبول نہیں کیوں کہ دراوڑی زبانوں نے ادبی حیثیت بہت بعد میں ، شمالی برصغیر کے برھمنوں کے جنوب میں ورود کے بعد ان کے زیر اثر ، (براہ راست یا بالواسطہ) انھی کے رسم الخط سے مستفاد رسم الخط کے طفیل ، حاصل کی تھی۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ افعال کی یہ خصوصیت سنسکرت کی مرھون منت ہوگی۔ لغوی اعتبار سے دراوڑی کی تمام زبانوں نے سنسکرت سے بہت کچھ مستعار لیا ہے، لیکن چوں کہ ان اثرات کا اصل موضوع سے براہ راست تعلق نہیں اس لیے اس کی تفصیل بے محل ہو گی۔

سنسکرت اور اردو کی صرفی و نحوی مغائرت کا محض دعویٰ کیا گیا ہے اور پانچ اقتباسات جن سے اس دعوے کے منطقی اور لسانی ثبوت میں کوئی مدد نہیں ملتی پیش کئے گئے ہیں۔ بعض اقتباسات

۱- کاڈویل صفحہ ۳۰ تا ۳۱

۲- کاڈویل، تمہید صفحہ ۷۵

ایسے مضمون لے بھی ہیں جنہیں تقابلی لسانیات کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ الفنسٹن مورخ ہے ، ماہر لسانیات نہیں۔ کولبروک "لسانیات" میں کوئی مقام حاصل نہ کرسکا۔ ان سے ہٹ کر صاحب مضمون نے جہاں خود کچھ کہنا چاہا ہے ، ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ سنسکرت اور دوسری ہند یورپی زبانوں کو تصریفی اور شمالی برصغیر کی تمام زبانوں (بشمول اردو) غیر تصریفی قرار دیے ہیں۔ "غیر تصریفی" لسانیاتی اصطلاح نہیں۔ اگر کوئی زبان صورتیاتی اعتبار سے تصریفی منزل پر نہ پہنچ سکے تو وہ تالیفی منزل پر ہوسکتی ہے یا پھر وہ ارتقا کی پہلی ہی منزل یعنی اصلی یا بنیادی یا انفرادی پر۔ غالباً غیر تصریفی سے ان کی مراد تالیفی ہے۔ اگر وہ زبان کی ارتقائی منزلوں کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھ کر شمالی برصغیر کی زبانوں کے مادوں ، مشتقات ، تالیف الفاظ اور وضع کلمات کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ یہ تمام زبانیں تصریفی یا استقاقی ہیں اور خصوصاً اردو تو تحلیلی منزل پر قدم رکھ چکی ہے۔ ممکن ہے کہ اردو کی تحلیلی حیثیت سے انہیں مغالطہ ہوا ہو۔

مضمون نگار کا یہ موقف کہ شمالی برصغیر کی زبانوں کی صرف و نحو کیمہ غیر سنسکرتی ہے ، کاڈویل اور دوسرے مستشرقین کے فیضان کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے اس موقف کا کوئی لسانیاتی استدلال پیش نہیں کیا۔ اگر وہ ان زبانوں اور دراوڑی زبانوں کی گرامر کی ان ساٹھ شقوں کو جنہیں کاڈویل نے اپنی کتاب کی تمہید میں (صفحہ ۶۱) میں بیان کیا ہے ، پیش کرکے شواہد بھی ڈھونڈ لیتے تو کم از کم ان زبانوں کے باہمی روابط منظر عام پر آسکتے تھے۔

سنسکرت اور اردو کے لغوی اشتراک کی یہ توجیہ کہ "سنسکرت نے اردو کی بیس رو زبانوں سے استفادہ کیا ہوگا" علمی نہیں محض قیاسی ہے اور شواہد کی محتاج۔ اس ضمن میں گراؤر کا حوالہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ وہ تو اس موقف کا مخالف ہے۔

صاحب مضمون کا یہ استنباط کہ "سنسکرت اس زبان کا نام ہے جو نووارد آریاؤں کی زبان پر مقامی اثر و نفوذ سے وجود میں آئی" ، لسانیاتی استدلال کا نہیں بلکہ مستشرقین کے حوالہ جات کا مرہون منت ہے۔

زیر نظر مضمون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نووارد آریاؤں کی ایک مخصوص معین زبان کے قائل ہیں لیکن حیرت ہے کہ مضمون کے آخر میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "جب انہیں (ماہرین سنسکرت) کو مقامی زبانوں اور سنسکرت میں فرق نظر آیا تو اس تفاوت کے بارے میں تحقیقات کرتے وقت بجائے ارد گرد نظر ڈالنے کے ایک فرضی قدیم ہند آریائی زبان کا وجود تراش لیا

گیا جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ سنسکرت سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس سے مشابہ تھی، لیکن اس فرضی زبان کے خد و خال اور خصوصیات کے بارے میں وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھا۔،، (اردو نامہ نمبر ۲۸ صفحہ ۴۸) ۔ اس بات سے قطع نظر کہ آریاؤں کے برصغیر میں ورود کے وقت ان کی کوئی مخصوص معین زبان تھی یا ان کی متعدد بولیاں تھیں ، یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ صاحب مضمون نووارد آریاؤں کی ایک مخصوص زبان تسلیم کرنے کے باوجود قدیم ہند آریائی کو ایک مفروضہ یا ذہنی اپج بھی قرار دیتے ہیں ۔ گویا ان کے نزدیک انہی کی تسلیم کی ہوئی نووارد آریاؤں کی زبان ہند آریائی نہیں کہلاسکتی ۔ ستم ظریفی یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ''ہڑپائی تہذیب کی دریافت کے بعد قدیم ہند آریائی زبان کے مفروضے کو ایک امر مسلمہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔،، ہڑپائی تہذیب کی دریافت نے کوئی لسانی گتھی نہیں سلجھائی ہے ۔ ابھی تو وادئی سندھ کی قدیم تہذیب کی زبان خود بھی ایک راز سربستہ ہے ، اس کی وجہ سے قدیم ہند آریائی زبان کے عدم وجود کا جواز کس طرح پیدا ہوجاتا ہے ؟ چند سطروں میں ایسی متضاد و متخالف آراء کا اظہار اور انکل پچو کسی لسانی نتیجے کا استنباط ان کے لسانیاتی نقطہ نظر کی توثیق نہیں کرتا ۔

مضمون نگار کا یہ خیال (جسے بہت سے ماہرین لسانیات بہت پہلے پیش کرچکے ہیں) کہ آریا ایک مخصوص زبان لے کر برصغیر میں وارد ہوئے ، درست نہیں ۔ اکثر ماہرین لسانیات نے اس خیال کی تردید کی ہے ۔ آریاؤں کی آمد کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا ۔ ان کے متعدد گروہوں میں مختلف طبقوں اور پیشوں کے لوگ بھی تھے ۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ ان کی متعدد بولیاں ہوں گی، زمان و مکاں کے تفاوت نے انہیں ایک دوسرے سے متفاوت کردیا ہو گا ، لیکن کوئی معیاری زبان بھی وجود میں آئی ہو گی ، جس میں کم و بیش تمام بولیوں کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں ہوں گی ۔ ایسے اس قدیم دور کی ''لنگوا فرینکا،، بھی کہا جاسکتا ہے ۔ اسی کو قدیم ہند آریائی کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے ۔ اسی کی جھلکیاں ''رگ وید'' میں ملتی ہیں ۔ ''رگ وید،، قدیم ترین ہند آریائی کا پہلا مستند نقش ہے ۔ میکس ملر اس کی تخلیق ۱۲۰۰ ق ۔ م کے لگ بھگ بتاتا ہے ۔ Dr. Winter Mitz کی رائے میں اس کی تخلیق کا زمانہ ۳۰۰۰ ق ۔ م کے آس پاس متعین کیا جاسکتا ہے ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ اس کے کچھ حصے ۲۵۰۰ ق ۔ م کے لگ بھگ اور کچھ آٹھویں صدی قبل مسیح میں وجود میں آئے ۔ رگ وید میں زبان اور اسالیب کی جو رنگا رنگی اور ایک ہی لفظ کی جو مختلف صورتیں ملتی ہیں اور جو جغرافیہ نظر آتا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تخلیق میں متعدد پنڈتوں کی کاوشیں شامل ہیں ، اس کی سنگھتائیں اور اس کے منتر

کئی صدیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں اور وہ مختلف مقامات پر وجود میں آتے ہیں ۔ اس کی زبان کی پرچھائیاں اتھر وید ، یجر وید ، سمہ وید اور ابتدائی برھمنوں میں بھی نظر آتی ہیں ۔ اس میں برصغیر کے آریاؤں کی مختلف بولیاں بھی آنکھ مچولی کرتی نظر آتی ہیں ، لیکن ہیں یہ سب ہم اصل ۔ قدیم ہند آریائی کے خد و خال کی نشاندھی بھی کی جاتی رہی ہے ع

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

صاحب مضمون قدیم ہند آریائی کو ترجیحی طور پر نہیں سمجھتے ۔ پراکرتوں کو بھی غیر ہند آریائی قرار دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہند آریائی گروہ کے وجود کے قائل بھی نظر آتے ہیں ۔ پہلی دو صورتوں کی رو سے آریاؤں کی ابتدائی زبان (اور اس سے متعلقہ بولیاں) ہی نہیں بلکہ برصغیر کی کوئی اور زبان (سوائے سنسکرت کے) ہند آریائی نہیں کہلائی جاسکتی ۔ لیکن اگر وہ سنسکرت کے علاوہ کچھ اور ہند آریائی زبانوں کے قائل ہیں تو وہ پراکرتوں کے سوا اور کون سی ہو سکتی ہے؟ یا ان کے نزدیک صرف سنسکرت "ہند آریائی گروہ" کہلا سکتی ہے ؟

متن کے جائزے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس میں مرکزیت ہی مفقود نہیں بلکہ بیانات میں منطقی ربط و تسلسل کا فقدان بھی ہے اور ہر موقف لسانیاتی استدلال کا محتاج بھی ۔ نیز یہ کہ صاحب مضمون یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پراکرتیں قدیم مقامی زبانوں سے ماخوذ ہیں ، ان پر سنسکرتی اثرات ضرور ہیں ، لیکن انہیں ہند یورپی خاندان کا ایک گروہ نہیں سمجھنا چاہئے ۔ ان پراکرتوں سے جنم لینے والی زبانیں ہند آریائی نہیں کہلاسکتیں ۔ لیکن وہ ان خیالات کی صحیح ، مربوط اور مدلل وکالت نہ کرسکے ۔ ان کے یہ خیالات بھی ان کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ نہیں بلکہ مستشرقین کا خصوصاً کاڈویل کی کتاب "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" کے جستہ جستہ حصوں کا کرشمہ نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے مذکورہ خیالات کو حوالہ جات اور اقتباسات ہی کے سہارے پیش کیا ہے اور ستم ظریفی یہ کی کہ ان کی پیش کش میں موضوع کے حدود ، اس کی وسعت ، ترتیب ، تنظیم ، ربط و تسلسل اور استدلال میں سے کسی کو بھی ملحوظ نہ رکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہمال اور خلط مبحث کے ساتھ ساتھ لغزشیں بھی ہوتی گئیں ۔ حوالہ جات اور اقتباسات بھی ایسے پیش کیے گئے ہیں جن میں محض دعاوی کی تکرار ہے یا ان کی صدائے بازگشت صاحب مضمون کے دعوے میں ملتی ہے ۔ ان میں سے بعض بے محل ہیں ، بعض غیر وقیع ، کچھ میں تحریف و تصرف سے بھی دریغ نہیں کیا گیا ، کچھ بالواسطہ اور کچھ واسطہ در واسطہ اخذ ہوئے ہیں مثلاً :

۱ ۔ ہرمین اونڈ برگ کا اقتباس بالکل بے محل ہے ۔ اس سے مضمون نگار کے موقف کو (سنسکرت صرف و نحو پر مقامی اثرات) کسی قسم کی مدد نہیں ملتی ۔ اس میں تو صرف یہ بتایا گیا

ہے کہ بھجنوں کی نئی تشکیل میں بعض قدیم الفاظ کی جگہ رائج الوقت الفاظ داخل کیے گئے اور قواعد دانوں نے ویدوں کی زبان کو اپنے مروجہ اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔

۲۔ بنفے کا اقتباس اس کی کتاب ''مکمل سنسکرت گرامر،، سے نہیں لیا گیا بلکہ واسطہ در واسطہ ماخوذ ہے۔ ''ڈاکٹر میور نے اپنی کتاب ''سنسکرت ٹکسٹ،، میں بنفے کی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۷ سے لیا اور اس کی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۶۱ سے کاڈویل نے اخذ کیا، اور کاڈویل کی کتاب صفحہ نمبر ۴۶۲ سے مضمون نگار نے۔ کاڈویل نے اس اقتباس کو اس طرح پیش کیا ہے :

"Sanskrit is a language of great antiquity and wide diffusion. Long after it had ceased to be vernacularly spoken, it continued to be employed as the organ of culture and religion, and in this capacity it prevailed over extensive regions where there existed alongside of it not merely a variety of dialects which were developed out of it but also several popular dialects which were originally quite distinct from it. From these circumstances it has resulted not only that forms which have been admitted into Prakrit dialects have been afterwards adopted into Sanskrit but further that words which were originally quite foreign to Sanskrit have been included in its vocabulary." (کاڈویل صفحہ ۴۶۲)

''پراکرتوں میں دخیل اسالیب،، اور ''مضمون نگار کے ترجمے اور پراکرتوں میں مروجہ کئی ایک صرفی و نحوی ترکیبیں،، کے تاثر میں جو فرق ہے اس سے تحریف و تصرف کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

۳۔ کاڈویل کے اپنے الفاظ اور مضمون نگار کے ترجمے کا تقابل کرکے تحریف و تصرف کی داد دیجئے :

"I have long felt persuaded that some words of Dravidian origin have found their way into Sanskrit vocabularies, and I doubt that a larger number of words have been introduced into Sanskrit from various other extraneous sources."

(''دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر،، صفحہ ۴۵۳)

ترجمہ : ''بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ کتنے ہی دراوڑی الاصل الفاظ سنسکرت کے لغوی سرمائے میں داخل ہوچکے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی شک و شبہ سے بالا تر ہے کہ الفاظ کا اس سے بھی زیادہ حصہ کئی دوسری زبانوں (منڈا وغیرہ) سے سنسکرت میں شامل ہوا۔،،

(اردو نامہ نمبر ۲۸ صفحہ ۴۲)

(یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ کدویل نے سنسکرت اور یونانی مماثلت کے بھی بعض ضمنی اشارے دئے ہیں) ۔

۴۔ ڈاکٹر گنڈرٹ کے جس محققانہ مضمون کے حوالے سے اقتباس دیا گیا ہے ، وہ جرنل آف دی جرمن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۶۹ء میں "سنسکرت میں دراوڑی عناصر" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا ۔ مضمون نگار نے یہ اقتباس کادویل کی وساطت سے لیا ہے ، لیکن حوالہ نہیں دیا ۔ اس کے ترجمے میں بھی ایک آدھ جگہ ترجمے کا کرشمہ نظر آتا ہے ۔ کاڈویل کے دئے ہوئے اقتباس ("دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" صفحہ ۴۴۴) میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "ایسے ماہرین کی کمی نہیں جو شد و مد کے ساتھ ———" بلکہ یہ ہے کہ :

"We meet with many, at least in Malabar

۵۔ کٹل سے منسوب اقتباس محل نظر آتا ہے ۔ کاڈویل نے کٹل کے مضمون "سنسکرت فرہنگوں میں دراوڑی عنصر" (انڈین اینٹی کوائری شمارہ اگست ۱۸۷۲ء) سے ۱۳ الفاظ منتخب کرکے پیش کیے ہیں اور یہ لکھا ہے :

"The other words adduced by Mr Kittle appear to me to belong, not to the class of words actually borrowed by Sanskrit from the Dravidian languages but to the words which are common property of both the families. This is shown by the number of Mr. Kittle's illustrations derived from one initial vowel alone to be a very large class; and it is evident that in many instances the Dravidian use of the word or its relationship, throws light on the use of the word in Sanskrit."

("دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" صفحہ ۴۶۹)

کاڈویل کے دوسرے جملے سے کٹل کی دی ہوئی فہرست الفاظ کا اندازہ لگا کر ایک اقتباس اختراع کرلیا گیا اور کاڈویل کے محولہ بالا پورے بیان کو نظر انداز کرکے کٹل کے پیش کردہ "بے شمار" الفاظ کی طرف اشارہ کردیا ہے ۔ ان بے شمار الفاظ کی اصلیت کاڈویل ہی کے بیان سے واضح ہوجاتی ہے ۔

۶۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے گراؤز کا مضمون "ہندی میں غیر آریائی عنصر" (مطبوعہ انڈین اینٹی کوائری اپریل ۱۸۷۲ء) خود ملاحظہ نہیں کیا بلکہ کاڈویل کی وساطت سے گراؤز کے نقطۂ نظر سے متعلق قیاس کرلیا ۔ فرماتے ہیں کہ "یک طرفہ فیصلہ دے دینا کسی طرح جائز نہیں کہ یہ تمام کا تمام سرمایۂ الفاظ سنسکرت نے اردو

کو دیا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے یعنی خود سنسکرت نے یہ الفاظ اردو کی ہمنس رو زبانوں سے اخذ کیے ہوں۔ مسٹر کراؤز نے بھی ہندی سرمایہ' الفاظ کا تجزیہ کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے،،۔(اردو نامہ نمبر ۲۸ صفحہ ۴۷)

اس بات سے قطع نظر کہ صاحب مضمون کا یہ طرز استدلال قیاسی اور غیر لسانی ہے، ہم کراؤز کے نقطہ' نظر کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔ کاڈویل نے اپنی کتاب کی تمہید میں ایک ذیلی سرخی "کیا شمالی ہند کی زبانوں میں کوئی دراوڑی عنصر بھی ہے؟،،کے تحت کراؤز کا تذکرہ دو مرتبہ کیا ہے۔ ایک جگہ یہ بتایا ہے کہ سر ولیم جونس کا یہ کردہ خیال (شمالی برصغیر کی زبانوں میں نورانی عناصر کی موجودگی) عام طور پر مسلمہ ہوچکا تھا۔" لیکن کراؤز نے اپنے مضمون (محولہ بالا) میں اس پر اعتراض کیا۔(کاڈویل تمہید صفحہ ۵۸)۔ دوسری جگہ یہ لکھا ہے "ایک طرف گندرٹ شمالی ہند کی زبانوں میں دو نہیں، بلکہ سنسکرت میں دراوڑی عناصر کی موجودگی کی دلیلیں پیش کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ان زبانوں میں غیر آریائی عنصر کی بحث کو کراؤز یوں سمیٹتا ہے کہ "بجھلے مباحث، ابتدا سے پیش کردہ قضیے کی صداقت کا اظہار کرتے ہیں یعنی ہندی سرمایہ' الفاظ میں غیر سنسکرتی صوتیوں کا تناسب بالکل در خور اعتنا' نہیں۔،، ("دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" تمہید صفحہ ۹۲)

اس وضاحت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کراؤز کا نقطہ' نظر کیا ہے اور مضمون نگار کے اس جملے کی "مسٹر کراؤز نے بھی، ہندی سرمایہ' الفاظ کا تجزیہ کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے،، حقیقت اور حیثیت کیا ہے!

زیر نظر مضمون میں یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ کسی اقتباس کے ماخذ کی کماحقہ نشان دہی نہیں کی گئی۔ کسی اقتباس کے صحیح ماخذ کی نشان دہی سے اور بالواسطہ استفادے کی صورت میں درمیانی واسطے یا واسطوں کے حوالے سے احتراز، نیز کتابیات کی فہرست میں خواہمخواہ اضافے سے غلط تاثر پیدا کرنے کی کوشش، ادبی دیانت داری کے منافی ہے۔

بعض الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات بھی محل نظر ہیں مثلاً "مراجعت،، "قطبی، "صوتی آہنگ،،، "حلقی، بالوئی،،، "آریائی کنبہ،،، "غیر تصریفی،،، "دھیمے ہائیے،، وغیرہ۔ بخوف طوالت انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اس جائزے کی روشنی میں مضمون کی علمی و لسانیاتی سطح کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ع :

حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

کتبۂ امین درگاہ بیجاپور

محمد اکبرالدین صدیقی

امین الدین اعلیٰ کو امین الدین علی سر خدا سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ آپ کی درگاہ امین درگاہ کے نام سے شاہ پور میں بیجاپور سے ڈھائی میل کے فاصلے پر مرجع خلائق ہے۔ امین الدین اعلیٰ حضرت میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور حضرت برہان الدین جانم کے لڑکے تھے۔ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا، البتہ بعض شہادتوں سے تاریخ پیدائش معلوم کی جاسکتی ہے۔

حضرت میراں جی شمس العشاق جب شاہ پور پہنچے اور حضرت شاہ کمال الدین مجرد بیابانی کے ہاتھ پر بیعت کی تو آپ نے اپنے مرید کو متاہل زندگی گزارنے کا حکم دیا جس پر آپ نے احمد نگر کے قریب ایک مقام بھنگار کے ایک خاندان میں شادی کی۔ آپ کے دو صاحبزادوں برہان الدین جانم اور خواجہ عطا اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ خواجہ عطا اللہ نے نوجوانی کے عالم میں انتقال کیا اور اسی ٹیلے پر جہاں حضرت امین الدین اعلیٰ کا مزار ہے، ان کے قریب ہی ایک جو کھنڈی میں دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں جو بھی نوجوان غیر شادی شدہ انتقال کرتا ہے، اسی احاطے میں دفن کیا جاتا ہے۔

حضرت میراں جی، جانم اور امین الدین کی مدح میں اور اس کے بعد آپ کے پوتے علی پیر کی تعلیمات پر ایک کتاب تذکرۂ غوثیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں جانم اور اعلیٰ کے چند مدحیہ اشعار حسب ذیل ہیں:

وصف حضرت شاہ برہان

رکن شرع مصطفیٰ برہان دین   شاہ برہان اسم ذات بہترین
جانشین شاہ میراں آں ولی   در ریاضت بود یکتا منجلی
شاہ انس و جاں و مولائے کرم   متقی مرتاض و ہم ثابت قدم
صاحب مشکل کشا روشن ضمیر   ہادی ہر بندگاں را دستگیر
فاخر فقر رسول کردگار   شرح وصف ذات پاکش بے شمار

وصف حضرت امین الدین علی

صاحب سجادہ بعد سہ نہ ھس		بد امس الدین علی آں شمس دیں
بود آں حضرت امس راز حق		ذات پاک بہترین ھم زحق
ھادی کونیں و مقبول خدا		ار خد یک دم نمی بود آں جدا
اں ھمہ ندبیر و تقدیراب ھم		ھمعناں سی بود در دست کرم
سال تاریخ وصالش منجلی		گفت ھاتف از ندا "ختم ولی"

۱۰۸۶ ھجری

امین الدین اعلیٰ کے مرید معظم (شاگرد قادرلنگا کوبال) نے ایک نظم سجرہ الانبیا لکھی ھے جس میں یہ بتلایا ھے کہ حضرت برھان الدین جانم پندرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ھوگئے اور سیاحت کے لیے نکلے ، تین سال بعد واپس آئے ، اس کے بعد آپ کے والد کا وصال ھوا ۔ اشعار حسب ذیل ھیں :

عمر جب ھوا پانردہ سال کا		ھوا سوں غالب جھپے حال کا
ھوئے دست بیعت پدر سوں کہیے		ھوا قطب روشن بدر (سوں) کیے

اس کے بعد سفر پر جانے کا واقعہ بیان کر کے واپسی کی اطلاع ھے ۔ پھر کہتا ھے :

گئے جانس شاہ برھاں کو		خلافت دئے ظل سبحاں کو
اول حق کی سب آشنائی دئے		سو بعد ار گئے شاہ رحلت کئے

اس لحاظ سے والد کے انتقال کے وقت جانم کی عمر اٹھارہ تا بیس سال کے درمیان ھوگی ۔ والد کے انتقال پر جو صدمہ ھوا اس کا اظہار آپ نے ایک مرثیے میں کیا ھے ۔ جس کی ردیف "جے کچ حکم الٰہی کا" ھے ۔ اس میں وہ ایک شعر میں رنج کا اظہار کرتے ھیں ! کہتے ھیں :

دنیاں کا منج بدرا ھے ھور دین منج لنگرا ھے		اس دکھ کا منج عذرا ھے جے کچ حکم الٰہی کا

دوسرے شعر میں تربیت پانے کا بھی اظہار کیا ھے :

دنیاں تھے منج فاضل کیا اور دین منج حاصل کیا		باحق منج واصل کیا ، جے کچ حکم الٰہی کا

والد کی عمر اور تاریخ وفات کا اس طرح ذکر کیا ہے :

تاریخ سال نو سو دو اس پر اگلے بھی تو دو دن مدت وفا سو، جے کچ حکم الٰہی کا
اربع سون نہ سال ہے سا ہے کون شوال ہے رحلت کئے اس حال ہے، جے کچ حکم الٰہی کا
تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج سد در حال واصل گیئ خود، جے کچ حکم الٰہی کا
سب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت منور پور کر جیوڑا قبض کر ان لیا، جے کچ حکم الٰہی کا

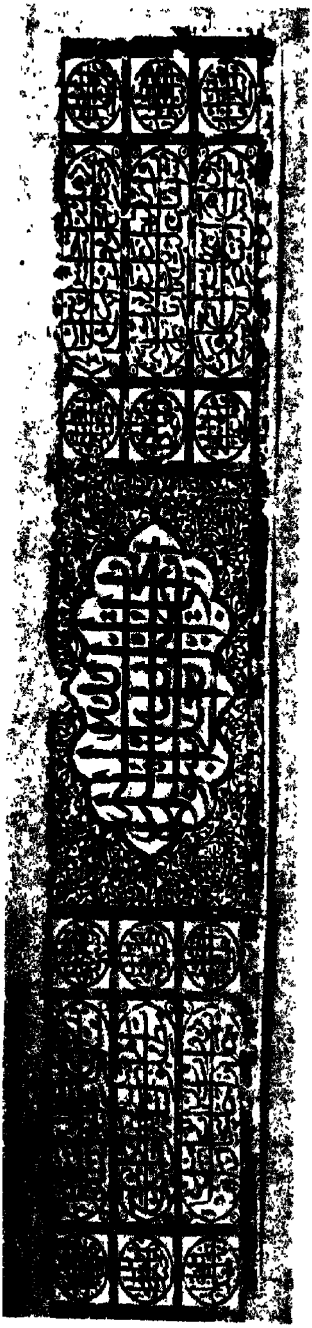
۵۰۵ الحقائق (برہان الدین جانم کا رسالہ نثر) کی اشاعت کے موقع پر میں نے پہلے مصرع میں ''نو سو دو اس پر، دو واوین کے ساتھ، اور دوسرے سعر کے پہلے مصرعے میں ''اربع سون،، پڑھاتھا، لیکن اس کی اشاعت کے بعد جب دوسرے سحیح نسخہ تک رسائی ہوئی تو مقابلہ کرنے پر سبہ اس طرح رفع ہوا کہ پہلے مصرعے میں ''نو سو دو،، اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ''سون،، (سعون) تھا۔ اس طرح معلوم ہوا کہ آپ نے ۹۲ سال کی عمر میں ۲۵ شوال ۹۰۲ھ چہار شنبہ کا دن گزرنے کے بعد شب پنجشنبہ میں وصال فرمایا۔ اس طرح آپ کی ولادت کا سنہ ۸۱۰ھ قرار پاتا ہے، اور چونکہ حضرت جانم کی عمر اس وقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو آپ کی پیدائش کا سنہ ۸۸۴ تا ۸۸۶ھ ہوگا۔ آپ نے ۹۹۰ھ میں اپنی طویل نظم ارشاد نامہ لکھی اور کلمۃ الحقائق کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ارشاد نامہ کے بعد لکھا گیا۔ اس لیے کہ اس میں ارشاد نامہ کے اشعار موجود ہیں۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کہ کتنے دن بعد۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے خیال کے برعکس(۱) آپ نے ۹۹۰ھ کے بہت بعد انتقال کیا۔ کتب خانہ گیہی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں کئی بزرگوں کی وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں درج ہیں۔ اس میں حضرت جانم کی تاریخ وفات ''عزیز جان حشتیاں جانم،، نکالی ہے جس سے ۱۰۰۶ مستخرج ہوتے ہیں۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو برہان الدین جانم کی وفات ۱۰۰۶ھ میں واقع ہوئی، اور یہی سنہ حضرت امین الدین اعلیٰ کی پیدائش کا بھی ہوگا۔ چونکہ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ گویا اس وقت حضرت جانم کی عمر ایک سو بیس یا بائیس سال ہوگی۔ اس عمر میں توالد و تناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ صاحب شجرۃ الاتقیا، امین الدین اعلیٰ کی پیدائش کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ حضرت جانم نے فرمایا کہ :

اسی روز شہ نے دئے سب خبر صفت سب اسی کی کہے کھول کر
خدا کا کہے نسر آتا ہے تو برابر چھپے گنج لاتا ہے تو
نہ یک شہار دو ملک رھتے پلنگ(۲) نہ یک میاں میں دو سماتے ترنگ

۱۔ خطوط موسومہ سخاوت مرزا۔ اردوئے معلیٰ (مولوی عبدالحق کے خطوط کا مجموعہ)
۲۔ نہ یک ٹھار دو مل کے رھیے پلنگ۔ (ساھد)

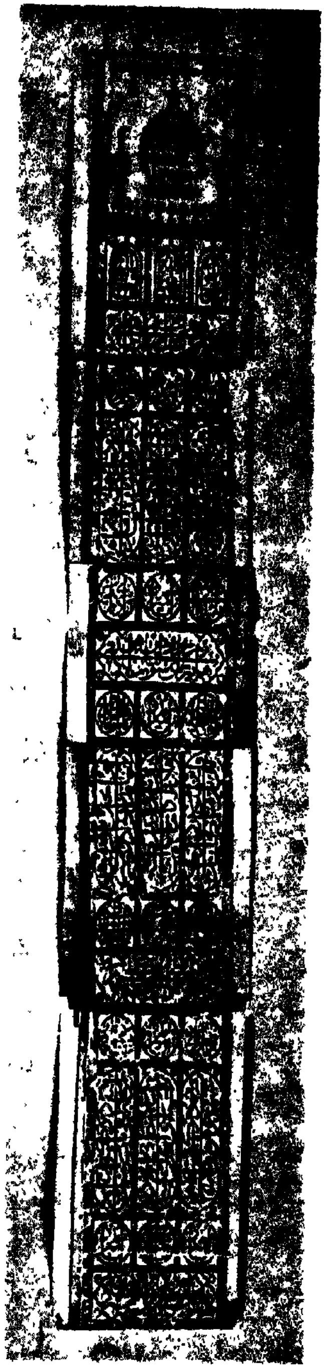
کہے سر اوپر ہے تمہارے خدا		ہمیں اب تمہارے سوں ہوتیں جدا
سربداں اتھے ساہ کے بے شمار		فقیراں اتھے شاہ کے کئی هزار
حلیفے اتھے شہ کے سب نامور		ولے ان میں سید اتھے صاحب کر
نگہ کر کے سید طرف دیکھ کر		کہے تم امیں کو سو ہو لو خبر
کہے ان کو سب راز بولو تمیں		امیں پر چھپی بات کھولو تمیں
امین علی پر تو کھولو تمام		امیں کو هماراچھ بولو سلام
کلاہ اور سجرہ امیں کو دئے		اسی روز عالم سوں رحلت کئے
دنیا میں کتنک دن کو آنا امیں		برابر جھپے گنج لانا امیں

آپ کی تربیت حضرت جانم کی وصیت کے مطابق شیخ محمود خوش دھاں ، سید داول اور سید خدا وند شاہ خلفائے جانم کے ہاتھوں ہوئی جس کا ذکر راقم نے ''کشف الوجود،، تصنیف سید داول کی ترتیب کے موقع پر کیا ہے ۔ آپ مادر زاد ولی تھے ۔ آپ کی کرامتوں کے کئی واقعات روضۃ الاولیائے بیجا پور ، حدیقۂ رحمانی ، برکات الاولیا ، تذکرہ اولیائے دکن ، تاریخ دکن (نجم الغنی رامپوری)، واقعات مملکت بیجا پور (بشیر الدین احمد) اور بساتین السلاطین وغیرہ میں درج ہیں ۔ شجرۃ الاتقیا (معظم) کی روایت ہے کہ حضرت برھان الدین جانم کے دور میں لوگ تعظیما ان کے سامنے جھک جایا کرتے تھے اور سجدۂ تعظیمی کو آپ نے جائز قرار دیا تھا ۔ اس کے بعد یہ رواج امین الدین اعلیٰ کے دور میں بھی باقی رہا ۔ دوسرے یہ کہ آپ ہمیشہ جذب کے عالم میں رہتے تھے ، اس لیے ارکان سرعیہ کی پابندی نہ ہوسکتی تھی ۔ علمائے وقت آپ سے ناراض ھی نہیں رہے بلکہ ایک عالم سید محمد بخاری نے سکندر عادل شاہ تک بات پہنچا کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا ۔ یہ واقعہ تقریباً ہر تذکرے میں موجود ہے ۔ قادری مشرب کے ایک شاعر صادق نے آپ کی ہجو میں ایک طویل مثنوی لکھی جو کتب خانۂ گیچی محل بیجا پور میں محفوظ ہے ۔ آپ نے اپنے مریدوں کو عرفان و سلوک کی تعلیم دی ۔ آپ کے خاندان میں بڑے بڑے اولیا اور بزرگان دین پیدا ہوئے ، اور ادیب ، عالم اور شاعر بھی ۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ چشتیہ خاندان کا سلسلہ حضرت میراں جی شمس العشاق ھی سے سارے دکن میں پھیلا ۔ چنانچہ آپ کے خلفا میں آپ کے صاحبزادے برھان الدین جانم کے علاوہ فصیح الدین بابا سجنجل بھی ھیں جن کے شاعر ہونے کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے ۔ حضرت جانم کے خلفا میں سید داول ، حاجی محمد اسحاق مدراسی ، خدا وند شاہ ، شیخ خان میاں ۔ شیخ محمود خوش دھاں ، رن سنگار خان ، قاضی محمود بحری کے والد قاضی بحر الدین ، قاضی دریا، شاعر اور صاحب تصانیف ھیں ۔ اسی طرح حضرت امین الدین اعلیٰ کے خلفاء میں



پہلا کتبہ →

دوسرا کتبہ ←



فرزند حضرت بابا شاہ اور پوتے علی پیر کے علاوہ شاہ عبدالقادر معروف بہ قادر لنگا کوتال ، سید شاہ محمد قادری نور دریا ، معصوم ، شاہ من عرف ، شاہ میراں حسینی ، میراں جی خدا نما (کمرخی گنبد کاروان ساھو حیدر آباد)، میراں سید حسن خدا وند خدا نما (چنچولی ضلع گلبرگہ)، شاہ محمدی اور معظم بیجا پوری وغیرہ ھیں ۔

حضرت امین الدین اعلیٰ کی وفات ۲۳ رمضان ۱۰۸۵ھ کو واقع ہوئی نہ کہ ۱۰۸۶ھ میں جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ اردو ، جنوری ۱۹۲۸ میں ذکر کیا ہے ۔

آپ کا ایک مرید اور معتقد افضل خاں بتنی تھا جس نے آپ کی اجازت سے ایک مکان خانقاہ کے بالمقابل ٹیلے سے تین فرلانگ کے فاصلے پر بنایا ۔ جس کے کھنڈر آج بھی باقی ھیں ۔ تعمیر کے وقت اسمیں صدا بندی بھی کی گئی ہے یعنی اگر خانقاہ کے سامنے چبوترے پر باہر کھڑے ہو کر تالی بجائیں یا آواز دیں تو اس کی گونج لوٹ کر آتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ افضل خاں کو یاد فرماتے تو تالی بجا دی جاتی اور وہ حاضر ہوجایا کرتا ۔ اسی افضل خاں بتنی نے آپ کا گنبد بنوایا۔ گنبد کی تعمیر سے قبل آپ کی نعش کو گنبد کے چبوترے سے قریب ھی سونپ دیا گیا تھا ، اور چبوترہ تیار ہونے پر ۱۰۸۹ھ میں نعش کو چبوترے پر دفن کیا گیا ۔ وہ مزار جس میں پہلے نعش کو سونپا گیا تھا ، اب بھی موجود ہے ۔

حضرت امین الدین اعلیٰ کے متعدد رسائل نثر اور نظم میں ملتے ھیں ۔ آپ نے والد کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی ردیف "برھان بن میراں اپر" ہے۔ محب نامہ بہ شکل قصیدہ ، ردیف (کوں کو) ، رمز السالکین یا رموز السالکین ، رسالہ وجودیہ ، رسالہ قربیہ ، نازبرہ ، ارشاد نامہ (نثر) ان کے علاوہ غزلیں ، دوہرے، ریختے (نصف مصرعے فارسی نصف دکھنی) وغیرہ ملتے ھیں ۔

تنبیہ :

دکھنی زبان میں یہ سب سے پہلا طویل منظوم کتبہ ہے جو بحر رجز مثمن سالم میں ہے ۔ اس شان و شوکت کا کتبہ شاید ھی کسی اور عمارت پر ہو ۔ کاتب نے اس کو تحریر کرتے وقت اپنی خوش نویسی کا کمال دکھایا ہے ۔ مصرعے لکھے جانے والی ہر محراب کو کسی ایک حرف کی کشش سے دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے ، اور اس میں مصرعے کو خوبصورتی کے ساتھ بے ترتیب اور بلا تسلسل لکھ دیا ہے ۔ مصرعے میں جتنے الف یا لام یا ک آئے ھیں انھیں مساوی فاصلہ دے کر لکھا ہے ، خواہ ان کی تعداد دو ہو یا تین ہو یا پانچ ۔ دوائر کے لیے کوئی توازن نہیں قایم کیا گیا۔

۸۔ کہیں خط نسخ کے دائرے ہیں اور کہیں عربی رسم خط رکی شکل کے ۔ دوتین مصرعوں میں حروف استداد زمانہ سے بگڑ گئے ہیں ، اور ان کا پڑھنا مشکل ہے ۔ خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے اعراب اور جزم کے علاوہ جگہ بھرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے الف یا جزم یا یکساں حروف دے دئیے گیے ہیں ۔ خط کی نزاکتیں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں ۔

عربی اور فارسی کتبے تھوڑی سی محنت کے بعد پڑھے جاسکتے ہیں ۔ لیکن دکھنی کتبے کا پڑھنا خصوصاً ایسے کتبے کا جس کی تحریر میں تسلسل بھی باقی نہ رہا ہو ، مشکل ہے ۔ کاتب نے آخر میں اپنا نام حسن لکھا ہے اور کتبے کی تاریخ کا سنہ ۱۰۸۸ھ دیا ہے ۔ یہ پندرہ اشعار کی ایک نظم ہے جس کو شاعر غزل کہتا ہے ۔ اس کو تحریر کرنے کے لیے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ باب الداخلہ کے سیدھی جانب چھ اشعار لکھے گئے ہیں ، دروازے کے اوپر تین اور بائیں جانب چھ اشعار کے اوپر اور بازوؤں کے مربعوں کو پر کرنے کے لیے اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی اسم ، اسمائے دوازدہ امام ، حضرت خواجہ بندہ نواز ، حضرت سراج جی اور امین الدین اعلیٰ کے القاب اور ادعیہ تحریر کیے گئے ہیں ۔

دروازے کے دائیں اور بائیں جانب ۲۰۴ سنٹی میٹر لمبا اور ۶۰ سنٹی میٹر چوڑا پتھر لگایا گیا ہے ۔ دونوں طرف کے کتبوں پر اوپر سے نیچے کی طرف تقریباً ۵۵ سمر کی گنجائش لے کر اطراف حاشیہ دیا گیا ہے اور درمیان میں ایک بڑے گنبد کی تصویر بنائی ہے ۔ جس کے نیچے کنول کی پتیاں ہیں ۔ اس کے نیچے ایک پٹا یا حلقہ ہے ، اس سے نیچے کنگورے ہیں ۔ کنگورے کے دونوں سروں پر کنگورے کی بلندی کے مساوی دو چھوٹے مینار ہیں جن پر متناسب گنبد بنے ہیں ۔ ستونوں اور گنبدوں کی ابتدا میں کنول کی پتیاں بنائی ہیں ۔ ان کے نیچے بھی ایک حلقہ یا پٹا بنایا گیا ہے ۔ بڑے اور چھوٹے سب گنبدوں پر کلس ہیں اور ان پر چاند کی شکل بنائی گئی ہے ۔ گنبدوں میں تحریر موجود ہے ۔ اس سے نیچے تقریباً ۴ سمر کا حاشیہ دے کر ۳۰ سمر جگہ لی گئی ہے اور اس میں مساوی لمبائی کی عادل شاہی وضع کی تین کمانیں بنائی ہیں ۔ درمیانی کمان کے اوپر خالی جگہ میں آٹھ پتیوں کے اور بازوؤں کی کمانوں پر چار چار پتیوں کے پھول ہیں ، اور کمان میں تحریر موجود ہے ۔ ان کمانوں کے نیچے ڈیڑھ سمر کا حاشیہ دے کر ۲۰ سمر چوڑی آڑی محراب بنائی ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر کنگورے دار کمانیں ہیں ۔ کمانوں کے چاروں گوشوں میں چھوٹا سا دائرہ کھینچ کر مرکز پر ایک نقطہ دیا گیا ہے ۔ اسی میں ایک مصرع لکھا ہے ۔ اس سے نیچے ڈیڑھ سمر کے حاشئے سے ۲۰ سمر کا فاصلہ لے کر جگہ کو تین برابر حصوں میں تین مربعے بنا کر درمیان میں دائرے

۷- پانچواں مصرع--سو ہے منور نور یوں تس حال جو ظاہر طلوع
چھٹا مصرع--کرنا حضور حق اوچت ھدبہ اپس نب توں امیں
ساتواں مصرع--مقبول حق از حق ہوا ناگہ جرا کس جا دھرے

۸- (مربعوں میں) -- پہلا--یا حاجت روا
دوسرا--یا امیر مدد
تیسرا--یا حاجت روا

۹- (آڑی محراب میں) - آٹھواں مصرع--راضی رضا حق ہو فدا یہاں ذوں نا دوجا امیں

۱۰- (مربعوں میں) -- پہلا--یا عاشق شہباز (لقب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ۔
حضرت امین الدین اعلیٰ کو بھی اس لقب سے یاد کیا گیا ہے)
دوسرا--یا امیر مدد
تیسرا--یا بلند پرواز (لقب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اور
حضرت امین الدین اعلیٰ)

۱۱- نواں مصرع--اس ذوق کی تمثیل کوں کس موک سوں کیا کر کہوں
دسواں مصرع--نا ہر کسے زہرہ تہاں نا او کوئی سکیا امیں
گیارھواں مصرع--حق سوں وصل بھو بھانت ہے تس بہا کنے قتل اللساں

۱۲- (مربعوں میں) پہلا--یانور نوری (ترجمہ : اے نور اے میرے نور)
دوسرا--یا امیر مدد
تیسرا--یا سر سری --(ترجمہ اے بھید ، اے میرے بھید)

۱۳- (آڑی محراب میں بارھواں مصرع : کھن کھن منزہ روپ اہے بھوجک اچنبہ کن امیں
اوپر سے پہلا مصرع)

دوسرا کتبہ
(دروازے کے اوپر)

سیدھی طرف-- پہلی سطر-- پہلا مربع--امام علی المرتضیٰ
تیرھواں مصرع--ھادی ہدایت جس اپس وصل بحر امواج میں
دوسرا مربع--امام حسن المجتبیٰ صابر

دوسری سطر—پہلا مربع—امام محمد الباقر
چودھواں مصرع—ورنہ شفا اغلب نہاں باریک رہ ناریک اسی
دوسرا مربع—امام جعفر الصادق
تیسری سطر—پہلا مربع امام محمد التقی
پندرھواں مصرع—لیکن عروج ہے س انما غواص نون دل کی سمع
دوسرا مربع- امام علی النقی

درمیان میں عبارت بہ شکل طغرا۔
اللہ تعالیٰ۔ لاالہ الا اللہ انا محمد رسول اللہ

۱۔ پہلے گوشے میں سیدھی طرف اوپر کے دائرے میں:
قال رسول اللہ و بہ الشفا (ترجمہ: رسول اللہ نے فرمایا شفا اسی سے ہے)

۲۔ دوسرے گوشے میں بائیں طرف اوپر کے دائرے میں:
رسول اللہ النبی و آلہ و صحبہ (ترجمہ: نبی کریم رسول اللہ اور آپ کی آل و اصحاب)

۳۔ تیسرے گوشے میں سیدھی طرف نیچے کے دائرے میں:
لما اسریٰ الی السما الدنیا (ترجمہ: جب پہلے آسمان کی طرف لے جائے گئے)

۴۔ چوتھے گوشے میں بائیں طرف نیچے کے دائرے میں:
دل علیٰ اثر العز المکنون (ترجمہ: تو بارگاہ رب العزت کے راز ہائے مخفی کی طرف رھبری کی)

بائیں طرف— پہلی سطر— پہلا مربع—امام حسین الشہید کربلا
سولھواں مصرع—امواج نفسانی سو اللہ غیر دیس نا در اسی
دوسرا مربع—امام زین العابدین
دوسری سطر—پہلا مربع—امام موسیٰ کاظم
سترھواں مصرع—مطلوب ہے آسان تب اشکال نا مشکیل توج
دوسرا مربع—امام موسیٰ الرضا
تیسری سطر—پہلا مربع—امام حسن العسکری
اٹھارواں مصرع—جا ڈوب کر او چار نا بے چار توں کرنا اسی
دوسرا مربع—امام محمد المہدی



تیسرا کتبہ ←

تیسرا کتبہ
(بائیں طرف)

۱۔ کمانوں سے نیچے پہلی سطر :
آڑی محراب سی—انیسواں مصرع—ہے دار نو وسواس
سب بردا ایک بجھ اس سے

۲۔ دوسری سطر—پہلا مربع—بامر رب اللہ (ترجمہ : اللہ
کے حکم سے)

دوسرا مربع—یا امیر مدد

تیسرا مربع—وکل شئی من ربی (ترجمہ : ہر چیز
میرے رب کے حکم سے ہے)

۳۔ تیسری سطر—بیسواں مصرع—مرداں حق ن ناہ ہے
حق ہم اس سٹھا اس

اکیسواں مصرع—شاہد ہو نو دل انک سوں
دانا دلاور زور بر

بائیسواں مصرع—پیرے معلم خاص بھی امداد
لے حق سوں اس

۴۔ چوتھی سطر—پہلا مربع—یا بندہ نواز (لقب حضرت
خواجہ سید محمد حسنی بندہ نواز گیسو دراز)

دوسرا مربع—یا امیر مدد

تیسرا مربع—یا گیسو دراز

۵۔ پانچویں سطر—آڑی محراب میں تئیسواں مصرع—
برھان کرے فیض سوں غوبا لیا اب ڈھونڈنے

۶۔ چھٹی سطر—پہلا مربع—یا مفنر العناب عنا (ترجمہ :
اے ہم سے مصائب کو دور کرنے والے)

دوسرا مربع—یا امیر مدد

تیسرا مربع—یا حدیز المواناح (ترحمہ ۰ اے
عطا یا کے سرفراز کرنے والے)

۷۔ ساتویں سطر—پہلی سطر۔ چوبیسواں مصرع—یا جو تھا اب قدر تجہ ھنسیں راھو اس
دوسری سطر۔ پچیسواں مصرع—برھان ہی میراں کرے درگہ کی سب خاک پر
تیسری سطر۔ چھبیسواں مصرع—تن من جان دے کر کھاں قربان بل کہتا امیں

۸۔ آٹھویں سطر—پہلا مربع—یا فک المہمات۔ (ترجمہ: اے مصائب کو دور کرنے والے)
دوسرا مربع—یامعشوق ربانی (لقب حضرت امین الدین اعلیٰ)
تیسرا مربع—یا شمس العشاق (لقب حضرت میراں جی جد امین الدین اعلیٰ)

۹۔ نویں سطر۔ آڑی محراب میں — ستائیسواں مصرع — خط غلامی سجہ سما اسر اس دربار کا

۱۰۔ دسویں سطر—پہلا مربع—یا ھادی برتر
دوسرا مربع—یا امیر مدد
تیسرا مربع—یا ساقی کوثر

۱۱۔ گیارھویں سطر—پہلی سطر۔ اٹھائیسواں مصرع—آزاد گی کونس بھی میں منجہ نہیں پایا امیں
دوسری سطر۔ انیسواں مصرع—ابیات خالی پنج د، دبت کہا نہ غزل میں
تیسری سطر۔ بیسواں مصرع—مفہوم کر سار ہو، ناعجب جو ہونا امیں

۱۲۔ بارھویں سطر— پہلا مربع—یا امیر مدد
دوسرا مربع—یا حاجت روا
تیسرا مربع—یا امیر مدد

۱۳۔ تیرھویں سطر۔ آڑی محراب میں—بنیاد عشق بازی جز نہاد درد بلا مقصود نبود

حسین ۱۰۸۸ھ

کتبے کا مفہوم

شعر نمبر ۱۔ اے امین! صدق کی روح کے لیے دل کے سمندر میں غوطہ زنی کیجیے تو آپ جان کے نور کا بیش قیمت موتی حاصل کرسکیں گے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ: (جس نے اپنے آپ کو پہچانا گویا اس نے خدا کو پہچان لیا) کی طرف اشارہ ہے۔

شعر نمبر ۲۔ اے امین! مرشد کا تصور کرکے سبی چیر کر مزین موتی حاصل کیجیے اور عرفان کو پیش نظر رکھیے۔

شعر نمبر ۳۔ آپ تو ایک سور نور ھیں ۔ جب آپ عرفان پالیں تو اپنے آپ کو موزوں اور مناسب ھدیے کے طور پر بارگاہ خداوندی میں پیش کیجیے ۔

شعر نمبر ۴۔ آپ خدا کی بارگاہ میں مقبول ھیں ، اب اور کہاں جاسکیں گے ۔ خدا آپ سے راضی اور خدا پر آپ فدا ھیں ۔ اس کے سوا آپ کا کوئی دوسرا ذوق نہیں ۔

شعر نمبر ۵۔ میں اس ذوق کی مثال آپ کے سامنے کس منہ سے پیش کرسکتا ہوں (آپ جیسا دوسرا کس کو بتلا سکتا ہوں) ہر شخص کی اتنی جرأت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص امین بن سکتا ہے ۔

شعر نمبر ۶۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے متعدد طریقے ھیں ، لیکن ھم اس کے اظہار پر قادر نہیں ، اس سے ھماری زبان گنگ ہے ۔ اس کی پاکیزہ اور لطیف شکل لمحہ بہ لمحہ حیرت میں ڈالنے والی ہے ۔

شعر نمبر ۷۔ اس طوفانی اور متلاطم سمندر میں وصل اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو ھادی (مرشد) کی ھدایت اور رھنمائی حاصل ہو ، ورنہ یہ راستہ نہایت باریک اور تاریک ہے ، اس لیے بدنصیبی کا امکان ہے ۔

شعر نمبر ۸۔ لیکن اے غواص ! تو دل کے کانوں سے سن کہ عروج جب ھی حاصل ہوتا ہے جب کہ خواھشات نفسانی کو ترک کریں اور اے امین ! سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈریں ۔

شعر نمبر ۹۔ اے امین ! آپ کے لیے مطلوب یا مقصود کا پانا آسان ہے ۔ اس میں آپ کے لیے کوئی دشواری نہیں ۔ آپ ان اسرار و غوامض پر غور و فکر کر کے ھماری رھنمائی کیجیے ۔

شعر نمبر ۱۰۔ یہ خیالات بغیر غور و فکر کے راز ھی رھیں گے (ان پر پردہ پڑا رہے گا) اے امین ! مردان حق وھی کہلائے جاسکتے ھیں جن کے دل میں حق کی محبت جا گزیں ہے ۔

شعر نمبر ۱۱۔ تو دل و جان سے گواہ بن اور اپنے خاص معلم اور مرشد امین سے جو دانا اور بہت زیادہ دلاور ھیں، حق کو جاننے کے لیے مدد لے ۔

شعر نمبر ۲۔ آپ نے برہان کے فیض سے اپنے آپ میں غوطہ لگا کر عرفان حاصل کیا ہے۔ (دوسرے مصرع کا مفہوم سمجھ میں نہ آسکا شاید غلط پڑھا گیا ہو)

شعر نمبر ۳۔ میں نے برہان دین کی درگاہ کی خاک پر تن، من، جان اور طاقت سب قربان کردی ہے۔

شعر نمبر ۴۔ مجھے اس دربار سے خط غلامی مل گیا جس نے مجھے اسیر کر لیا ہے اور اے امین! میں نے کوشش سے آزادی حاصل کر کے تجھے پالیا ہے۔

شعر نمبر ۵۔ میں نے بیہودہ اشعار میں یہ غزل ختم کی ہے۔ اے امین! آپ انہیں سمجھ کر میری عیب پوشی کیجیے اور میری پریشانیوں کی جہاں میں نہ کہیے۔

مقطع اور بائیں کمیوں کا آخری جملہ :

بنیاد عشق بازی جز بہر درد بلا مقصود نبود

عشق بازی کی بنیاد بلاؤں اور تکالیف کی اصل کے سوا کوئی مقصود نہیں رکھتی۔ بالفاظ دیگر میدان عشق میں قدم رکھنے کے بعد ہم مصائب و آلام کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے۔

--

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اپنے مضمون مطبوعہ " اردو، جنوری ۱۹۲۸ء میں اسی کتبے کے پانچ شعر درج کیے ہیں اور انہیں امین الدین اعلیٰ سے منسوب کیا ہے۔ پوری نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے کسی مرید نے لکھے ہیں۔ شاعر کا ابھی تک ہمیں علم نہ ہوسکا۔ نظم میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں۔ مولوی صاحب مرحوم کے منتخبہ اشعار حسب ذیل ہیں :

دل بحر میں غواص ہو روح صدف کے کاجس اس — بے باہ در تن صدف میں نور جان تو سمجیں اس

گر گیان کے عرفان سوں سنبھال سینے حیر کر — موتی سزن ہاتھ نے عرفان انکوں برکار اس

اس ذوق کی تمثیل کوں کس سوں کیا کر کہوں — تا ہر کسی زہرا نہاں تا آؤ کد سکت اس

بے حار تو وسواس سب پردا اٹھے بچ اوس میں — مردان حق تن نام ہے جن ہم اوس بیبہا اس

نعت کیا تک غزل میں ابیات خاصی پنج دہ — مفہوم کر سنار ہو، تا عیب جو ہوتا اس

"اردوئے قدیم،، صفحہ ۵۵

مطبوعہ انجمن ترقی اردو، کراچی

نذر سجاد کی شاعری

جلیل قدوائی

محترمہ نذر سجاد حیدر مرحومہ کو عموماً ایک ادیب اور افسانہ نویس کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ حال میں ان کا انتقال ہوا تو ان پر جو قدرے قلیل مضامین شائع ہوئے، ان میں ان کی شخصیت کے اسی پہلو کا تذکرہ کیا گیا یا ان کی سیرت کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا۔ صرف کہیں کہیں ادھر ادھر ان کی شاعری کے متعلق بھی کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ شاعرہ تھیں، لیکن اس حیثیت سے انہوں نے اپنے کو نمایاں نہیں کیا۔ مخصوص احباب یا اعزا کو وہ اپنے تاثرات رقم کر کے بھیج دیتی تھیں اور بس۔ میں اس مضمون میں قدرے تفصیل کے ساتھ ان کی شاعری کا تجزیہ کرتا ہوں۔

شاعری ان کا فن نہ تھی، یعنی وہ پابندی کے ساتھ شعر نہ کہتی تھیں، مگر طبیعت کی موزونی جذبات کی فراوانی، اور احساس کی شدت کے سبب ان سے خاص خاص موقعوں پر نہایت پر تاثیر اور درد ناک شعر ہوجاتے تھے۔ کبھی پوری نظم یا مسلسل غزل ہوجاتی تھی مگر خالص آپ بیتی، جگ بیتی بہت ہی شاذ ہوتی تھی۔ ان کے دل پر سمی، اور اپنی بہن اور اپنے بھائی اور دوسرے اعزا کی دائمی مفارقت کا داغ تھا۔ اپنے عزیز شوہر، مشہور و ممتاز ادیب سید سجاد حیدر یلدرم کی عارضی جدائی شاق ہوتی تھی(۱) اور ابدی جدائی تو ان کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے دونوں بچوں عزیزی مصطفیٰ حیدر اور عزیزہ قرۃالعین حیدر کی کمزور صحت علالت، اور ان کی زندگی کی اس وقت کی قدرے غیر یکسوئی سے قدرتاً پریشان رہتی تھیں۔ پھر خود ان کی اپنی زندگی کے نشیب و فراز بالخصوص تقسیم ملک کے بعد کے حالات جو ان کے لیے واقعتاً انقلاب عظیم کی حیثیت رکھتے تھے، جن میں ان کے لیے راحت کے عوض درد دکھ اور تکالیف کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا، اور سب سے بڑھ کر ان کی شدید اور طولانی علالت جس کسی نے میری طرح

۱۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سجاد حیدر مرحوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور میں ان کے دفتر میں ملازم تھا۔ مرحومہ اس وقت مجھ سے پردہ کرتی تھیں جو بعد میں اٹھ گیا۔ سجاد صاحب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسے میں شریک ہونے یا دور دراز کسی شہر میں امتحانات کے پرچے چھپوانے جاتے تھے تو میرے پاس مرحومہ کے رقعوں کی بھر مار ہوجاتی تھی۔ اس استفسار کے سلسلے میں کہ سجاد کب واپس آئیں گے۔

ان کے علاج کا زمانہ دیکھا ہے، وہی ان کے مصائب کا اندازہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی فطری خواہش اور کوشش کے باوجود ان تمام باتوں نے مل جل کر ان کا مزاج فی الجملہ بے حد حزنیہ سا دیا تھا۔ یہی رنگ ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے اور ان کی شاعری کو ان ہی حدود کے اندر رہ کر دیکھنا چاہئے۔

شاید ان کی سب سے پہلی نظم یا مسلسل غزل جو میری نظر سے گزری کم و بیش چالیس سال پہلے سجاد مرحوم کے اندلس چلے جانے پر تھی۔ عالم اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کے رسیا سجاد حیدر جنہوں نے اپنی مضمون نگاری کی نوجوانی تعداد میں سیر کی تھی یا یوں کہیے کہ جن کی مضمون نگاری کی جوانی پر وہاں کے ماحول میں نکھار آیا تھا(۱) اور جو اس کے بعد کہیں بھی رہے ہوں ہر دوسرے تیسرے سال پابندی کے ساتھ ترکی، مصر، فلسطین اور شام کی سیاحت پر ضرور جاتے تھے۔ وہ سجاد حیدر علی گڑھ میں یونیورسٹی کی رجسٹراری کی میعاد ختم کرنے کے چند دن بعد یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر رہ کر ایک دم "کالے پانی" کی سیر کے شوق میں اسسٹنٹ کمشنر پورٹ بلیئر جزائر انڈمن ہو کر چلے گئے۔ بنت سجاد سے انہیں اس تقرر کو قبول کرنے کے سلسلے میں مخالفت کا ڈر تھا، اس لیے ان سے بس عین وقت پر بتایا اور چل دئے:

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ سنگل کی لی　　نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

اور مرحومہ انہیں جانے سے نہ روک سکیں۔ یہ نظم بڑی آن بان سے "نیرنگ خیال" لاہور میں چھپی تھی جو اپنے زمانے میں بس ایک ہی رسالہ تھا۔ مطلع کا پہلا مصرع تھا:

انڈمن جب سے مرا ہائے دل آرام گیا

افسوس میرے پاس اس کی کوئی نقل نہیں۔ ایک شعر اور یاد آرہا ہے جو سجاد صاحب کے دور سیاحت پر آخری حرف ہے اور بنت سجاد کی بیقراری تو مطلع ہی سے ظاہر ہے:

سیر سے سیر نہیں ہوتا ہے، سیلانی ہے　　ترکی و مصر و فلسطین گیا، شام گیا

مگر ع

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

۱۔ سر عبدالقادر مرحوم کے "مخزن" میں سجادہ کے مکتوب خیال سے لحن کی تھر ور حوت بنت سجاد کے دل پر ... میں جب وہ سب ... ترکی بھڑکی تھی۔ یہ قصہ انہیں کے قلم سے الگ شائع موجود ہے۔ خاتمے پر ہر بار بس اہتمام سے یہ فقرہ درج ہوتا تھا "سید سجاد حیدر، از بغداد" اور وہاں ان پر جو روپ آیا تھا ان کی بغداد سے بھیجی ہوئی اس تصویر سے ظاہر ہوتا ہے جو "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔

بعد کی یعنی سجاد صاحب سے دائمی جدائی کے بعد کی بھی چنگاریاں کچھ کم نہیں۔ بقول اقبال:

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں

بلکہ شاید ع:

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

کے مطابق وہ بجلیاں دل میں آگ لگا دینے والی، جسم کو بھسم کردینے والی نہیں اور ان کی زندگی کا مستقل جزو ہو کر رہ گئی تھیں۔

پاکستان میں مرحومہ کی شاید ہی کوئی عید ایسی گزری ہو جس پر انہوں نے کچھ اشعار نہ کہے ہوں، اور عید کارڈوں یا سادہ خطوں میں لکھ کر مجھے نہ بھیجے ہوں۔ خدا کی شان ان میں سے بعض پر مجھ سے اصلاح طلب کی جاتی تھی۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں یہ خالص آپ بیتی ہوتے تھے، اور مرحومہ کی حرماں نصیبی، محرومی اور بیقراری کا مجسم آئینہ۔ چند عیدیاں پیش کرتا ہوں ان میں جگہ جگہ سجاد صاحب کا ذکر آتا ہے، کہیں کھل کر کہیں بند بند اور کتنی تڑپ کے ساتھ۔ اپنے بچوں کا تذکرہ بھی بڑی دل سوزی، چاؤ اور پیار سے کیا ہے:

عید الفطر کا دل پہ نہ کیسا اثر ہے آج
حالت کسی مریض کی نوع دگر ہے آج
خوشیاں منا رہا ہے جہاں، روز عید ہے
طوفان غم ہے اور دل نوحہ گر ہے آج
تاریک بس نگاہوں میں دنیائے عید ہے
سری نظر سے دور وہ رشک قمر ہے آج
ہوش و حواس، تاب و تواں کھوچکے ہیں ہم
نہ انبساط عید کا دل پر اثر ہے آج
وابستگی سے جس کی ہمیں روز عید تھی
اس عید سے ہماری، وہی بے خبر ہے آج

عید کے دن مرا گھر رشک چمن ہوتا تھا
شاد و فرحاں وہ مرا غنچہ دہن ہوتا تھا
ہفتہ عشرے مرے گھر عید رہا کرتی تھی
اپنے احباب کے مجمعے تھے وطن ہوتا تھا
کم سخن جس کو جہاں کہتا تھا، کیا عید کے دن
ہو کے مسرور وہ سرگرم سخن ہوتا تھا (۱)
جس کے ہر فقرے میں تھا قند مکرر کا مزہ
کیسا پر کیف وہ رنگین سخن ہوتا تھا
عید مل مل کے گلے تہنیت عید میں آہ
گل فشاں کیا گل خنداں وہ دہن ہوتا تھا
گو زمانہ ہے وہی ہم ہیں وہی عید وہی
وہ نشیمن نہیں جو رشک چمن ہوتا تھا
نہ وہ ساقی ہے نہ پیمانہ، نہ وہ مے خانہ
میکدہ آج مرا صحن چمن ہوتا تھا
دائیں بائیں مرے گلشن کی وہ نورس کلیاں (۲)
بیچ میں خسرو گل جلوہ فگن ہوتا تھا

۱۔ دور متوسطین کے کسی استاد کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

۲۔ ان کے دونوں بچے عزیزی مصطفٰی حیدر اور عزیزہ قرۃ العین حیدر۔

عیدالضحیٰ نہیں ہے یہ روز سزا ہے آج
رنج و الم کی دل پہ جو چھائی گھٹا ہے آج

ویراں ہوچکا ہے مرا گلشن حیات
اس کارگاہ زیست کی غمگیں فضا ہے آج

رنگیں و پر بہار یہ دنیائے عید ہے
شہنائیاں ہیں اور دل حوس نوا ہے آج

کس طرح عیش باغ (۱) میں ہے اس کے حسن کے
بے چین و بے قرار جو ہم سے جدا ہے آج

عید میرے لیے آتی ہے محروم ہی کر
سخت سہانی ہے اور مرا یہ غم خانہ ہے

یاد ایام گزشتہ سے جگر پھٹتا ہے
آج ہمدرد کوئی اپنا نہ بیگانہ ہے

لاکھ تدبیر سے بدلی نہیں تقدیر مری
اب اسی حال میں دنیا سے گزر جانا ہے

اور افسوس کہ آخر اسی حال میں وہ بیچاری اس دنیا سے گزر گئیں۔ ذرا دیکھئے کہ ان اشعار میں عام عیدیہ مرثیہ نگاری کے علاوہ سجاد مرحوم کو کس کس طرح سے یاد کیا گیا ہے، بالخصوص "وہ رشک قمر"، "وہ غنچہ دہن"، "کم سخن"، "گل خنداں"، "خسرو گل"، وغیرہ کے دل نشیں علائم مرحومہ کے شدید قلبی تاثرات یعنی سجاد صاحب سے ان کی ابدی محرومی پر ان کی بے پناہ بے قراری کی کیسی غمازی کررہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی بقیہ زندگی میں سجاد مرحوم کی یاد کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ (۲)

عید کے روز لکھی ہوئی نظموں کے علاوہ ان کے دوسرے متفرق اشعار بھی جو حزنیہ ہی ہوتے تھے، سجاد صاحب کی یاد سے رچے ہوئے تھے۔ ذیل کے اشعار میں مطلع غور طلب ہے:

داماں یار تار وفا سی رہے ہیں ہم
ہر چند وہ جدا ہے مگر جی رہے ہیں ہم

دنیا الگ ہے ہم سے، الگ ہم جہاں سے ہیں
یہ بے تعلقی ہے تو کیوں جی رہے ہیں ہم

چارہ گروں سے کہہ دو کہ چھوڑیں مریض کو
وہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ اب جی رہے ہیں ہم

۱- اس پر مرحومہ نے نوٹ لکھا تھا "لکھنؤ کا قبرستان جس میں وہ محو خواب ہیں"۔ دراصل عیش باغ لکھنؤ کا ایک محلہ ہے جس میں [illegible] قبرستان بھی ہے جہاں سجاد حیدر مرحوم دفن ہیں۔

۲- اس موقعے پر اپنے دو شعر زبان پر آئے جو مرحومہ کے حسب حال ہیں۔ یہی ان کے پیش کرنے کی معذرت ہے:

فکر راحت نہیں اندیشۂ آلام نہیں
دل کو کچھ تیری محبت کے سوا کام نہیں

یاد کو تیری میں اس طرح لیے بیٹھا ہوں
جیسے دنیا میں کوئی اور مجھے کام نہیں

عید کے موقع پر ان کی عام حرماں نظری، حرماں نصیبی ان مسلسل اشعار میں بھی ملاحظہ ہو:

پھر وہی رنج قفس پھر وہی تنہائی ہے　　پھر وہی چرخ کہن کی ستم آرائی ہے
عید کے آنے سے دنیا میں بہار آئی ہے　　میں ہوں محبوس بلا، گوشۂ تنہائی ہے
ناتوانی ہے، علالت ہے، بری حالت ہے　　حسرت و یاس کی کیا دل پہ گھٹا چھائی ہے
کبھی خوش حالی میں تھی اب یہ مری عید افسوس(۱)　　میں نے یوں اپنے گناہوں کی سزا پائی ہے

موخرالذکر شعر ہی کی وضاحت کے سلسلے میں ایک دوسری عید کے موقع پر کہے ہوئے ذیل کے اشعار غور طلب ہیں، خصوصاً دوسرے شعر کا مصرعۂ ثانی۔ اس وقت وہ ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔ گر پڑی تھیں اور کولھے کی ہڈی بری طرح ٹوٹ گئی تھی، جو بعد میں ان کی خصوصیت ہو گئی تھی۔ میرے علم میں مرحومہ نے تین بار اپنی ہڈیاں توڑیں:

اک نیا باب کھلا ہے مرے افسانے میں　　مصلحت کوئی ہے مضمر مرے گر جانے میں
جان بلب گور کنارے ہوں عجب عالم ہے　　عید یہ میری آئی ہے شفا خانے میں

بہر حال یہ اور ایسے دکھ بھی ان کے مرکزی خیالات و موضوعات، مگر اس محدود دائرے سے نکل کر وہ کبھی کبھی دنیا کے دوسرے حالات اور اپنے دوستوں یا سہیلیوں یا ہم جنسوں کے بارے میں بھی لکھتی رہتی تھیں، اگرچہ رنگ کلام وہی رہتا ہے۔ مثلاً بیماری کے دوران اسپتال میں ان کی عیادت کے لیے میری طرح ان کی ایک اور قدیم دار سد اور خلوص کار، اردو کی مشہور ادیبہ بیگم شائستہ اکرام اللہ تشریف لے جاتی ہیں تو نذر سجاد مرحومہ چند شعر کہتی ہیں، جن میں سے دو حسب ذیل ہیں:

آئے ہیں وہ رسم دنیا یا عیادت کے لیے　　میں سراپا شکریہ ہوں اس عنایت کے لیے

صحتیں (۲) لاکھوں مری ایسی علالت پر نثار　　وہ شفا خانے میں آئے ہیں عیادت کے لیے

ان کی دوست مشہور معاشرتی خاتون کارکن فاطمہ بیگم صاحبہ کا انتقال ہوتا ہے تو یوں تڑپ اٹھتی ہیں:

کہنے کو یوں تو دوست بہت ہیں زمانے میں　　پر فاطمہ سا دوست ہمارا نہیں رہا
لاہور جا کے ہو گی ملاقات باز دید　　اتنا بھی اب تو ہائے سہارا نہیں رہا

۱۔ اس شعر پر ان کا نوٹ ہے ''عید الفطر پہلی بار اسپتال میں آئی تھی۔ تین عیدوں پر جوان بہن، جوان بھائی، پچپن سالہ والدہ (اماں) دنیا سے گزرے تھے۔

۲۔ حسرت: صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار　　جس میں آئے بار ہا ان کی عیادت کے مزے

اسی طرح سلیم حجاب امتیاز علی تاج کا خط آتا ہے تو اپنی مجبوری اور معذوری پر اشک افشاں ہوجاتی ہیں کہ انہیں جواب اپنے ہاتھ سے کیونکر لکھیں۔ واضح ہو کہ حجاب اور تاج کی شادی کے بانی ساتی نذر سجاد اور سجاد حیدر مرحوم ہی تھے، اور ان دونوں کو وہ بمنزلہ اولاد کے چاہتی تھیں۔ تاج صاحب اور ان کے بڑے بھائی سید حمید علی صاحب (صد افسوس حال میں مرحوم ہو گئے) سے پھوپھی بھتیجوں کا رشتہ بھی تھا۔ اب وہ اشعار سنئے:

لکھیے انہیں خط میں کہ سہم اٹھ نہیں سکتا | وہ ضعف ہے ہاتھوں سے قلم اٹھ نہیں سکتا
اک مدت دیرینہ میں خط تیرا ملا ہے | واللہ کہ یہ بار کرم اٹھ نہیں سکتا
کیفیت دل ہم کو سنانے سے ہیں معذور | خط لکھ نہیں سکتے یہ الم اٹھ نہیں سکتا
"پرسیدن" کی گراں باری سے نکتہ یہ دھرا ہے | سر میرا مرے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

مرحومہ کو عینی کی وجہ سے جو پاکستان سے ہندوستان چلی گئی تھیں، ہندوستان جانا پڑا۔ وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتی تھیں۔ اگرچہ ہندوستان بھیج کر وہ مصطفےٰ حیدر کے لیے جو پاکستان میں ہیں، تڑپتی رہتی تھیں:

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را

اس واقعے کو کم و بیش پانچ سال ہوئے۔ اس سے پہلے عینی انہیں انگلستان لے گئی تھیں۔ سفر میں جہاز پر سے جبرالٹر کو دیکھا تو ان کے دل پر گویا سجاد حیدر مرحوم کی روح نے القا کیا۔ اسی جذبۂ حب اسلامی سے سرشار ہوگئیں اور یہ اشعار ہوئے:

طارق تری ہمت کو عیاں دیکھ لیا ہے | کھوئی ہوئی عظمت کا نشاں دیکھ لیا ہے
جس آنکھ نے دیکھی تری نصرت کی نشانی | اس آنکھ سے اب اشک رواں دیکھ لیا ہے
جس دل نے کہ اس سوق سے اس کوہ کو دیکھا | اٹھتا ہوا اب اس سے دھواں دیکھ لیا ہے
طارق تری دولت پہ ہے اغیار کا قبضہ | تہذیب حجازی کو یہاں دیکھ لیا ہے

اور جب لندن سے پاکستان واپس آئیں تو خوش ہو کر لکھا:

آنکھوں کے سامنے جو وہی سرزمیں ہے آج | خوش اور مطمئن مرا قلب حزیں ہے آج

مگر افسوس کہ جلد ہی عینی کا ہندوستان چلا جانا طے ہو گیا۔ ان پر اس کی جدائی قدرتاً کتنی شاق تھی، دیکھئے:

اس رنج و غم سے دل مرا اندوہ گیں ہے آج | ہوتی جو بس جدا مرے دل کی نگیں ہے آج

عنی کے ہندوستان روانہ ہونے وقت برھا کی ماری نے ایک ہندی دوھا کہوں یا بول بھی لکھا تھا جو اپنی اثر پذیری میں سحر کی خاصیت رکھتا ہے۔ ذرا دل تھام کر سنئے :

جانے سر سائیں حو اب کب دیس دِو اپہو؟
ماں کو چھوڑا، بھائی کو چھوڑا، اما جگ بھی چھوڑا، یون دیس بسبو؟
جانے در بائی حو اب کب دیس کو اپہو؟

(جانے والے سائے جانا کہ اب وطن کب آؤ گی؟ اپنی ماں کو اور اپنے بھائی کو اور اپنے وطن کو بھی چھوڑ چلی ہو (تو اب یہ بتاؤ) کون سا دیس بساؤ گی؟)

آخر حسنا اوپر عرض کیا گیا، مرحومہ بمبئی چلی گئیں۔ سچ یہ ہے کہ ان کی مٹی وہیں کی تھی اور وہاں انہیں ان کی موت لے گئی تھی :

زیر قدم زمیں ہے سارے جہاں کی ہے　　　پر یہ خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

موت نے ان کی تمام مشکلات آسان کردیں۔ وہ سبھی کی مشکلات آسان کرتی ہے، اس سے پہلے غم سے رہائی ناممکن ہے :

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عنی انہیں بہت عزیز تھیں اور انہیں کی گود میں انہوں نے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کردی۔ جگر کا یہ مقطع ان کے لیے حسب حال ہے :

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر　　　عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

خدا مرحومہ کو جنت الفردوس میں سکون ابدی نصیب کرے۔ آمین۔

منازل السائرہ

علامہ راشد الخیری مرحوم　　　مع مقدمہ و فرہنگ

مرتبہ : جناب رازق الخیری

ناشر : جنرل پبلشنگ ہاؤس۔ کراچی　　　قیمت : پانچ روپے

غزل

شان الحق حقی

یہ غزل ... میں نے ... کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ... شعر لکھی ہے کہ ایک اہم لسانی مسئلے کی طرف توجہ دلانی ہے۔ ... کسی زبان کے ... کہ موجودہ حالات مناسب ہے ... ان کے عنصر ... ایک حصہ ... اور زائد ہوں، دوسرے ... نہ ہونا ... مختصر ہمزہ واو عطف اور کسرۂ اضافت وغیرہ کے سلسلے میں بڑی ... جاتی ہے ... یہ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ لے سکتے ہیں، ہندی الفاظ کے ... نہیں، کیا وجہ جواز رکھتی ہے؟ یہ ... کی ... اور ... ایک ... گیا؟ علما نے بہت سی مخلوط ... وغیرہ کی نہیں جو ... رہے ہیں اصول دان، ... الفاظ کے وغیرہ وغیرہ گویا ... سب بھی موجود ہے، حالانکہ وہ ... موجودہ زمانے کی نسبت ان ... کو آسانی سے نبھا سکتے ہیں۔ یہ روایت ... کون سی منزل ہے کہ ہم اس ... پرانی روایت پر بھی ... نہیں کرتے؟

یہ درست ہے کہ زبان کے لیے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے، لیکن معیار بھی بدل سکتا ہے اور بدلتا رہا ہے۔ اس دور میں ... نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اگر ہم نے معیار کو ایسا ... کہ ... خاصے ... لوگوں کی ... سے بھی باہر ہو جانے ... کے حق میں ... کہاں تک درست ہوگا کہ یہ ہماری عام زبان ہے یا ہو سکتی ہے۔

سبز تھے خار ہر اپنے بھی لہو خوار نہ تھے ۔۔۔ تھے سہی دست مگر اپنے پر آزار نہ تھے
شہر جیسے کہ کوئی خستہ بمباری ہو ۔۔۔ سنی تو تھے سب پر ایسے کھنڈر آثار نہ تھے
جانے گن ہے کہ گناہ اپنا تو مسدود ہے تباہ ۔۔۔ غم سے مانوس رہے عشق سے بیزار نہ تھے
دہر نے گرد کیا نام و نشاں تک ان کا ۔۔۔ جیتے جی جان بھی دینے کو جو تیار نہ تھے
آہ وہ ہے جو کلیجہ بہ کلیجہ پہنچے ۔۔۔ رہ گئے راہ میں وہ تیر جو پر کار نہ تھے
رات افق پار، سحر پاس تو لے ہی پہنچی ۔۔۔ پیچ و خم راہ کے کیا غم ہے جو ہموار نہ تھے
دل کو اے دوست ترے عہد ستم سے پہلے ۔۔۔ اور بھی غم تھے سہی دکھ بھی آزار نہ تھے
پھول تھے چاک، قبا چاک کلیجا پھر بھی ۔۔۔ میرے دل سوز نہ تھے، میرے ہی غمخوار نہ تھے
رونق و روپ خیالوں کو سب اس نے بخشا ۔۔۔ ایسے با نوک پلک ایسے جھلک دار نہ تھے
سڑماں بستہ زمیں تھی تو گراں چال فلک ۔۔۔ روز و شب میرے لیے مائل رفتار نہ تھے
موج سہراں رہی گوش بر آہٹ کیا کیا ۔۔۔ نالۂ دل ہی صدا دینے کو تیار نہ تھے

روگ دل رہ نہ سکا راگ ہوئے بن حقی
رنگ افشاں ہیں وہ نالے جو شرر بار نہ تھے

کتاب زندگی

قیصری بیگم

زیور کی چوری :

نانا ابا کے زمانے کی داروغہ کی عورت تھی جو بڑی زندہ دل چست اور چالاک تھی اماں کے پاس آ کر مذاقیہ باتیں کر کے ان کا دل بہلاتی کبت تھی گئی ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اماں خاموش اپنی مسہری پر لیٹی ہوئی تھیں۔ نانی اماں رات بھر کی جاگی ہوئی ذرا لیٹ گئی تھیں بچوں کو لے کر ایران اماں (ماما) باہر گئی ہوئی تھیں، دونوں بھائی مدرسے گئے تھے ۔ یہ تیز طرار عورت آئی اور میدان خالی دیکھ کر بولی بی جنی اگر میں تم کو ماردوں تو کیا ہوگا ؟ اماں نے جواب دیا مجھے مار کر تجھے کیا ملے گا لے میرے ہاتھوں میں چھلے ہیں وہ لے لے ۔ آپ جاچیٹ تلاش لے کر بولی ۔ میں تمہارے اوپر سے صدقے کا بکرا ہوجاوں کاہے کو ماروں گی ۔ جھاڑو لے کر اندر کمرے میں گھسی ۔ خدا نے جان کی خیر کی کہ اس نے گلا نہ گھونٹ دیا ۔ سنسان دوپہر کا وقت کوئی عورت پاس نہ تھی ۔ جھاڑو کے بہانے اس نے زیور کا صندوقچہ جو کمرے میں رکھا تھا اٹھا لیا اور اپنی چادر میں لپیٹ چمپت ہوئی ۔

دوسرے دن جب زیوروں کی ضرورت ہوئی تو اس کی تلاش ہوئی ۔ صندوقچہ ہو تو ملے ۔ سب تلاش کر رہے ہیں ۔ اماں جز بز ہو رہی ہیں کہ وہیں رکھا ہے تم لوگوں کو نہیں نظر آتا ۔ آخر ابا جان نے جا کر دیکھا جب پتا چلا کہ اس عورت نے دن دھاڑے ڈاکا مارا ہے ۔ پولیس چوکی سب کچھ کیا ۔ خفیہ پولیس میں اطلاع کی ۔ سب نے کہا چلو مال پر بلا ٹلی۔ اماں جان ایک صابر انسان تھیں صبر کیا ۔ لیکن چھوٹی چھوٹی بچیوں پر اس کا بہت اثر ہوا ۔ افسری باہر کھڑی ہوتی تو ایک ایک جانے والے سے کہتی ۔ دیکھنا بہن داروغہ کی بیوی ہم کو ننگا کر گئی ۔ سب زیور لے گئی ۔ تار تار لے گئی ۔ اس دھاکے میں وہ پھول سی بچی علیل ہوگئی اور ایسی بیمار پڑی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے ۔ عورت ایسی مفرور ہوئی کہ اس کا پتا نہ لگنا تھا نہ لگا ۔ خدا معلوم زمین کھا گئی یا آسمان ۔ کنووں بانس پڑے نہ ملی ۔ خیال یہ ہوا کہ کسی نے اس سے صندوقچہ چھین کر اسے ٹھکانے لگا دیا ۔ نانا ابا صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے تار پر دو ہزار روپے روانہ کیے کہ بچیوں کا زیور بنوا دو ۔ میں سب زیور بنوا دوں گا ۔ کسی چیز کا غم نہ کرنا ۔ کمزوری میں ہر بات کا زیادہ اثر ہوتا ہے ایسا نہ ہو جان پر بن جائے ۔

میں اپنے چچاؤں کو بے حد چاہتی اور وہ مجھ کو چاہتے ۔ جب میں ذرا بڑی ہوئی تو اماں جان بڑے چچا ابا کے ہاں تھوڑا تو تشریف لے گئیں ۔ بڑے چچا ابا وہاں سر منشی تھے جو اس زمانے میں بہت بڑا عہدہ تھا ۔ حیدرآباد میں میں ابا سے ہی ہوئی تھی ۔ ابا کی جدائی مجھ پر از حد شاق گزری ۔ ادائے مطلب سے قاصر تھی گردن ڈال دی ۔ دودھ سا چھوڑ دیا ۔ رنگ زرد ہو گیا ۔ کم سم ہو گئی۔ ہزار بہلائے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی ۔ اماں تو ایسا فکر ہوا کہ اپنی بجیاں جا کر نہ بچی بھی تو اس بہانے نہ چلی ۔ پریشان تھیں کہ منجھلے چچا ابا باہر سے آئے ۔ جوں ہی میں نے ان کو دیکھا ابا سمجھی اور ان کی گود میں جانے کو ہاتھ پھیلا دیے ۔ جانا کہ ابا مل گئے ۔ ہمارے خاندان میں بیٹیوں کو سب چاہتے ہیں ۔ چچا ابا مجھے بہت پیار کرتے ، اور میں جب ان کی پیٹھ سے چمٹ کر کھڑی ہوتی تو اپنی بیوی سے فرماتے دیکھ بیٹی بھی کیا چیز ہے کہ چمٹی ہے تو کلیجے تک ٹھنڈک پہنچتی ہے ۔ خدا بخشے منجھلے چچا مولوی سیف الحق صاحب اپنی بیوی کو بی کہہ کر مخاطب ہوتے تھے اور بڑی ہی محبت کے انسان تھے ۔ مجھے اپنی ددھیال سے بے حد محبت تھی اور اب بھی ہے ۔

بھائیوں کی باتیں :

میری عادت زیادہ باتیں کرنے کی نہ تھی ، آپا اور بڑے بھائی کی طرح میں خاموش طبیعت کی تھی ۔ یہ عادت ہم میں ابا جان مرحوم کی آئی تھی ۔ برخلاف چھوٹے بھائی محمد اشرف الحق شریر ، ظریف الطبع ، حاضر جواب ، شوخ مزاج ، ہنسنے ہنسانے والے ، مغز سے اتارا تار کر باتیں کرنے والے ، تیز ، عقلمند ، نقالی سے ان کو دل چسپی ۔ گانے کے شوقین ۔ نانا ابا نے ان کا نام بہروپیا رکھا تھا اور بہت چاہتے تھے ۔ بلا بلا کر ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور ان کے جوابوں سے خوش ہو کر تعریفیں کرتے کہ ماشاءاللہ بہت اچھا نکلے گا ۔ ایک دن بھائی باہر سے آئے ۔ نانا ابا نے پوچھا میاں اشرف کیا ہوا ۔ بولے نانا ابا میں باہر کھڑا تھا ۔ آسمان میں ایک کھڑکی ہو گئی ۔ اس میں سے اللہ میاں نے جھانکا ۔ ان کے آرو بازو دو فرشتے تھے ۔ نانا ابا خوب ہنسے ۔ پھر کیا ہوا ؟ مجھے بلانے لگے ۔ میں نے کہا ابھی نہیں آتا ۔ نانا ابا نے پوچھا ۔ اللہ میاں کیسے تھے ؟ بھائی نے جواب دیا ۔ چاند جیسی روشنی ، اور ہوا جیسی ٹھنڈک ۔ نانا ابا نے مذاق بنالیا تھا اور بار بار ان سے یہی سوال کیا کرتے ۔ چھوٹے بھائی کو اپنی ننھیال سے بڑی محبت تھی زیادہ تر ننھیال میں رہتے تھے ۔ نانا ابا کی ان سے چاہت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے چھوٹے بھائی اشرف الحق کی بابت پوچھا کہ یہ آپ کے کون ہوتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا یہ میرا حسین ہے ۔ ان کا بچپن کا گیت تھا جو وہ بہت لہک کر گاتے تھے : ”آج ہم بھی آن پھنسو لاچار ہونا ہو سو ہو“ اس کو اس طرح گاتے : آج ہم

بھی آم بھستو لاچار ہوتا ہو ہو ۔ سو ہو ۔ بولی زبان بھاری آواز ۔ بار بار ان سے گوا کر لوگوں کو مزہ آتا ۔ بڑے بھائی بہت خوبصورت ، بڑی آن کے ، سنجیدہ متین ، صاف ستھرے رہنے کا شوق ۔ ان کو ننھیال میں رہنا اس واسطے پسند نہ تھا کہ وہاں کھچڑی زیادہ کھائی جاتی ہے ۔ میں کالا ہو جاؤں گا ۔ ہنسنا ، سونا ، ساتھ سے رہنا ان کی عادات میں داخل تھا ۔ اماں فرماتی تھیں کہ مشرف یہ گیت گایا کرتے تھے : " میری حنفو نمبر داری رہے ۔ انگیا تا لانو تول کی ۔ میں کھڑی بتاتنے باتی ،، ان کے گلابی ہونٹوں سے بڑا پیارا معلوم ہوتا تھا ۔

چھوٹے بھائی کو ددھیال میں دادی اماں سے بہت محبت تھی ۔ ان کی تعریف کرتے رہتے تھے ، لیکن بد قسمتی سے میں نے دادی اماں کو نہیں دیکھا ۔ میں دو برس کی تھی کہ دادی اماں کے ہاں میری دودھ چھٹائی ہوئی ۔ میری انا بہت غریب ، نیک اور وفادار ملی تھی اس نے پورے دو برس دودھ پلایا ۔ دودھ چھٹائی کے کچھ دن بعد دادی اماں علیل ہو گئیں ۔ یونانی علاج ہوا لیکن کوئی افاقہ اس سے نہ ہوا ۔

دادی اماں کی وفات :

ایک دن دروازے پر ایک فقیر نے صدا دی ۔ بلائیں جٹ حٹ ۔ کسی نے اس کو پیسہ دیا دو پیسے دے یہ لیے بولا کہ مائی کی رضائی دے دو ۔ کسی نے خیال نہ کیا ۔ وہ چلا گیا ۔ اس کے جاتے ہی دوسرا فقیر آ موجود ہوا ۔ دادی اماں نے کسی سے ذکر کیا کہ وہ فقیر یہ سوال کر رہا تھا تو کسی نے کہا اے ہے اس کو خدا نے بھیجا تھا تم اس کو رضائی دے دیتیں تو ساری بیماری رفع ہوجاتی ۔ اب جو رضائی لے کر ماما دوڑی تو اس کی جگہ دوسرا فقیر کھڑا تھا فقیر نے کہا میں وہ نہیں ہوں ۔ بلائیں جٹ کرنے والا اس گلی میں گیا ہے ۔ ڈھونڈا ، دیکھا نہیں ملا ۔ اسی بیماری میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ اناللہ و انا الیہ راجعون ۔ دادی اماں کا صدمہ سب کے واسطے عظیم تھا ۔ جھاڑو کا بندھن تھا جو سب کو اکھٹا کیے ہوئے تھا ۔ سر کا چتر تھا ۔ ان کے جانے سے سب بے کل ہوئے اور سب تین تفرقہ ہو گئے ۔ بڑے چچا ابا نے اپنے مکان چھتے والی حویلی کو بہت سے صرفے سے اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کرایا کہ اونچی کرسی دے کر دالان پیش دالان ، صدر دالان کے پہلو میں دو کوٹھریاں ، پیش دالان کے پہلو میں دونوں طرف خوشنما صحنچیاں ، سامنے بڑا سرخ پتھر کا چبوترا ، اس کے ایک طرف اوپر جانے کا زینہ ، دونوں صحنچیوں کے اوپر بھی دو صحنچیاں دالانوں پر سہ منزلہ پورا مکان جس میں بھائی احتشام الدین صاحب رہا کرتے تھے ۔ اس پر جانے کی نیچے اوپر پختہ سیڑھیاں ۔ چبوترے کے صحن اور صحن میں ایک طرف ایک کمرہ ، اس کے دونوں طرف دو

کوٹھریاں اور کمرے کے سامنے سائبان بنا ہوا ۔ دوسری طرف مولوی مصباح الدین صاحب کے رہنے کے واسطے پورا مکان ساری ضروریات سے مکمل ۔ بڑی ڈیوڑھی اور ضرورت کی سب عمارت ۔ بھائی مصباح الدین صاحب کے علاقے سے اوپر بالا خانے پر بہت کشادہ ایک کمرہ اور سالے اور سب بہوؤں کے رہنے سہنے کا پورا پورا آرام دہ مکان ۔ مکان کیا محل کہ اس میں چھ سات گھر بہ آسانی رہ سکیں اور اس طرح رہے بھی کہ کسی دیورانی جٹھانی میں ذرا سی بھی بدمزگی سننے میں نہیں آئی ۔ ماشاءاللہ بہت سے بچے تھے ۔ سات بیٹے اور ایک دختر کہ پہلی بیوی سے تھے ۔ مولوی مصباح الدین ، محمد احترام الدین ، محمد رکن الدین ، محمد سلام الحق ، محمد سبز الحق ، محمد امین الحق ، محمد احسام الدین ، ارجمند جہاں بیگم آٹھ بچے تو بقید حیات رہے اور کچھ فوت بھی ہوئے ۔ اس کے بعد ان کی اہلیہ راہی عدم ہوئیں جن کے جانے کا چچا ابا کو سخت قلق ہوا کہ یہ ان کے چچا مولوی عبدالحق کی دختر تھیں ۔ اور ان سے ان کو بے حد محبت تھی ۔ دختر ارجمند جہاں بیگم نے گھر سنبھالا اور سب بھائیوں کے کام کاج اپنے ذمے لیے ۔ بیٹی ہو تو ایسی ہو کہ صورت اور سیرت میں لاجواب ۔ عادات و اطوار میں بے نظیر کم سخن ۔ سنجیدہ عقل مند اور ان کے تدبر نے سب بھائیوں کو ان کا تابعدار رکھا ۔

بڑے بھائی مولوی محمد مصباح الدین کی اور ارجمند جہاں بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے والدہ کی زندگی ہی میں مولوی سید عبداللہ صاحب کے ہاں ہوئی جو نمبلے والے مشہور تھے۔ آپس سامنے کا رشتہ ہوا ۔ ایک بیٹی ان کے ہاں دی اور ایک بیٹی ان کی خود لی ۔ اس گھر کے کیا کہنے نور علیٰ نور تھا ۔ یہ دونوں میاں بیوی ، خسر و خوش دامن مولوی صاحب بھی ان کی اہلیہ بھی بڑے ہی نیک لوگ اور پورا گھر نہایت شریف الطبع ، صاحب اقبال ۔ ان کے ہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی ۔ اولاد عزت ، ناموری ، دل ، حوصلہ سب ہی نعمتوں سے اللہ نے ان کو نوازا تھا ۔ بہو اور داماد بھی ان کے قابل ہی ان کو ملے اور سب شاد ساد رہے ۔ یہ عرب خاندان ہے ۔ عرب سے آکر دہلی میں آباد ہوئے ۔ عربوں کے صفات حسنہ ان میں سموئے ہوئے ہیں ۔ ان کے ہاں کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ خاندان کے خاندان ان کے ہاں مہینوں مہمان رہے ۔ نوکروں کے پورے خاندان پرورش پائے ۔ گھر شادی خانہ بنا ہوا ۔ پندرہ سیر آٹا ایک ایک وقت میں پکتا کئی کئی پکانے والے نوکر ۔ آپا ارجمند جہاں بیگم کے ہاں چار بچے ہوئے ۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں ۔ میاں سید عبدالمغنی ، اور سید عبدالمحی ۔ مقصودہ بیگم اور مسعودہ بیگم ۔ بچیاں بڑی خوبصورت اور نیک سیرت ایک کنواری بارہ برس کی عمر میں اور دوسری شادی ہونے کے بعد جنت کو سدھار گئیں ۔ اب خدا رکھے دو لڑکے ہیں ۔ سید عبد المغنی کی شادی اپنے ماموں مولوی مصباح الدین صاحب کی دختر توحیدی بیگم سے ہوئی جو حسن صورت اور حسن سیرت میں قابل تعریف ہیں ۔ پشاور میں ماشاءاللہ اپنے میاں کے ساتھ ہیں ۔

مولوی محمد مصباح الدین نہایت عالم و فاضل فارسی اور عربی کے شاعر بہت کچھ اپنے والد صاحب کے ہم شکل ،نہایت وجیہ ، عادات و خصائل میں اپنے والد کا نمونہ محبت و اخلاق ، ہمدردی ، مہمان نوازی ، صبر و سکون ، ضبط و تحمل ، مسکینی ، خاموشی ، علم و لیاقت میں والد کے مشابہ اور سجادہ نشین حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رحمۃاللہ علیہ کے تھے ۔ ان کے ہاں مولوی سید عبداللہ صاحب کی دختر سے ایک صاحبزادے خان بہادر محمد صبیح الدین بی ۔ اے ۔ بیرسٹر ایٹ لا اور چار صاحبزادیاں ثمر جہاں بیگم عرف بکہ بیگم۔ ثمر جہاں بیگم، نسیم جہاں بیگم، مقبول جہاں بیگم ہوئے ۔ بڑی دختر عالم شباب میں کنواری ہی فوت ہوئیں ۔ دوسری بیٹی ثمر جہاں بیگم کی شادی اپنے چچا کے اکلوتے بیٹے محمد اعتصام الدین سے ہوئی ۔ بڑی ہی نیک فہمیدہ کم سخن عقل مند تھیں ۔ اب ان کی ماشاءاللہ تین لڑکیاں ہیں ۔ سعد جہاں بیگم، شجر جہاں بیگم اور انوار جہاں بیگم خدا ان کا نام جلائے ۔

نسیم جہاں بیگم کی شادی اپنے عزیزوں ہی میں مولوی محمد الحسن بی ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی ایڈوکیٹ سے ہوئی ۔ مقبول جہاں بیگم کی شادی ان کے چچا زاد بھائی خان بہادر محمد نسیم الحق سے ہوئی جو بعد میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے پاکستان میں وظیفہ یاب ہوئے ۔ ماشاءاللہ صاحب اولاد ہوئیں ۔ بھائی محمد صبیح الدین صاحب کی شادی دھوم دھام سے اپنی ماموں زاد بہن معظم جہاں سے ہوئی ۔ جو با اقبال بیوی تھیں ۔ ان کے ہاں دو فرزند اور تین دختر ہوئے ۔ ماشاءاللہ سب لائق اور شائستہ با اخلاق ہیں ۔

بھائی مصباح الدین صاحب کا دوسرا عقد:

بھائی مصباح الدین صاحب کی بیوی نے رحلت کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنے ہی خاندان میں افتخار جہاں عرف اچھی بیگم سے عقد کیا ۔ جو واقعی اسم با مسمیٰ تھیں ۔ نہایت نیک مزاج با اخلاق محبت والی ۔ ان کے ہاں کئی بچے ہوئے ۔ ایک بچی انتصار جہاں عرف پنلی بیگم ان کو میری ہمشیرہ صاحبہ نے گود لے لیا کہ ان کے ہاں لڑکی نہ تھی انہوں نے ان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا اور اپنی خوبیاں ان میں بھر دیں ۔ ایک انہی بچیوں کے بھائی صلاح الدین تھے جو بڑے حسین اور محبت والے تھے ، لیکن بیچارے کی عمر نے وفا نہ کی بہت جلد وہ داغ مفارقت دے گئے ۔ شاید اٹھارہ برس کی عمر بھی نہ تھی کہ شمع حیات گل ہوگئی ۔ اچھی بیگم صاحبہ کے انتقال پر ملال کے بعد بھائی صاحب نے غیر خاندانوں میں یکے بعد دیگرے تین عقد شرعی کیے ۔ ایک بیوی سے ایک جوان خوش رو لڑکا محمد بہاءالدین اٹھارہ برس کی عمر کا ہیضے سے انتقال کر گیا اور وہ بیوی بھی رخصت ہوگئیں ۔

دوسری بیوی سے ایک دختر محفوظہ بیگم ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں دہلی کے ایک نامور خاندان میں مسجد فتح پوری کے امام صاحب کے فرزند مفتی مظفر احمد سے ان کی شادی ہوئی ہے ۔ ان کی والدہ بھی گزر گئیں ۔ سب سے آخری بیوی کے ہاں دو فرزند محمد علاءالدین اور محمد جبین الدین بی اے ۔ ہیں اور ایک دختر نہایت پیاری بڑی اچھی پندرہ سال کی عمر میں راہی جنت ہوئی ۔ بھائی مولوی مصباح الدین صاحب ٹونکہ راجستھان میں دیوان تھے ۔ نہایت عالم و فاضل اور فارسی و اردو میں ان کو تاریخیں کہنے میں خاص ملکہ حاصل تھا ۔ نہایت سادہ مزاج مولوی، صفت انسان کہ ان کی تعریف سے میری زبان و قلم قاصر ہے ۔ وہ بڑے فیاض اور فراخ حوصلہ انسان تھے ۔ ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی مدد کرنا اور ان کا کام کردینا ان کا شعار تھا ۔ کم و بیش نوے برس کی عمر پائی اور آزادی ٔ ہند سے کچھ عرصے قبل مارچ سنہ ۱۹۴۷ ع میں راہی ملک بقا ہوئے ۔

مولوی محمد احترام الدین منشی عالم :

ان کے منجھلے برادر منشی عالم بھائی محمد احترام الدین صاحب نہایت خوش شکل خاموش طبیعت انسان تھے ۔ شروع میں کسی رجواڑے میں ملازم تھے اس کے بعد ریاست حیدرآباد دکن میں تحصیلدار تھے ۔ ان کی شادی ایک نہایت شریف الطبع خوش شکل با اخلاق بیوی سے ہوئی جو حکیم رضی الدین صاحب کی ہمشیرہ ہیں ۔ ان کے ہاں صرف ایک ہی فرزند محمد اعتصام الدین ہوئے جو سارے خاندان میں حسن و جمال میں یکتا سمجھے جاتے تھے ۔ اپنے بڑے چچا کی منجھلی دختر ثمیرہ بیگم سے ان کی شادی بڑی دھوم سے ہوئی ۔ ان کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں ۔ اس واسطے اختصار سے کام لینا ہے ۔ بھائی احترام الدین صاحب کو مرگی کا عارضہ خدا معلوم کس طرح لاحق ہوگیاتھا ۔ اسی عارضے میں حیدر آباد میں ان کا انتقال بہت افسوس ناک طریقے سے ہوا اور حضرت یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے ان کے مزار پر انہی کا ایک شعر کندہ ہے ۔

محمد رکن الدین جادو دہلوی :

چچا ابا خان بہادر مولوی محمد انوار الحق صاحب مرحوم کے تیسرے فرزند محمد رکن الدین جادو حقی دہلوی ، صاحب دیوان تھے ۔ ریاست بھرت پور میں وکیل سرکار تھے ۔ راجا کی ان پر ان کی عقل مندی اور ذہانت کی وجہ سے خاص نظر التفات رہی ۔ وہ اکثر دہلی سے باہر ہی رہے تھے ان کی شادی اپنے ہی خاندان میں گوالیاری عزیزوں کی یعنی مولوی محمد احسان الحق کی بھانجی کفایت جہاں بیگم سے ہوئی ۔ کفایت جہاں کی صورت شکل کے سب مداح تھے حسینوں میں ان کا شمار تھا ،

لیکن بھائی صاحب کو وہ خدا معلوم کیوں ناپسند تھیں ۔ خدا کو پیاری ہوئیں ۔ ان کے ہاں دو فرزند ہوئے ایک ساں ظہیر الدین محمود اور دوسرا ایک نامعلوم شیرخوار بچہ ۔ یہ لوگ بھرت پور میں تھے کہ اچانک سوتے میں مکان کی چھت ان پر آن پڑی اور چھوٹے بچے کے ساتھ ماں بھی اس حادثے سے شہادت کے درجے کو پہنچیں ۔ دونوں کی نعشوں کو ایک صندوق میں رکھ کر دلی لائے اور قطب الدین صاحب میں آرام گاہ بنی ۔ اس کے بعد بھائی رکن الدین صاحب نے اپنا عقد شاہ جہاں بیگم سے کیا جو مولوی احسان الحق صاحب کی بہن کی نواسی تھیں ۔ حقیقت میں وہ شاہ جہاں ثانی تھیں ۔ صورت ، سیرت ، عقل ، نفاست ، اخلاق سب میں ممتاز ، بڑی سلیقہ مند ، صفائی پسند پابند وضع بیوی تھیں ۔ ان کی متعدد اولاد ہوئی جن میں سے صرف ایک بیٹی ہمایوں بیگم جن کی شادی گورکھ پور کے ایک رئیس سید علی نصیر صاحب سے ہوئی اور ایک فرزند مظہر الدین ہوئے ۔

خان بہادر محمد سلام الحق صاحب بی اے :

خان بہادر کے یہ چوتھے فرزند خان بہادر مولوی سلام الحق صاحب بی ۔ اے ۔ بھی محکمۂ ڈاک میں اعلیٰ عہدے تک پہنچے ۔ بڑے اعلیٰ صفات کے مالک تھے ۔ بڑے شان دار ، وجیہ ، لائق ، نیک اطوار ، شریف الطبع انسان تھے ۔ ان کی شادی اپنی چچا زاد بہن فہمیدی بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی جو مولوی سیف الحق ادیب دہلوی کی صاحب زادی تھیں ۔ اور بڑی ہی خوب صورت حسین ظریف الطبع ملنسار بیوی تھیں ، اور میاں صمصام الحق ۔ بی ۔ اے ۔ کی شادی اپنی ماموں زاد بہن شاہدی بیگم سے ہوئی ۔

بھائی خان بہادر محمد سلام الحق صاحب کی بیوی فہمیدی بیگم نے اجمیر شریف میں بچے کی ولادت میں انتقال کیا ۔ بڑی افسوس ناک ان کی موت ہوئی ۔ ان کی نعش بھی دہلی لائی گئی ۔ سارا خاندان اس دن اکٹھا ہوا ۔ قطب صاحب میں تدفین ہوئی ۔ بھائی صاحب کو ان کی رحلت کا سخت صدمہ ہوا جس سے ان کے بڑے بھائی صاحب کو اور ہمشیرہ صاحبہ کو بہت فکر ہوگیا کہ کسی طرح ان کا غم غلط ہو ۔ چپکے چپکے اپنے ہی خاندان میں نسبت ٹھہرا کر عقد کی تیاری کی ۔ عقد سے چند گھنٹے پہلے بھائی صاحب کو اس کی خبر کی تو مجبوراً ان کو بڑے بھائی اور بڑی ہمشیرہ کے ادب سے خاموش ہوجانا پڑا ۔ عقد ہوگیا ۔ سب کو اس خفیہ طور کے عقد سے حیرت ہوئی ۔ میاں تعظیم الحق بی ۔ اے ۔ اور میاں تسنیم الحق بی ۔ اے ، دو فرزند اور دو بیٹیاں ان کے ہاں ہوئیں ۔ بڑی دختر سلمیٰ بیگم ایم ۔ اے ۔ ہیں جو علی گڑھ زنانہ کالج میں لکچراری کی خدمت پر رہیں اور اب بھی کراچی میں اسی خدمت پر مامور ہیں ۔

محمد مبین الحق :

خان بہادر مولوی انوار الحق صاحب کے صاحب زادے عبر پانچ اپنی خاندانی روایات پر پوری طرح قادر تھے ۔ مولویانہ وضع کے انسان ، مسکراتا چہرہ ، خاموش طبیعت ، خوش شکل ، مذہبت زیادہ ، دنیاداری کم ، اعلی انگریزی تعلیم سے کوئی دل چسپی نہیں ۔ ان کی شادی ہونے سے پہلے چچا ابا صاحب نے اپنے دو بیٹوں کو یعنی محمد امین الحق صاحب اور محمد مبین الحق صاحب کو حیدر آباد بھیج دیا کہ ابا جان ان کو تعلیم دلائیں ۔ یہاں آنا بھی تعلیمی لحاظ سے کچھ فائدہ مند نہ ہوا ۔ دہلی جانے کے بعد بھائی مبین الحق کی شادی میرے چچا ابا مولوی وحید الحق کی اکلوتی دختر سے کردی گئی جن کا نام مظفر جہاں بیگم تھا ۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی ۔

آپا مظفر جہاں بڑی ہی محبتی آدمی تھیں ان کو ہم سب سے دلی محبت تھی ، دل تھا یا محبت کا خزانہ ۔ ایک ایک پر جان چھڑکنے کو تیار ۔ اپنے عزیزوں کا تو ذکر ہی کیا کہ ان میں خون ملا ہوا ہوتا ہے ۔ انسان سے بھی ان کو بہت محبت تھی اور بڑی پر خلوص ہوتی تھیں ۔ کھانے پکانے میں بڑی ماہر ۔ ان کے ہاتھ میں قدرت نے عجب ذائقہ بخشا تھا جو چیز پکاتیں لاجواب ہوتی ۔

شادی کے بعد چچا وحید الحق مرحوم کا وظیفہ پچاس روپے ماہوار بھائی مبین الحق پر اس شرط پر اترا کہ دفتر میں آکر دفتری کام سنبھالیں ۔ بھائی مبین الحق صاحب نے اس کام کو خوشی سے قبول کیا ۔ غالباً جے پور کا وظیفہ تھا ۔ کئی برس یہ کام انہوں نے انجام دیا ۔ اس کے بعد گردش کا ستارہ طلوع ہوا اور انہوں نے بارہ ہزار میں سرکاری عمارتیں خریدیں کہ ان کو کسی دوسری جگہ زیادہ قیمت میں فروخت کردیں تو معقول معاوضہ ملے گا ۔ یہ عمارتیں سونے چاندی کی تھیں اور سودی قرضہ لے کر خریدیں ۔ ان عمارتوں نے ان کو سخت پریشان کیا ادھر سود بڑھتا گیا ادھر عمارتیں پرانی ہوتی رہیں آخر مجبوراً سرکار نے ان عمارتوں کا حساب اپنے ذمے لے کر ان کا جاری کردہ منصب اس طرف لگادیا ۔ اور ان کو منصب سے سبکدوش ہونا پڑا ۔ بہت پریشان رہے اور صبر و سکون قناعت سے اس پریشانی کو برداشت کرتے رہے ۔ منجھلی چچی صاحبہ جن کے یہ داماد تھے اور جن کا اسم شریف انوری بیگم تھا جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں ۔ ان کو اپنی ان اکلوتی دختر سے بھی سکھ نہ مل سکا ۔ بڑی ہی نیک خصلت سیدھی سادی بھولی بھالی صابر و شاکر بیوی تھیں ۔ ابا جان ممکنہ مدد کے واسطے حاضر تھے ۔ وہ اپنی دختر کے ساتھ چھپے والی حویلی میں رہتی تھیں ۔ آپا مظفر جہاں بیگم کو اللہ نے کئی اولادیں عطا فرمائیں ۔

لیکن بھائی صاحب کو وہ خدا معلوم کیوں ناپسند تھیں ۔ خدا کو پیاری ہوئیں ۔ ان کے ہاں دو فرزند ہوئے ایک میاں ظہیر الدین محمود اور دوسرا ایک نامعلوم شیرخوار بچہ ۔ یہ لوگ بھرت پور میں تھے کہ اچانک سوتے میں مکان کی چھت ان پر آن پڑی اور چھوٹے بچے کے ساتھ ماں بھی اس حادثے سے شہادت کے درجے کو پہنچیں ۔ دونوں کی نعشوں کو ایک صندوق میں رکھ کر دلی لائے اور قطب الدین صاحب میں آرام گاہ بنی ۔ اس کے بعد بھائی رکن الدین صاحب نے اپنا عقد شاہ جہاں بیگم سے کیا جو مولوی احسان الحق صاحب کی بہن کی نواسی تھیں ۔ حقیقت میں وہ شاہ جہاں ثانی تھیں ۔ صورت ، سیرت ، عقل ، لیاقت ، اخلاق سب میں ممتاز ، بڑی سلیقہ مند ، صفائی پسند پابند وضع بیوی تھیں ۔ ان کی متعدد اولاد ہوئی جن میں سے صرف ایک بیٹی ہمایوں بیگم جن کی شادی گورکھ پور کے ایک رئیس سید علی نصیر صاحب سے ہوئی اور ایک فرزند مظہر الدین ہوئے ۔

خان بہادر محمد سلام الحق صاحب بی اے :

خان بہادر کے یہ چوتھے فرزند خان بہادر مولوی سلام الحق صاحب بی ۔ اے ۔ بھی محکمۂ ڈاک میں اعلیٰ عہدے تک پہنچے ۔ بڑے اعلیٰ صفات کے مالک تھے ۔ بڑے شان دار ، وجیہ ، لائق ، نیک اطوار ، شریف الطبع انسان تھے ۔ ان کی شادی اپنی چچا زاد بہن فہمیدی بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی جو مولوی سیف الحق ادیب دہلوی کی صاحب زادی تھیں ۔ اور بڑی ہی خوب صورت حسین ظریف الطبع ملنسار بیوی تھیں ، اور میاں صمصام الحق ۔ بی ۔ اے ۔ کی شادی اپنی ماموں زاد بہن شاہدی بیگم سے ہوئی ۔

بھائی خان بہادر محمد سلام الحق صاحب کی بیوی فہمیدی بیگم نے اجمیر شریف میں بچے کی ولادت میں انتقال کیا ۔ بڑی افسوس ناک ان کی موت ہوئی ۔ ان کی نعش بھی دھلی لائی گئی ۔ سارا خاندان اس دن اکھٹا ہوا ۔ قطب صاحب میں مدفون ہوئی ۔ بھائی صاحب کو ان کی رحلت کا سخت صدمہ ہوا جس سے ان کے بڑے بھائی صاحب کو اور ھمشیرہ صاحبہ کو بہت فکر ہوگیا کہ کسی طرح ان کا غم غلط ہو ۔ چپکے چپکے اپنے ھی خاندان میں نسبت ٹھہرا کر عقد کی تیاری کی ۔ عقد سے چند گھنٹے پہلے بھائی صاحب کو اس کی خبر کی تو مجبوراً ان کو بڑے بھائی اور بڑی ھمشیرہ کے ادب سے خاموش ہوجانا پڑا ۔ عقد ہوگیا ۔ سب کو اس خفیہ طور کے عقد سے حیرت ہوئی ۔ میاں تعظیم الحق بی ۔ اے ۔ اور میاں تسنیم الحق بی ۔ اے ، دو فرزند اور دو بیٹیاں ان کے ھاں ہوئیں ۔ بڑی دختر سلمیٰ بیگم ایم ۔ اے ۔ ھیں جو علی گڑھ زنانہ کالج میں لکچراری کی خدمت پر رہیں اور اب بھی کراچی میں اسی خدمت پر مامور ھیں ۔

محمد مبین الحق :

خان بہادر مولوی انوار الحق صاحب کے صاحب زادے نمبر پانچ اپنی خاندانی روایات پر پوری طرح قادر تھے ۔ مولویانہ وضع کے انسان ، مسکراتا چہرہ ، خاموش طبیعت ، خوش شکل ، مذہبیت زیادہ ، دنیاداری کم ، اعلی انگریزی تعلیم سے کوئی دل چسپی نہیں ۔ ان کی شادی ہونے سے پہلے چچا ابا صاحب نے اپنے دو بیٹوں کو یعنی محمد امین الحق صاحب اور محمد مبین الحق صاحب کو حیدر آباد بھیج دیا کہ ابا جان ان کو تعلیم دلائیں ۔ یہاں آنا بھی تعلیمی لحاظ سے کچھ فائدہ مند نہ ہوا ۔ دہلی جانے کے بعد بھائی مبین الحق کی شادی میرے چچا ابا مولوی وحید الحق کی اکلوتی دختر سے کردی گئی جن کا نام مظفر جہاں بیگم تھا ۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی ۔

آپا مظفر جہاں بڑی ہی محبتی آدمی تھیں ان کو ہم سب سے دلی محبت تھی ، دل تھا یا محبت کا خزانہ ۔ ایک ایک پر جان چھڑکتی تھیں کو سارے ۔ اپنے عزیزوں کا تو ذکر ہی کیا کہ ان میں خون ملا ہوا ہوتا ہے ۔ اماں سے بھی ان کو بہت محبت تھی اور بڑی پر خلوص بیوی تھیں ۔ کھانے پکانے میں بڑی ماہر ۔ ان کے ہاتھ میں قدرت نے عجب ذائقہ بخشا تھا جو چیز پکائیں لاجواب ہوتی ۔

شادی کے بعد چچا وحید الحق مرحوم کا وظیفہ ساٹھ روپے ماہوار بھائی مبین الحق پر اس شرط پر اترا کہ دفتر میں آ کر دفتری کام سنبھالیں ۔ بھائی مبین الحق صاحب نے اس کام کو خوشی سے قبول کیا ۔ غالباً جے پور کا وظیفہ تھا ۔ کئی برس یہ کام انہوں نے انجام دیا ۔ اس کے بعد گردش کا ستارہ طلوع ہوا اور انہوں نے بارہ ہزار میں سرکاری عماریات خرید لیں کہ ان کو کسی دوسری جگہ زیادہ قیمت میں فروخت کردیں تو معقول معاوضہ ملے گا ۔ یہ عماریات سونے چاندی کی تھیں اور سودی قرضہ لے کر خریدیں ۔ ان عمارتوں نے ان کو سخت پریشان کیا ادھر سود بڑھتا گیا ادھر عماریات پرانی ہوتی رہیں آخر مجبوراً سرکار نے ان عمارتوں کا حساب اپنے ذمے لے کر ان کا جاری کردہ منصب اس طرف لگادیا ۔ اور ان کو منصب سے سبکدوش ہونا پڑا ۔ بہت پریشان رہے اور صبر و سکون قناعت سے اس پریشانی کو برداشت کرتے رہے ۔ منجھلی چچی صاحبہ جن کے یہ داماد تھے اور جن کا اسم شریف انوری بیگم تھا جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں ۔ ان کو اپنی ان اکلوتی دختر سے بھی سکھ نہ مل سکا ۔ بڑی ہی نیک خصلت سیدھی سادی بھولی بھالی صابر و شاکر بیوی تھیں ۔ ابا جان ممکنہ مدد کے واسطے حاضر تھے ۔ وہ اپنی دختر کے ساتھ چھتے والی حویلی میں رہتی تھیں ۔ آپا مظفر جہاں بیگم کو اللہ نے کئی اولادیں عطا فرمائیں ۔

چھوٹی دختر ستیر جہاں بیگم عرف اکرام جہاں بڑی محبت والی ملنسار ہیں۔ ان کی پیدائشی گھڑی خدا معلوم کون سی منحوس گھڑی تھی کہ بیچاری کو دنیا میں سکھ نہ ملا ۔ عجیب دکھ بھری داستاں ہے کہ جو سنے کلیجہ تھام کر رہ جائے ۔

چھوٹی سی عمر میں ان کی نسبت اپنی ایک رشتے کی خالہ کے اکلوتے فرزند سے ٹھیری ۔ بہت مالدار لوگ ان کے ایک ہی بیٹا ساری املاک کا مالک ، بظاہر سب اچھا تھا ۔ انہیں لوگوں کے حوصلے کے موافق بڑی دھوم سے ستیر جہاں کی منگنی ہوئی ۔ سب اس نسبت سے شاد شاد تھے ۔ بعض کو دولہا والوں کی طرف اس نسبت سے حسد بھی تھا کہ ہمارے ہاں کیوں پیام نہ دیا ان کے ہاں کیوں کی ۔ یہ زہر بعض لوگوں نے دولہا کی والدہ کے سامنے اگلا بھی ، لیکن انہوں نے اس کی پروا نہ کی ۔

شادی بڑے آرزو ارمانوں سے ہوئی اور دولہا کی طرف سے بہت کچھ جڑھاوا جوڑے دلہن کے واسطے آئے ، لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ دلہن کو وداع ہونے صرف ایک شب ہی گزری تھی کہ دوسرے دن دولہا کا مزاج ناساز ہوگیا ۔ اس کو ہیضہ ہوا تھا کیا ہوا کہ چند دن ہی میں دولہا چٹ پٹ ہوگیا ۔ ایسا سانحہ کہیں دیکھا نہ سنا خدا جانے کس کی نظر لگی یا حسد لگا کہ بنا بنایا کھیل آناً فاناً میں بگڑ کر رہ گیا ۔ والدہ اپنے اکلوتے فرزند کے غم میں جاں بلب ہو گئیں ، لیکن انہوں نے یہ نہ کیا کہ اس ناشاد دلہن کے نام جائداد یا نقدی کردیتے کہ وہ چین سے بسر کرسکتی ۔ سب نے نہایت مجبور ہوکر عقد ثانی کروایا ، لیکن وہ بھی زیادہ سازگار نہ ہوا ۔

محمد امین الحق :

چچا ابا کے فرزند نمبر چھ محمد امین الحق جن سے میری ہمشیرہ اصغری بیگم مرحومہ بچپن سے منسوب تھیں بڑے ہی زندہ دل ، ظریف الطبع اور خوش اخلاق با محبت آدمی تھے ۔ ابا جان کے پاس رہے ۔ انہوں نے انجنیری کا امتحاں دلا کر محکمہ انہار (آب پاشی) میں ملازم کرا دیا ۔ اور ان کو ایسی اچھی بیوی خدا نے عطا فرمائی جو حسن صورت و سیرت میں انمول تھیں ۔ ان کی شادی کا مفصل حال آئندہ انشا' اللہ لکھوں گی ۔ بھائی صاحب بڑے ہی بامذاق آدمی تھے ان کا ہنسی مذاق سب سے چلتا تھا ۔ جب دھلی آتے جھتے والی حویلی میں سب کو ہنساتے، سناتے ۔ بھاوجوں سے بھی وہی مذاق رھا کیونکہ بھاوجیں اپنی چچا زاد بہنیں ہی تو تھیں ۔ کسی سے سالی بنا کر مذاق ہورھا ہے تو کسی سے سمدھن بنا کر ،غرض جب وہ حیدرآباد سے دھلی آتے سب ان کے آنے سے خوش ہو جاتے ۔

محمد احتشام الدین صاحب ایم اے :

اب چچا ابا کے ساتویں صاحبزادے مولوی احتشام الدین صاحب ایم۔ اے۔ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنی ہے۔ وہ سب بھائیوں میں عقل مند، صائب الرائے ہوئے۔ ایم۔ اے۔ ان کے واسطے کیا تھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ لیاقت رکھتے تھے۔ فارسی مثل مادری زبان کے تھی۔ شاعری میں ان کو کمال حاصل تھا۔ علی گڑھ میں رہے وہیں پڑھا اور وہیں ملازم ہوئے۔ لائبریرین کی خدمت ان کے سپرد تھی۔ علمیت ترقی کرتی رہی شادی بیاہ ان کا ہوا نہ تھا۔ ان کو صرف علمی مشغلہ رہتا تھا۔ دھلی اکثر آتے رہتے تھے۔ رسالوں میں ان کے مضامین نکلتے رہتے تھے جو سب کو پسند آتے۔ رسالہ خاتون میں اکثر نظمیں چھپتیں اور ایسی دلچسپ ہوتیں کہ لوگوں کو ازبر ہوجاتیں۔ ان کے دوست ان کے ہم عصر سب لائق فائق لوگ تھے۔ جن کی صحبت سے ان میں روز بروز زیادہ چمک پیدا ہوتی رہی۔ خود ان کی صحبت اور لیاقت سے بہتوں کو فیض پہنچا۔ کئی برس نواب صاحب جاورہ کے صاحبزادوں کے اتالیق رہے وہ اجمیر شریف میو کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد حیدرآباد تشریف لاکر بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے دست راست بنے۔ اردو لغت میں دن رات کا انہماک رہا۔ ان کو خبر نہ تھی کہ ان کو آرام بھی کرنا ہے یا رات سونے کے واسطے ہوتی ہے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو بہ حسن و خوبی اختتام کو پہنچایا۔ دیوان حافظ کی غزلیات کا منظوم ترجمہ کردیا۔ جس میں فال بھی دیکھی جاتی ہے۔ علی گڑھ کالج میں زنانہ کالج قائم کرنے میں شیخ عبداللہ صاحب کے موید و مدد گار وہ بھی تھے۔ بہت لوگ خاندان میں ان کو میاں مندر کہتے تھے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کی کھلائی مبتی۔ ان کو بہلانے کے واسطے گیت گایا کرتی تھی: "ذرا سے بالما مندری کا نگینہ ہو"۔ اس وجہ سے ان کو لوگ مندری کہنے لگے۔ اسی لفظ مندری سے مندر ہوئے اور پھر عزیزوں میں میاں مندر کہلائے جانے لگے۔ مبتی لوٹا بھر کر سیڑھیوں سے اتر رہی تھی زینے میں گری اور بیچاری مر گئی۔

بھائی صاحب کی نسبت میری ہمشیرہ اختری سے ہوگئی تھی۔ اور بھائی اس ننھی سی دلہن سے جو ان سے منسوب تھی بہت خوش تھے۔ جب وہ چار برس کی ہوکر چل بسی تو ان کو بڑا رنج ہوا اور حیرت بھی ہوئی ہوگی کہ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلہن شادی سے پہلے ہی مرجائے۔ اس کے بہت دن بعد ان کی نسبت میری پھوپھی زاد ہمشیرہ ممتاز جہاں بیگم کی دختر سعیدہ سلطان جہاں عرف بانو بیگم سے ٹھہری، اور ان کا آنا جانا حقّے والی حویلی میں بند ہوا کہ سسرال سمجھی جانے لگی۔ وہ بیچاری بھی عین رجب کے مہینے میں جب شادی ٹھہری تھی راہی جنت ہوئیں اور ان کو سخت صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

آخر میں ان کی شادی میری عزیز بھتیجی سعدی بیگم سے ہوئی جن کی شادی کا مفصل ذکر آگے انشاءاللہ لکھوں گی۔ ان سے پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے اب خدا رکھے دو ہیں۔ محمد مشرف الحق اور محمد شان الحق حقی۔ مشرف الحق انگلستان میں بغرض تعلیم سدھارے تھے وہیں رہ گئے، وہیں شادی کرلی اور اب ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔

خورشید جہاں بیگم صاحبہ:

چچا ابا مولوی انوار الحق صاحب کا دوسرا عقد دادا مولوی ضیاء الدین صاحب مرحوم کی سالی خورشید جہاں بیگم سے ہوا تھا جو بیوہ تھیں اور ان کے صرف ایک بیٹے مولوی سید مناظر علی صاحب خورد سال تھے۔ یہ میاں کالے صاحب کی پوتی تھیں جو آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے۔ چچی اماں خورشید جہاں بیگم بڑی عقلمند، مدبر، خوش اخلاق، دیندار، اعلیٰ کردار والی بیوی تھیں۔ چچا ابا ان کی لیاقت، حسن اخلاق، حسن انتظام سے بہت خوش رہے۔

ان کے ہاں چار لڑکیاں ہوئیں، تنویر جہاں بیگم، نوید جہاں بیگم، تصویر جہاں بیگم اور نیر جہاں بیگم، سب نہایت خوبصورت، خوش سیرت، بامحبت، بااخلاق، وضعدار، خانہ زیب تہذیب شائستہ اور روشن خیال ہوئیں۔ تصویر جہاں تو کم سنی ہی میں رحلت کر گئیں۔ تنویر جہاں سب سے زیادہ والدین کی پیاری رہیں وہ بہت کچھ اپنی بڑی ہمشیرہ ارجمند جہاں بیگم کے مشابہ تھیں۔ اور والد کی بہت خدمت گذار۔ بہت ہی سنجیدہ، خاموش طبیعت، سب کی آنکھوں کا تارا بنی رہیں۔ ہم بچیوں کو حیرت تھی کہ ان پر کبھی ڈانٹ نہیں پڑتی نہ نصیحت کی جاتی ہے۔ اور ہم نے ان کے بارے میں ایک آزمائش بھی کی تھی۔ ہوا یہ کہ چھتے والی حویلی میں عرس تھا اور عرس ایک شادی کی طرح منایا جاتا تھا۔ صحن میں دیگیں رکھی تھیں۔ رات کے وقت کھانا نکالا جارہا تھا۔ دن کو ختم قرآن شریف ہوا وعظ ہوا۔ شب کو چراغ روشن ہوئے۔ سب بچے چراغوں کو دیکھ کر اندر آبیٹھے اور ان کی بتیاں بنانے میں مصروف ہوئے۔ آٹھ بجے نیاز دی گئی کھانا نکالا جانے لگا۔ چچی اماں صاحبہ کھانا نکالنے میں مصروف تھیں۔ تنویر جہاں اندر صدر دالان میں سورہی تھیں۔ ہم کئی بچیوں کو جو شرارت سوجھی تو ہم نے کہا کہ چلو تھوڑا سا پانی لے جاکر تنویر جہاں کا پاجامہ بھگودیں۔ جب ان کی اماں دیکھیں گی تو کہیں گی کہ اے ہے تم نے یہ کیا کیا کہ چاندنی پر پیشاب کردیا۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور چپکے سے انجان ادھر ادھر کھڑے ہوکر تماشا دیکھنے لگے۔ ان کو ذرا بھی بے آرام نہ کیا۔ آہستہ سے اٹھا کر کپڑے بدل دیے۔ بچیاں ہنستی رہیں۔ غرض ان کی اس قدر چاہت تھی کہ کوئی اف نہ کرتا۔ اس بیچاری بچی

کی قسمت کہ مرادآباد میں پھوپھا نصیر الدین احمد صاحب کے فرزند امیر الدین احمد سے شادی ہوئی۔ ان کے ہاں اس انمول جوہر کی ذرا قدر نہ ہوئی۔ اور بہت جلد وہ ایک ذرا سا بچہ چھوڑ کر چلے کے اندر یا باہر ہی لحد میں خاموشی سے جا سوئی۔ خدا نے اس کی مدد دہی کی اور وہ آرام سے ہوگئی۔ اب ان کی نشانی خدا رکھے ایک فرزند محمد وزین الدین ہیں جو حسن صورت میں بہت کچھ اپنی والدہ کے مشابہ ہیں۔ ان کی شادی انتصار جہاں عرف بلی بیگم سے ہوئی۔

نوشیر جہاں بیگم:

نوشیر جہاں بیگم کی دوسری بہن نوشیر جہاں بیگم ان سے عمر میں برس سوا برس چھوٹی ہیں۔ جو مجھ کو بہت عزیز ہیں۔ میرا ان سب بہنوں سے رشتے کے علاوہ۔ پہلاپا بھی رہا، اور پکی دوستی۔ ہم ایس میں حقیقی بہنوں سے زیادہ الفت و محبت رکھتے تھے۔ نوشیر جہاں نے بچپن میں خود آپو کی ایک آیا سے سن کر ایک گیت یاد کرلیا تھا۔ اور وہ بڑے مزے سے گایا کرتی تھیں:

> میں چلی آئی گھر، خاوند سے لڑ کے،
> میں چلی آئی جھوم جھام جھنا فنا کر کے۔

بڑی لٹک کے ساتھ یہ گیت معصومانہ انداز میں گاتیں۔ اس واسطے چچا ابا صاحب یعنی ان کے والد صاحب نے ان کو ڈومنی کا خطاب دیا۔ ان دونوں بہنوں، نوشیر جہاں اور مہر جہاں میں جاذبہ زیبی بہت تھی، اور دونوں اپنے فیشن کی دلدادہ۔ وہی سنگھار کا طریقہ وہی لباس میں وضع داری۔ قدیم زمانے کی چیزیں ان کو ایک آن پسند نہ تھیں۔ اور ہماری طرح وہ اس بات میں اپنے خاندان سے مرعوب نہ تھیں بلکہ کسی کی پروا نہ کر کے آگے بڑھ جانے والی تھیں۔ ان کو دولہا بھی نئے فیشن کو پسند کرنے والے ملے جو تعلیم یافتہ اور آزاد خیال تھے، اس سے ان کو اپنے ارادوں میں مدد ملی اور شملے کی رہائش نے ان کو پردے سے بے نیاز کردیا۔

میرے منجھلے چچا ابا مولوی سیف الحق ادیب کے چھوٹے صاحبزادے محمد انعام الحق جو وائسرائے کے دفتر میں انڈر سیکرٹری کے عہدے پر ممتاز تھے ان سے ان کا عقد ہوا۔ اب میں بھائی انعام الحق کی طبیعت کو واضح طور سے بیان کرتی ہوں۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی نسبت بھائی مصباح الدین کی دختر نمر جہاں بیگم سے طے ہوئی تھی، اور یہ اس نسبت کو بہت پسند بھی کرتے تھے۔ ان کی منگیتر کو دق کا عارضہ ہوگیا اور وہ فریش ہوگئیں۔ بھائی انعام الحق سے پردہ کرتی تھیں وہ ان کو دیکھنے کے لیے نہ جا سکتے تھے اپنی ماما مکھو کو خدمت کے واسطے

ان کے تیر بھیجا کرتے تھے، لیکن وہ اپنی شرمیلی و حیادار تھیں کہ مکھو کا آنا ان کو ناگوار گزرتا اور مکھو سے پردہ کرتیں۔ ان کی حسرت دیدار جوں کی توں رہ گئی اور بیچاری عین عالم شباب میں چل بسیں۔ بھائی انعام کو سخت صدمہ ہوا۔ انہوں نے ان کے جنازے کی تصویر لی۔ اور ان کے غم میں مرثیہ لکھا:

مرثیہ

فلک کی وہ جب خاک میں سونے والی
خدا کی امان تجھ پہ ہو بھولی بھالی

مری ڈبرونوں میں ہو آرام جنت
تو بےکھٹکے سوتی رہے سونے والی

تری قبر پر ہار سنگھار برسے
بہاراں بنے تیرے روضے کی جالی

ترے قصر سے ہانس پر کنواری گئی اں
مرادیں تیری ہیں وہ ترے ہاتھ خالی

اس سانحے کے بعد دل برداشتہ ہو کر انہوں نے دہلی کو خیرباد کہا، اور بحرین روانہ ہو گئے۔ کئی برس وہیں رہے۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ کبھی واپس آئیں گے، لیکن خدا نے ان کے دل میں ڈالی اور آئے۔ سب نے ان کو دہلی میں روکنے کی کوشش کے واسطے یہ بات ان کے دل میں ڈالی کہ وہ اپنی شادی کرلیں۔ بہت رد و کد کے بعد انہوں نے اس شرط پر منظور کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ رات کے وقت عقد ہو اور صبح ہی وہ اپنی شریک زندگی کو لے کر اپنی ملازمت پر شملے روانہ ہوجائیں، اور دوسری لڑکیوں پر انہوں نے اپنی چچا زاد بہن توقیر جہاں کو ترجیح دی کہ وہ ان کے حسب منشا ہیں۔ اور ان کے ہاں خاموشی سے عقد کردینے کو منظور بھی کرلیا گیا۔ رات کو عقد ہوا صبح کو دونوں دولہا دلہن شملے روانہ ہوئے۔ ہم اسی دن حیدرآباد روانہ ہورہے تھے تو چچی اماں سے ملنے نئی حویلی گئے تھے جو چچا ابا نے اپنی ان بیگم کے نام بنوا دی تھی۔ دیکھا کہ غیر معمولی تیاری ہورہی ہے۔ اور کھانے کا بھی انتظام ہو رہا ہے، لیکن نہ اماں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تقریب ہے نہ چچی اماں نے ازخود ذکر کیا۔ حیدرآباد پہنچنے کے بعد جو دہلی سے خطوط آئے ان سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو عقد ہوا۔ کوئی مہمان نہ آیا تھا صرف دولہا کے گھر والے تھے۔ انہوں نے توقیر کو اپنی حیثیت کے موافق رکھا اور بہت آرام سے رکھا۔ وہ چھ مہینے دہلی اور چھ مہینے شملے میں رہتی تھیں۔ پردہ ان کے ہاں بالکل نہ تھا۔ اس پر مجھے ایک بڑا مزے دار واقعہ یاد آیا۔ ایک دن نانا ابا صاحب نے اماں سے کہا کہ حضور صغرا بیگم میں تو مولوی انوار الحق صاحب کو بہت پسند کرتا تھا اور چھما بیگم (یہ آپا ارجمند جہاں بیگم کا عرف تھا) کی بہت عزت میری نظروں میں تھی، لیکن یہ کیا ہوا کہ

جہاں بیگم نے ملنے جانے پر پردہ اڑا دیا ۔ مجھ سے آج ایک صاحب نے ذکر کیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مولوی انوار الحق صاحب کی بیٹی کو انہوں نے بے پردہ دیکھا ۔ اماں دسکرانیں اور بولیں جی نہیں جہاں ۔ تم کیوں پردہ چھوڑیں گی ان کی دوسری اہلیہ کی بیٹی سمنے پر رہی ہیں وہ ہوں گی ۔ نانا ابا نے فرمایا ہاں میں ہراچھے والوں میں جہاں بیگم اور ممتاز جہاں کو پسند کرتا ہوں ۔ یعنی ایک چچا ابا کی صاحبزادی ارجمند جہاں بیگم اور دوسری میری پھوپھی زاد ہمشیرہ صاحبہ کو ۔ بوقر نے اپنے شوہر کے زمانے میں بڑے عیش سے زندگی گزاری ۔ ان کے ہاں کئی لڑکے ہوئے اور فوت ہوئے ۔ اب خدا رکھے صرف ایک بیٹے محمد شداالحق ہیں جو ماشاء اللہ خوش‌رو اور لائق ہیں اور دختر زیرک بیگم سلمہا کی شادی سالار شرف الحسن سے ہوئی ۔

منیر جہاں بیگم :

توقیر جہاں نے چھوٹی بہن جہاں تھیں جن کی محبت کی کرنیں میرے دل کو گرماتی تھیں ۔ خوش جمال خوش اخلاق جامہ زیب محبت والی ۔ ان کی شادی بمبئی کے بوہرہ خاندان میں مسٹر طیب علی اکبر مرچنٹ سے ہوئی تھی، اور اپنے گھر میں بہت خوش تھیں ۔ میری محبت میں وہ بمبئی سے حیدرآباد آئیں ۔ ایک مہینے میری مہمان رہیں اور مجھ سے بچھڑ کر روتی ہوئی بمبئی روانہ ہوئیں ۔ افسوس کہ ننھے ننھے تین بچے اپنی نشانی چھوڑ کر راہی فردوس ہوئیں ۔ اپنی بھتیجی سعدی سے کم ان کا ملال مجھے نہیں کہ وہ مجھے دل سے چاہتی تھیں ۔ اب ان کے لڑکے میاں صفدر اور میاں انور ہیں اور دختر زندہ بیگم ۔ چچا ابا کےسب بچوں کی کیفیت مفصل لکھ چکی ہوں ، اب منجھلے چچا کے گھر لے چلتی ہوں ۔

مولوی محمد سیف الحق ادیب :

منجھلے چچا ابا مولوی سیف الحق ادیب دہلوی وجیہ با اخلاق ظریف‌الطبع انسان تھے ۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے ۔ ان کی شادی ان کی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی ، نام حمیدی بیگم تھا ۔ نہایت شرم و لحاظ کی ایک شریف‌الطبع بیوی تھیں ۔ رنگ میدے کی طرح سفید تھا ، ناک نقشہ و قد موزوں ، دیندار ، صفائی پسند ، سلیقہ مند ، خاموشی کی عادت زیادہ ، کسی سے بات چیت نہیں ۔ سب سے محبت و خلوص سے پیش آنے والی ، خاطر تواضع کرنے والی تھیں ۔ ان کا رہنا سہنا تو سسرال میں تھا میکہ کوچہ سعد اللہ میں تھا ۔ میکے اور سسرال میں سب ان سے محبت کرتے تھے ۔ ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ ان کو جس کسی بیوی نے دلہن بنایا تھا انہوں نے کانوں کا زیور جھلنیاں

جو خاصا وزنی ہوتا ہے کان جھبد کر بہنا دیا ۔ دلہن نے اف نہ کی جب اور کسی نے دیکھا تو کہا اے ہے غضب ہے کیسے برداشت کیا ہوگا ۔ بڑی صابر سوی تھیں ۔ اللہ نے ان کی بڑی آزمائش کی جس میں وہ پوری اتریں ۔

ان کے تین فرزند اور ایک دختر تھیں ۔ محمد طاہر حق جو آخری تعلقے دار امرجند و گدوال ہوئے اور حیدرآباد میں رہے ، محکمہ پولیس میں ملازم تھے اور بعارضہ ہیجیں ورنگل میں فوت ہوئے ۔ محمد انعام الحق جن کا ذکر ابھی اوپر آ چکا ہے اور فہمیدی بیگم زوجہ محمد سلام الحق سب بچے عقل مند ، خوسرو ، ظریف الطبع اور ہونہار تھے ۔ بڑے فرزند بارہ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ وہ حیدرآباد ہی میں اپنے چھوٹے حچا خان بہادر مولوی محمد شرف الحق صاحب کے زیر تربیت رہے ابتدا میں ان کو کروڑ گیری کی اسپنی ملی ، اور خاص حیدر آباد ہی میں اباجان کے پاس رہے ۔ یہ بڑے عقلمند ، ظریف الطبع اور ذی فہم صائب الرائے تھے ۔ متواضع ، خوش مذاق اور خوش رو بھی روتوں کو ہنسانے والے ، شریف الطبع ، پابند وضع ۔ ان کو اپنے چھوٹے چچا یعنی میرے والد صاحب سے بہت محبت تھی اور ان کے اطاعت گزار با ادب بھیجیے تھے ۔ گھنٹوں ابا سے باتیں کر رہے ہیں تو ادب سے بیٹھتے تھیں ۔ ایک لفظ ان کی مرضی کے خلاف کبھی زبان سے نہ نکلا ۔ ابا جان ہی کے زیر سایہ ان کی شادی دھلی میں کی گئی ۔ دلہن گوالیار سے بیاہ کر آئیں جو دادی اماں کی بھانجی تھیں ۔ نام احسانی بیگم تھا ۔ صورت شکل اچھی ، عرب طبیعت کی حودہ پندرہ برس کا سن ۔ حکیم اسد اللہ خان کی دختر تھیں ۔ گوالیار کی بود و باش ، طور طریقہ ، بول چال ، لب و لہجہ دھلی سے مختلف تھا ۔ بھائی ظفر جس قدر تیز فہم آدمی تھے وہ اسی قدر سیدھی تھیں ۔ دستور کے موافق ایک برس گھونگٹ میں رھیں ۔ ان کے بیٹے میاں اظہر حق جو اب ماشاء اللہ حیدر آباد میں اچھے عہدے پر پہنچے اور وظیفہ یاب ہوئے ، جب یہ صرف سوا برس کے تھے کہ بھائی صاحب نے دلی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا ۔ عدیم الفرصتی کا عذر رہا ۔ اسی طرح چھ سات برس علیحدہ گزرے ۔ اس عرصے میں کبھی گوالیار میں اپنے میکے میں رہتیں اور کبھی دھلی میں اپنی خوش دامن کے پاس ۔ کسی کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوئی نہ انہوں نے کبھی کسی سے میاں کی برائی کی کہ وہ پلٹ کر نہیں پوچھتے ۔ بچہ جو اب سات برس کا تھا باپ کی صورت کو ترستا ۔ دھلی سے والد کے خط آتے تو بھائی کہتے کہ وہی بلانے کا تقاضا لکھا ہوگا ۔ بعض وقت خط بھی ضائع ہوجاتا ۔ غرض سب کو نا امیدی تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی ۔

اب بڑا تماشا ہوا ۔ کہتے ہیں کہ بارہ برس کے بعد انسان کے دن پھرتے ہیں ۔ ہم لوگ

دہلی میں تھے۔ ہمارے اباجان دہلی آئے ہوئے تھے جن کو اپنی بھاوج کا بڑا لحاظ تھا کہ بڑی بھاوج ہیں۔ انہوں نے اپنی مرضی کا یوں اظہار کیا کہ ابا دلہن کو لے جا کر حیدرآباد پہنچادیں۔ سوائے اس کے چارہ نہیں۔ آخر کب تک یہ معاملہ ایسا رہے گا۔ ابا نے ان کی بات منظور کی اور ہم سب کے ساتھ وہ دہلی سے حیدر آباد آئیں، اور بہت خوش خوش۔

ابا نے بھائی صاحب کو اپنے حیدرآباد آنے کی اطلاع دی اور آکر ملنے کو لکھا۔ بھائی فوراً اپنے چچا کی طلبی پر بلاوے آگئے۔ جب دوپہر کے کھانے کا دستر خوان بچھا اور سب جمع ہوئے، اب نہ پوچھو کہ سب کے پیٹوں میں کیسی گدگدیاں ہورہی تھیں، اور خواہمخواہ ہنسی چلی آرہی تھی۔ بھابی کو اندر ہی رکھا تھا بچے سے کہہ دیا تھا کہ جس وقت ہمارے ابا دستر خوان پر بیٹھے ہوں تم ان کے پیچھے سے آکر چمٹ جانا۔ بچے نے ایسا ہی کیا۔ بھائی اڑتی چڑیا کو پہچاننے والے تھے سمجھ گئے، لیکن شرم و لحاظ سے انہوں نے سر کر بھی نہیں دیکھا کہ کون بچہ ہے۔ سب کھانا کھا چکے تو ابا نے ان سے فرمایا کہ میاں ظفر میں ان لوگوں کو لے آیا ہوں تم اپنے ساتھ لے جانا کیونکہ اب بھائی تحصیلدار تھے اور ان کا رہنا سہنا کسی اور جگہ تھا۔ ایسا ہی ہوا بھابی کو سوار کرا دیا اور وہ ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے بہت ہنسی خوشی ان کو رکھا۔ بھائی کے مذاق کا حال سنیے، بیوی کو ہمیشہ چھیڑا کرتے تھے ان کے ساتھ ان کی کھلائی نجیبن آئی تھیں۔ ایک ماما یہاں کی تھی اس کا نام روح افزا تھا۔ نجیبن پرانی آدمی تھیں ان کا غصہ روز روح افزا پر اترتا تھا، اور بھائی بجائے اس کے کہ کسی پر ناراض ہوں نجیبن کو اور شہ دے دے کر لڑواتے تھے، اور ہنس کر تماشا دیکھتے۔ کسی دن لڑائی نہ ہوتی تو خود کہتے لاحول ولاقوة یہ روح افزا عجیب آدمی ہے۔ ناحق بیچاری نجیبن کو برا بھلا کہتی ہے۔ نجیبن کو خواہ مخواہ بدنام کرتی ہے کہ اس سے لڑتی ہیں مارتی ہیں۔ بھلا اس بیچاری نے اس کا کیا بگاڑا۔ اب نجیبن صاحبہ آئیں تو جانیں کہاں۔ غصے سے لال پیلی ہوجاتیں اور کہتیں کہ دیکھو کیسی مردار ہے، بھائی کہتے بڑی نالائق ہے۔ وہ تم کو خواہمخواہ کوستی ہے۔ اسی طرح بھائی پھلجھڑیاں چھوڑتے اور دونوں میں خوب دھوم دھام کی جنگ ہوا کرتی۔ نجیبن اس کی جان کو آجاتیں۔ اور سب ہنستے، پھر بھائی ہنستے اور کہتے کہ میں نے تو کچھ کہا نہیں۔ ابھی ذرا رونق رہتی ہے، اور اگر آواز باہر تک پہنچی یا ابا جان باہر سے اندر آئے تو ان کو چپ کرنے کو صرف ایک آواز کافی تھی۔ خدا جانے لفظ "خاموش" میں کیا جادو تھا کہ سب چپ ہوجاتے۔ اس طرح اکثر غریب روح افزا کی شامت آتی رہتی تھی۔ بھابی نے مدتوں دہلی کا رخ نہ کیا۔ پھر بھائی تحصیلدار سے تعلقہ دار ہوئے۔ ان کا مزاج ان کی فراخ دلی ان کی ظرافت کا ہمیشہ ایک حال رہا۔ ان کا دسترخوان ہمیشہ

وسیع رہا۔ تمام رعایا ان سے خوش اور سب عہدے داروں میں ان کی تعریف رہی۔ جب تک حیدرآباد میں تھے روزانہ مٹھائی کا معمول تھا، سب کو پکڑ پکڑ کر لاتا کھلاتا۔ خدا نے ان کی بات کی برکت سے ان کو بہت دیا اور بھائی کا ایک دفعہ کا قصہ مجھے اس وقت یاد آگیا جو بڑا دلچسپ ہے۔ میں اور ابا ان کے ہاں حضور آباد گئے تھے۔ بھائی نے بڑی خاطر مدارات کی اور مہمان سب بے حد خوش۔ خوب وہاں کی سیر کی، ٹرانس۔ روز تھانے میں دور دور جا کر آتے۔ برکال کا مشہور مندر بھی بھائی نے دکھایا، جو بڑا شاندار اور قابل دید مندر ہے۔ یہاں ایک بڑی عمارت ہے جس میں پورے پورے جسم کے دیوہیکل بت مختلف قسم کے بنے ہیں۔ ان میں سے ایک خالص فیروزے کا بنا ہوا ہے۔ بڑے اہتمام سے پوجا ہوتی ہے۔ ہم نے خوب سیر و تفریح کی اور بھائی سے ملنے بھیجنے کا تقاضا کرتے رہے، لیکن بھائی اس بات کو ٹال جاتے۔ جب اصرار کی حد ہو گئی تو مجبورا بھائی راضی ہوئے اور ہم کو تھانے میں سوار کروا دیا۔ لیکن تھانے والے کو منع کر دیا کہ گھما پھرا کر رات کو یہیں لے آنا۔ ہم سب بے وقت ہو ہوا کر سوار ہوئے۔ اسٹیشن وہاں سے کئی میل دور تھا۔ تھانے میں چلے جا رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ اسٹیشن چلے جا رہے ہیں۔ جب ہم نے ان سے دریافت کیا کہ بھئی اب اسٹیشن کتنی دور ہے تو ہنس کر بولا بیگم صاحبہ اب تو گھر آرہا ہے۔ جب واپس آ کر اترے تو بڑا ہنسی مذاق رہا۔

جس زمانے میں حیدرآباد میں ملک کی وبا آ کر پھیلی تو روز ایک خط چلا آتا کہ یہاں آجاؤ۔ خدا کے واسطے حیدرآباد سے نکلو اور ایسے مذاقیہ خط لکھتے کہ پریشانی بھول جاتی اور بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ لکھتے کہ تم تو مضبوط آدمی ہو اس قسم کے سسر کو کیوں پھنسا رکھا ہے۔ قسم و سسر سے مراد میرے شوہر تھے اس طرح خطوں میں بھی ہنسانے کے چٹکلے ہوتے جیسے ان کی باتوں میں ہوتے تھے۔ اب ان کی محبت اور خلوص یاد آتا ہے۔ بچوں میں بھی اسی محبت کی جھلکیاں ہیں

محمد اسلام الحق :

چچا ابا کے دوسرے فرزند محمد اسلام الحق بھی بہت محبت کے آدمی تھے ان کی اپنی والدہ کی طبیعت بھی اچھی تھی۔ بہت نرم مزاج، میٹھی زبان، غرور و تمکنت سے کوسوں دور۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ ایک رشتے کی چچا زاد بہن خورشید جہاں بیگم عرف جھمو بیگم سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کو بہت چاہتے تھے، لیکن ان کی کم نصیبی کہ ان کے ہاں صرف ایک ہی بچی تولد ہوئی چار مہینے کی ہو کر ان کی گود خالی کر گئی۔ کئی سال بعد انہوں نے اولاد کے واسطے عقد ثانی کیا۔ ان سے اب دو لڑکے اور ایک بچی ہے۔ بڑے پیارے بچے ہیں، لیکن وہ ان کی بہار نہ دیکھ

سکے اور ذرا ذرا سی جانوں کو چھوڑ کر سفر آخرت کر گئے۔بچے پلے بڑھے، اب ماشاءاللہ جوان ہیں،بیٹی کی شادی مولانا محمد علی جوہر کے سالے سے ہوئی تھی۔ مجھے تو ان بچوں کو دیکھے کئی برس ہوئے۔

خان بہادر محمد انعام الحق بی۔ اے:

تیسرے فرزند جو میرے منجھلے چچا ابا کے تھے وہ محمد انعام الحق ایک اعلیٰ خیال انسان تھے۔ ان کا ذکر میں اوپر لکھ آئی ہوں بہت ہی اچھی طبیعت کے مالک، طبیعت میں ظرافت کے ساتھ مسکینی اور غربت بھی تھی۔ علی گڑھ سے ابا جان نے ان کو بی۔ اے۔ کرایا۔ وہ ابا کو اپنے والد کے بجائے سمجھتے رہے۔ بیوی کی بہت عزت، بہت محبت۔ ماشاءاللہ کئی لڑکوں کے بعد ایک بچی بالکل حسن کی گڑیا کی طرح کی ہوئی۔ بچوں اور بیوی کے عاشق تھے۔ لیکن خدا کو زیادہ دن عیش و عشرت میں رکھنا منظور نہ ہوا۔ وہ دورے پڑتے تھے کہ راستے ہی میں طبیعت ناساز ہوئی۔ بہتا کے دواخانے میں رجوع ہوئے۔ باوجود علاج کے جاں بر نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر سے کہا کہ جب میرے والد کا انتقال ہوا تھا تو میری عمر دس برس کی تھی۔ اللہ نے مجھے اس مرتبے کو پہنچایا۔ اب میرا بچہ دس برس کا ہے خدا ہی اس کا مدد گار ہے۔ جب انہوں نے معاملہ خدا پر رکھا تھا ویسے ہی مالک برور دگار نے ان کے بچوں کو ہر طرح اپنی نگہبانی میں رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ بھائی انعام الحق کی علالت کا تار بیوی کو بھیجا تھا تو وہ تو پہنچا آئیں اور ان کی آخری رسومات ادا کیں۔خدا نے ہی ان کو صبر عطا فرمایا کہ اس پہاڑ سے صدمے کو وہ برداشت کر سکیں اپنے بچوں کو اسی محبت و لاڈ سے پالا اور اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ وہ ان کو ایک سیکنڈ اپنے سے جدا نہیں کرسکیں۔ ان کی زندگی کا سہارا یہ دونوں بچے ہیں۔ ما خورد سال نواسہ ہے جس کو بے حد چاہتی ہیں۔ زیرک بی بی کی شادی اپنی ماموں زاد بہن کے فرزند میاں شریف الحسن ایم۔ اے۔ سے ہوئی۔ وہ ایک عمدہ کیرکٹر کے مالک ہیں، اور اپنی خاندانی خوبیوں پر قائم۔

فہمیدی بیگم:

منجھلے چچا ابا مرحوم کی اکلوتی دختر آپا فہمیدی بیگم تھیں جو بالکل سفید سندہ جیسی رنگت والی بڑی ہنس مکھ روتوں کو ہنسانے والی بیوی تھیں۔ ان کی شادی اپنے بڑے چچا کے فرزند محمد سلام الحق بی۔ اے۔ سے ہوئی تھی آپس میں بہت سلوک محبت موافقت رہی۔رہنا اجمیر شریف میں تھا۔ ننھے ننھے پیارے کئی بچے تھے بچہ ہونے میں فوت ہوئیں۔ ان کا جنازہ دہلی لایا گیا۔ سارا خاندان جمع ہوا اتنا صدمہ سب کو اس اچانک موت کا تھا کہ دنوں انہیں کے چرچے رہے۔ ان کا حسن، ان کا اخلاق، ان کی ظرافت و محبت ہر ایک کے دل پر نقش تھی۔

مولوی وحید الحق صاحب مرحوم :

یہ میرے منجھلے چچا ابا تھے ۔ ان کی صرف ایک ہی دختر بقید حیات رہیں ، مظفر جہاں بیگم ۔ ان کی ایک اور بہن خضر جہاں بھی تھیں جو بچپن میں رحلت کر گئیں ۔ آپا مظفر جہاں بڑی ہی خلیق محبت والی ملنسار ، ہمدرد ہوی تھیں ۔ شاید ان کے جتنے بہن بھائی اور ہوتے سب کی محبت اور خلوص ان اکیلی میں قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا ۔ ان کی شادی اپنے چچا زاد بھائی محمد مبین الحق صاحب سے ہوئی تھی اور ان کا پورا حال میں اوپر بیان کر آئی ہوں ۔

خورشید جہاں بیگم :

میرے والد کی صرف ایک ہمشیرہ صاحبہ تھیں جن کا نام خورشید جہاں بیگم تھا جو واقعی اپنے گھر کی بلکہ اپنے پورے خاندان کی خورشید تھیں ۔ ان کا حسن ان کے سیاہ چمکیلے گھونگر والے بالوں نے اور زیادہ کر دیا تھا ۔ اپنے ہی خاندان میں مولوی نصیر الدین صاحب تحصیلدار سے ان کی شادی ہوئی جن کی سکونت مراد آباد میں تھی ۔

ممتاز جہاں بیگم :

پھوپی صاحبہ کے ہاں کئی اولادوں میں صرف ایک ہی دختر ممتاز جہاں بیگم رہیں جن سے خدا رکھے ان کا نام چلا ۔ ان کا ذکر میں پچھلے اوراق میں کر آئی ہوں کہ وہ ہر طرح ایک ممتاز شخصیت کی مالک تھیں ۔ ان کے ہاں کئی اولادیں ہوئیں جن میں صرف ایک دختر سعیدہ سلطان جہاں عرف بانو بیگم اور محمد انتظام الدین حسن بقید حیات رہے ۔ انہی دونوں کو دیکھ کر وہ اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھیں ۔ دونوں بچے نہایت عقل مند نہایت لائق اور خوشرو تھے ۔ والدہ ہر ایک کام ان کی رائے سے کرتیں ۔ ان کا دل میلا نہ ہونے دیتیں ۔ اور سارا خاندان بچوں کو اور والدہ کو بھی ان کی محبت و اخلاق کی وجہ سے خصوصیت سے چاہتا تھا ۔ وہ اپنے اخلاق کی وجہ سے بھی ممتاز ہستی تھیں ۔ اور سب کی ہمدرد اور صلاح کار ۔ ان کا ایک شعر ہے :

اڑ چلو بلبل بوئے گل ممتاز اس چمن کی وہ اب بہار نہیں

دینی اماں :

جب اماں کراچی جا کر رہیں تو ممتاز جہاں نے مجھے آزردہ دیکھ کر کہا تم مجھے اپنی دینی اماں بنالو اور دینی اماں اماں پکارا کرو ۔ ان الفاظ سے میرا کمہلایا ہوا دل ذرا ہرا ہوا ۔ اور اس دن سے میں ان کی دینی بیٹی اور وہ میری دینی اماں ہوئیں ۔

بڑے بھائی کی شادی:

بڑے بھائی کی شادی میں، میں چار برس کی تھی - مجھے یاد ہے کہ اس وقت برات دلہن کے گھر جارہی تھی - میں جاتکار پر سنہری اپنے ننھے ننھے مہندھی لگے ہاتھوں سے دعا مانگ رہی تھی - کسی نے پیچھے سے مجھے گود میں اٹھا لیا - اسی طرح دعا مانگتی میں بگھی میں سوار کرا دی گئی - بھائی کی شادی کا صرف یہی حصہ مجھے یاد ہے -

میری بسم اللہ:

جب میری بسم اللہ کی عمر ہوئی تو اماں نے گلابی کریب کا بہت خوش نما دوپٹا بنایا جس پر ریشم سے بڑے خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے - دوپٹے پر سنہری گوٹا اور جمنا کی توئی لگی ہوئی تھی - سبز فناوز کا ڈھیلا پاجامہ اس پر سرخ لوٹ لگی ہوئی اور مصالحہ ٹکا ہوا - بسم اللہ پڑھانے کے بعد مجھے گود میں دادا ابا صاحب کے پاس اٹھا کر لے گئے -

دادا ابا کا حلیہ مبارک:

صاحب موصوف دادی اماں کے انتقال کے بعد دیوان خانے کے باہر کے حصے میں جس کو ڈیوڑھی کہتے ہیں چوبی تختوں پر سفید فرش پر تشریف رکھتے تھے - ان کا رنگ نہایت گورا تھا بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک، سفید ریش، نورانی چہرہ، سفید انگرکھا پاجامہ، سفید ہی اچکن، سر پر سفید گول ٹوپی - آشوب چشم کی وجہ سے چہرے پر سفید نقاب پڑی ہوئی - تخت پر ایک طرف جانماز بچھی ہوئی، اور تخت کے نیچے ان کی شادی جہیز کی ہندوستانی پاپوش رکھی ہوئی - اسی ڈیوڑھی کے پہلو میں ایک حجرہ تھا جس میں خدا معلوم کیا کیا سامان ہوگا مجھے تو صرف اپنے مطلب کی بات یاد رہ گئی کہ اس میں خشک میوہ رکھا رہتا تھا جو ہم کو ایک مٹھی ملتا تھا - اور اکثر کبھی دونی کبھی چونی مصری کھانے کو اپنے متبرک سفید ریشم جیسے ہاتھوں سے مرحمت فرماتے - اس چونی اور دونی کی مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی اور اسے خرچ کرنے کو دل نہ چاہتا - دنوں سینت سینت کر رکھتی آخر وہ گم ہوجاتی - دادا ابا کی مقدس ہستی بڑی ہی قابل قدر تھی - سارے محلے پر ان کا رعب تھا - ان کے سامنے جاتے لوگ لرزتے تھے - بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک دن انہوں نے ہمارے اباجان کو سلام کرتے ہوئے نہیں دیکھا - جوان بچوں والے بیٹے کو انہوں نے کان پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا، ابا بیٹھ گئے اور معذرت خواہ ہوئے -

ایک دن ابا حیدر آبادی منصب داری پگڑی پہنے ہوئے دادا ابا کے پاس تشریف لے گئے تو دادا ابا نے فرمایا " یہ کیا کاں سیلیوں کی سی ٹوپی پہنی ہے" - پھر ابا نے ان کے سامنے ویسی پگڑی نہیں پہنی -

بڑے بھائی کی شادی کے حالات:

اماں ابا کے ہاں کی پہلی تقریب تھی ، دلوں میں حوصلے اور ارمان بھرے ہوئے - فارغ البالی اور برکت کا زمانہ - اس کا حوصلہ اور سلیقہ - چاہتا خوبصورت تابعدار بیبا - اپنی سند کی حسین نیک شرسلی ہو - سخاوت حسین کی بھتیجی مولوی سراف حسین صاحب کی اکلوتی حسین دختر دلہن کا سن چودہ برس کا - بھائی کو سترھواں بھر کے اٹھارواں برس لگا - دلہن والے دور کے عزیز ہوتے تھے - گوپامئو ضلع ہردوئی کے رہنے والے - دہلی میں ان کا مکان عرب سرائے میں تھا - بڑے چاؤ چوچلے سے شادی رچائی گئی - بارات عرب سرائے گئی - دلہن متوسط گھر کی لڑکی تھی - میکے سے معمولی سا جہیز ملا تھا - ادھر سے اماں جان نے ان کو سونے میں پیلا موتیوں میں سفید کر دیا - رت کے جوڑے کے علاوہ ایک ہزار کا جوتھی کا جوڑا - لیواں کم خواب کا بڑے پانچوں کا گلابی پاجامہ اس پر سبز کارچوبی گوٹ لگی ہوئی مصالحہ ٹکا ہوا - اسی کے ساتھ کی محرم کرتی - بابل لٹ کا چھاپے کا دوپٹا جس پر مقیش سے ماھی سب کا جال بنا ہوا کارچوبی کام کا - بوٹی ٹھپا کرن آنچل لگے ہوئے - اور باقی جوڑے سب قابل دید - زیور میں سر پر مرصع جھومر کانوں میں مرصع جھمکے کے بالے اور مرصع بالی پتے - گلے میں نہایت عمدہ جڑاؤ ہنسلا اور مرصع چندن ہار - ہاتھوں میں طلائی کڑے پونچیاں کنگن - بازو پر جوشن نونگے - ناک میں نتھ - خوبصورت انگشتریاں اور مرصع آرسی - پاؤں میں طلائی دو دو جوڑیاں - کارچوبی سرخ جوتی جس پر سنہری گھنگرو لگے ہوئے - انگوٹھوں میں طلائی چھلے - زیور اور کپڑوں میں دلہن ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ جنت کی حور ہے یا پرستان کی پری - دولہا اور دلہن کو اللہ نے اس قدر حسین بنایا تھا کہ نظر لگنے کا ڈر - شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی کہ سب میں واہ واہ ہوگئی - نانا ابا کی طرف سے ایک ہزار چالے کے اور ماموں کی طرف سے چالے کے پانچ سو ملے، باقی اور عزیزوں نے زیور اور نقدی دی - دونوں دولہا دلہن صورت سیرت میں لاجواب - دلہن کی شرم کی سب تعریف کرتے تھے - دنوں آنکھ نہیں کھولی ، مہینوں کسی سے بولی نہیں جوں کی چال چلتی - میرے چھوٹے بھائی محمد اشرف الحق شرارت سے ان کے راستے میں لیٹ جاتے کہ آنکھیں دیکھوں - سب میں ہنسی ہوتی - دلہن شرم سے دوھری ہوجاتی - غرض سب کی خوشی کے لحاظ سے بڑی کامیاب شادی رھی - مجھے تو بھابی

بے حد پسند تھیں ۔ ساری عمر پسند رہیں ۔ وہ اور میں عمر کے لحاظ سے اگرچہ برابر نہ تھے ، لیکن ان کی اور میری ایک بات رہی ۔ رہنا سہنا ، کھانا پینا، سونا، بیٹھنا سب بھائی کے ساتھ ۔ وہ میری بڑی پیاری سہیلی تھیں ۔

کہانیاں :

بچوں کو عموماً کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے ۔ مجھے بھی کہانیوں سے بڑی دلچسپی رہی جو کوئی مہمان ہوتی رات کو رہنے والی آس ان سے کہانیوں کا مطالبہ کرتی اور بڑی اچھی اچھی کہانیاں سننے میں آتیں ۔ دو کہانیاں ایسی عجیب سنیں کہ اب تک یاد ہیں ۔

پہلی کہانی :

لو میں ان کو دھرا کیوں نہ دوں ۔ ایک دن بوا اساسی جو نانی اماں کے ہاں اکثر آیا کرتی تھیں ان سے ہم نے حسب معمول کہانی کی فرمائش کی ۔ وہ ایک آہ سرد کے بعد بولیں ۔ اے بنی میری کہانی ہی ایسی ہے کہ ختم نہ ہو ۔ ہم بچوں نے کہا اچھی بوا ہم سے کہو ۔ وہ کیا کہانی ہے ۔ بولیں لو بوا سنو ۔ ہم گاؤں میں رہا کرتے تھے ۔ ہمارے کوئی نہ تھے ۔ خوب ناچ گھر میں آتا لاڈوں کے لال بنے رہتے ۔ ہم دو بہنیں اور ایک لاڈلا بھائی ، سب سے چھوٹا ۔ اماں ابا دونوں صبح سے جا کر کھیت پر کام کرتے اور ہم دونوں بہنیں گھر پر رہتے ۔ شام کو اماں ابا آتے ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم دونوں سے ماموں نے آکر کہا کہ چلو تم کو کھیت پر بلایا ہے ۔ جلدی چلو ہم خوش خوش تیار ہوگئے ، اور ماموں کے ساتھ ہولیے ۔ بوا راستہ چلنے کی عادت نہیں ، تھک گئے ۔ ماموں سے کہتیں کہ اب کھیت کتنی دور ہے وہ کہتے اب آگیا ۔ یونہی ہم کو بہلاتے وہ ڈیوڑھی میں لے گئے اور بولے جاؤ اندر جاؤ ۔ اماں یہیں ہیں ۔ ہم اندر پہنچے تو دیکھا کہ ایک بیگم صاحبہ بیٹھی ہیں ، ان کی ماما ہے ۔ ہم نے ان کو سلام کیا انہوں نے بیٹھنے کو کہا بیٹھ گئے ، مگر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس کا گھر ہے اور کون بیگم ہیں ۔ انہوں نے کچھ دیر کے بعد ہم کو کوٹھری میں بند کروا کے کنڈی لگوادی ۔ اب بوا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ۔ ہم کو اپنے یہاں رہنے کا مقصد نہ معلوم ہوا اور اماں ابا کی طرف سے الگ پریشانی رہی کہ وہ کیا کہہ رہے ہوں گے ، اور کتنی پریشانی ہوگی ، ضرورت کو بھی ماما ہم کو لے جاتی تو جاتے ۔ ہر وقت پہرا چوکی میں رہتے خدا جانے کتنے دن بیت گئے ۔ نہ ہم نے کسی سے پوچھا نہ کسی نے ہم کو بتایا ۔ بس بوا دل پر بنی ہوئی تھی اور دہن کو قفل لگا ہوا تھا ایک دن کی

کرنی ایسی ہوئی کہ ہم جو ضرورت کو جانے لگے تو ماما اس وقت نہ تھی۔ دروازے کے بعد ہی صحن خانہ تھا۔ ہم دونوں کو وہاں بھائی کی سی آواز سنائی دی تو ہم نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو سچ مچ ہمارا ہی بھائی۔ دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ ڈر کے مارے برا حال کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پھر بھی ہم نے بھائی سے کہا اے بھائی تم یہاں کہاں؟ بھائی نے کہا۔ میں یہاں نوکر ہوں۔ اور تم یہاں کیوں؟ ہم نے رو کر کہا کہ ماموں ہم کو یہاں بیچ گیا ہے۔ اس نے تسلی دی اور کہا کہ اب میں تم کو لے چلوں گا۔ تمہارے غم میں تو ابا کا انتقال ہو گیا، اماں اندھی ہو گئیں اور تم یہاں ہو۔ اچھا جاؤ وہ خفا نہ ہوں کل گھر چلنا۔

اب بچو تم سچ جانیا کہ میرے دل کا کیا حال تھا۔ بری طرح گھر یاد آنے لگا کہ خدایا پر دے دے جو ہم اڑ جائیں۔ ادھر ابا کا غم کہ ہائے کیا صدمہ لے گئے۔ ادھر اماں کے اندھے ہونے کا غم کہ ہم کو اماں اب کیسے دیکھیں گی۔ بھائی کے اچانک ملنے کا خیال اور حیرت کہ اللہ نے کیسا ملا دیا۔ وہی خیال رہا، اور دل کا برا حال تھا۔ وہ رات ہم نے کانٹوں پر گزاری۔ اور ذرا الگ لگا ہوا کہ ان کو شبہ نہ ہوجائے کہیں وہ ہم پر اور پابندی نہ لگا دیں۔ خدا خدا کر کے رات گزاری صبح ہوئی۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ گزرنے لگا، لیکن صبح سے شام اور رات ہو گئی بھائی کا پتا نہیں۔ اللہ کیا ہوا۔ بھائی کیوں نہیں آئے۔ ایک دن گزرا دو دن گزرے بھائی کی خبر خبر ہی نہیں ملی۔ ایک دن بیگم صاحبہ نے ماما سے کہا کہ بوا۔ باہر کے آدمی کو کیا ہوا۔ کئی دن سے نہیں آیا۔ ماما نے کہا بیوی آپ کو خبر نہیں وہ بیچارہ مرگیا۔ انہوں نے کہا کب اور کیسے؟اس نے کہا کہ ہیضہ ہوا تھا۔ جھٹ پٹ ہو گیا کئی دن ہوئے۔ اب جو ہم نے سنا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ہائے یہ کیا ہوا۔ بس ہم دونوں زار و قطار رونے لگے اور ہائے بھیا ہائے بھیا کہنے لگے۔ بیگم بیچاری حیران ہوئیں۔ اور بولی ارے کیا ہوا تم دونوں کیوں رو رہی ہو۔ اب بولا کس سے جاتا، بے قراری اور زیادہ ہوگئی۔ وہ کرید کرید کر پوچھ رہی ہیں۔ تب ہم نے سب ان سے کہا تو ان کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ رونے لگیں۔ ماموں کو ہزار ہا صلواتیں انہوں نے سنائیں ہم کو تسلی دی اور گاڑی منگوا کر ماما کو ساتھ کرکے ہم کو گھر بھیجا۔ جانے کتنے دن پیچھے گھر کی شکل دیکھی، اور خوب دل کھول کر روئے اور ساری عمر اسی غم میں گزری کہ بھائی کیسا گیا۔ گھر کیسا تباہ ہوا۔ اماں اندھی ہوئیں باپ جان سے گئے۔ تو بیوی یہ ہماری کہانی ہے خدا دشمن پر ایسا غم نہ ڈالے۔ ہم بچوں کو ان کے ساتھ بڑی ہمدردی ہوگئی اور ان سے بار بار طرح طرح کے سوال کیا کرتے۔

دوسری کہانی :

اسی طرح کی ایک آپ بیتی ایک اور بیوی نے سنائی تھی جو غالباً آپ پسند کریں گی۔ ایک گوری سی لال بالوں والی بیوی آیا کرتی تھیں ان کی سچی کہانی ہے جو سن کر مجھے تعجب ہوا تھا۔ کسی رسالے میں بھی درج کرائی تھی۔ اس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور وہ یہ ہے :

بیوی ہم لوگ متوسط الحال لوگ تھے اور ہمارا چھوٹا سا خاندان نانی والدہ اور مجھ پر مشتمل تھا۔ گھر میں ایسی تنگ دستی آئی کہ کوئی کمانے والا نہ رہا نانی اور والدہ دونوں بے سہارے تھیں۔ جس مکان میں ہم لوگ رہتے تھے اس کا کرایہ نہ ادا ہوسکتا تھا۔ سخت مجبور و لاچار ہو کر ہم ایک کھنڈر میں جارہے جو واقعی کھنڈر تھا۔ اس میں ایک زینہ تھا جو اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ زینے میں ہمیشہ قفل پڑا رہتا۔ اوپر کوئی نہ جاتا۔ میں نے کئی بار نانی سے کہا کہ اوپر جاؤں۔ انہوں نے منع کردیا کہ مالک مکان نے قفل ڈال دیا ہے جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرے دل میں بڑا شوق تھا کہ اوپر جا کر دیکھوں، آخر کیوں منع کیا ہے۔ میں کم عمر تھی چلبلی تھی۔ ایک دن اماں اور نانی کہیں گئی ہوئی تھیں کہ مجھے شرارت سوجھی قفل کو لگی ہلانے وہ گویا ہلانے کی راہ ہی دیکھ رہا تھا کھل پڑا۔ میں خوشی سے اچھل پڑی، آہا جی اب اوپر جاؤں اور دیکھوں کہ ہے کیا؟

تو بیوی میں اوپر پہنچی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ اوپر ایک کمرہ بنا ہوا ہے۔ اور یہ کمرہ خوب آراستہ ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اور اس سے زیادہ حیرت اس بات سے ہوئی کہ اس کمرے میں ایک اعلیٰ درجے کی سنہری اکی ہوئی تھی۔ اس پر ایک خوبصورت جوان بڑی اچھی پوشاک پہنے سو رہا ہے۔ اس کے قریب ہی سینوں پر عمدہ عمدہ بے موسم پھل چنے ہوئے ہیں۔ کوری کوری صراحیوں میں پانی بھرا ہوا۔ سفید صافیاں بندھی ہوئی۔ جھمجھماتے قلعی دار کٹورے رکھے ہیں۔ چوکی پر قلعی دار آفتابے پانی بھرے ہوئے، سچے سلابچی دھری ہے صابن دان بیسن دان سب موجود ہے۔ میں دنگ سی ہوگئی، اور ایک ایک چیز کو حیرت سے تکنے لگی۔ اتنے میں وہ سوتا ہوا نوجوان خواب سے بیدار ہوا۔ اور باہر نکل کر میرا نام لے کر پوچھنے لگا کہ کیا دیکھ رہی ہو؟ آؤ سنترے انار کھالو۔ آم بھی ہیں۔ سب تمہاری پسند کی چیزیں ہیں۔ بولو تم کو کیا چاہیے۔ میں ڈر کے بھاگنا چاہتی تھی کہ انہوں نے بازو پکڑ لیا روکنے لگے۔ وہ ہنس کر بولے ارے تم تو ڈر گئیں۔ ڈرو نہیں آخر کیا بات ہے؟ مجھ پر اماں اور نانی کا ڈر سوار تھا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ذرا سا برائے نام کچھ کھایا اور نیچے اتر آئی۔ لیکن سارا خیال اوپر پڑا

ہوا تھا کہ کون ہوں گے۔ کیسے محبت والے ہیں اخلاق بڑا اچھا ہے، اور کتنے امیر آدمی ہیں۔ نہ اماں اور نانی خدا جانے کب پھر باہر جانیں اور مجھے اوپر جانا ملے۔ ایک کسک تھی کہ دل کھنچا جا رہا تھا۔ اور وہ روز کو وہی یاد آرہے تھے۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہم کو ہر جگہ سے روپے اور پیسے ملنے لگے اور اس بات سے سب کو حیرت سی ہونے لگی کہ آخر یہ کون رکھ جاتا ہے۔ دن بدن ہم خاصے امیر ہونے لگے۔ اور اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس تھا۔ میں اکثر اوپر جاتی اور ان کی مزے دار باتوں سے دل بہلاتی اور خوب کہانی بیتی تھی۔ میری خالہ کے ہاں سے شادی کے تقاضے آنے لگے کہ اب جلدی کرو لڑکی ماشا اللہ سیانی ہے۔ اماں نانی نے بھی ان کے سوالیے کو منظور کر لیا۔ اور پھر میں شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگیں۔ میں جو اوپر گئی تو وہ کہنے لگے کہ اب تمہاری شادی ہوجائے گی تو تم چلی جاؤ گی۔ مجھے شرم آنے لگی کہ میں اس کا کیا کروں۔ وہ چھیڑتے رہے۔ میں چپکی ہورہی۔ تو تھوڑی دن جانے دیر نہیں لگتی شادی کی تیاریاں دونوں طرف ہونے لگیں اور وہ دن آپہنچا کہ برات آئے میں ایک کونے میں سر جھکائے دلہن بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ پھر میں سب مہمان بھرے ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا لو برات آگئی نکاح ہورہا ہے۔ مہمان آنے لگے اور وہ اعلیٰ درجے کی پوشاکیں اور زیور آیا کہ سب تعریفیں کرنے لگے۔ دولہا والے تو سمجھ رہے تھے کہ دلہن کی طرف کا ہے اور دلہن والے سمجھے کہ دولہا کی طرف سے آیا ہے۔ مہمان بیویوں میں چرچا ہورہا تھا کہ ابھی تو دولہا آیا تھا نکاح ہوا۔ یہ دوسرا دولہا کیسا آیا۔ ایک کی بات دوسرا جھٹلا رہا تھا اور بعض چہ می گوئیاں کر رہے تھے کہ کیا بات ہے۔ مجھے خوب خوب آراستہ کیا۔ زیور اور کپڑوں میں سر سے خوب میرا سنگھار کیا۔ اتنے میں کیا مزا ہوا کہ زینے کا دروازہ جو مقفل رہا کرتا تھا ایک دم سے کھل گیا۔ اور دولہا خوب اعلیٰ درجے کا لباس اور جڑاؤ زیورات پہنے ہوئے سہرا بندھا ہوا اترا اور سیدھا آ دلہن کو گود میں اٹھا کر زینے پر چڑھ گیا۔ مجھے ان باتوں کی خبر نہیں۔ بیویوں کو کہتے ہوئے سنا اوئی یہ کیا۔ اوئی یہ کون دولہا۔ تو بوی یہ ہے ہماری کہانی۔ اس کے بعد خدا معلوم نیچے کیا فصحتا ہوتا رہا۔ میرے ساں نے مجھ سے کہا بیگم تمہاری خالہ جان کا اس شادی میں کافی پیسہ خرچ ہوا۔ پالکی دروازے پر موجود ہے تم جاکر یہ اشرفیاں ان کو دے آؤ۔ یہ کہہ کر اشرفیوں کی بھری تھیلی مجھے دی۔ میں جاکر وہ خالہ کو دے آئی۔ انہوں نے ساری عمر اتنی اشرفیاں خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ نہال نہال ہوگئیں۔ اور ہمارے گھر کا سارا افلاس ساری عمر کو دور ہو گیا۔

اس مزے سے انہوں نے یہ کہانی کہی کہ ہم سب لڑکیاں دنگ رہ گئیں۔

قطعات

راما بھگوان داس بھگوان

اردو زباں سے عناد کب تک یہاں چلے گی — کچھ سوچیے کہ آخر نفرت کہاں جیے گی
قومی زباں ہے اردو ، قومی زباں ہے اردو — ہم تو یہی کہیں گے جب تک زباں چلے گی

- - - -

مایۂ نازشِ ملت ہے وقارِ اردو — ہے بہارِ چمنِ علم بہارِ اردو
کیوں نہ بھگوان ہو اردو نے معلیٰ پہ فدا — جب کہ تھے قائد اعظم بھی نثارِ اردو

- - - -

اردو زباں سے محکم کردار قوم کا ہے — اردو زباں سے اعلیٰ معیار قوم کا ہے
بھگوان کا یہ فتویٰ ہر شخص کو سنا دو — اردو زباں کا دشمن غدار قوم کا ہے

- - - -

برصغیر کی اک قومی زباں ہے اردو — مہذب سنسکرت کا اعلیٰ نشاں ہے اردو
ہندو کی ترجماں ہے ، مسلم کی ترجماں ہے — سب جس کے ترجماں ہیں وہ ترجماں ہے اردو

-

کیا فصاحت کی جان ہے اردو — کیسی شیریں زبان ہے اردو
کیوں نہ بھگوان کو وہ پیاری ہو — علم و حکمت کی جان ہے اردو

- - -

انگلش کا دور کب تک ، دل کی گرہ تو کھولو — میزانِ عقل میں ہم اپنے عمل کو تولو
ملت کے رہنماؤ ! ملت کے ترجمانو ! — قومی اسمبلی میں قومی زبان بولو

شعبۂ لغت

اردو اور دوسری زبانوں کا اردو املا میں صحیح تلفظ

ڈاکٹر محمد شہید اللہ

ڈاکٹر شہید اللہ صاحب جو سنسکرت اور لسانیات کے ماہر ہیں تقریباً ڈیڑھ سال اس بورڈ سے منسلک رہے۔ اس کے بعد ڈھاکہ واپس چلے گئے

انہوں نے غیر زبانوں کے اردو املا کا ایک سرسری ضابطہ تجویز کیا تھا۔ اس سے پہلے اردو الفاظ کو رومن میں لکھنے کا ضابطہ مرتب کر کے شائع کیا جا چکا تھا۔ ملاحظہ ہو اردو نامہ شمارہ ۳۔ شمارہ ۷، میں ایک مراسلے کے جواب میں عرض کیا گیا تھا کہ دوسرا ضابطہ بھی شائع کر دیا جائے گا، مگر چونکہ وہ بہت سرسری تھا اور اس میں بہت کچھ ترمیم و تکمیل کی گنجائش تھی اس لیے افسوس ہے کہ اب تک شائع نہ ہو سکا۔ بعض ناظرین کے اصرار پر اسے درج کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں بورڈ کا منظور کردہ ضابطہ بھی عام اطلاع کے لیے شائع کیا جائے گا۔

ادارہ

اردو ایک عالمگیر زبان ہے ۔ یہ بالکل مسلم ہے ۔ لیکن جو اہل زبان نہیں ہیں ان کے لیے صحیح طور پر اردو پڑھنا مشکل ہے ۔ مثلاً دور اور دور — املا میں تو ایک ہیں لیکن تلفظ میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے ۔ اسی طرح میں اور میں ۔ کبھی ضرورت پڑتی ہے کہ انگریزی وغیرہ اجنبی زبان کے الفاظ اردو میں لکھے جائیں ۔ میں ماہران اردو کے لیے ایک تجویز پیش کرتا ہوں ، اس امید سے کہ وہ اپنی بیش قیمت رائے سے مجھے مستفید فرمائیں ۔

(۱) لفظوں کے درمیان جہاں نون غنہ ہے وہاں نون پر الٹا جزم استعمال کیا جائے ۔ جیسے چاند ۔ پانچ وغیرہ ۔ اگر آخر میں نون غنہ ہو تو ں بغیر نقطے کے استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے میں (واحد متکلم) یا لڑکوں وغیرہ ۔

(۲) واو اور یا جہاں مجہول تلفظ ہے وہاں پیس اور زیر استعمال نہ کیے جائیں جیسے جو ۔ چور ۔ شور ۔ زیر ۔ سیب ۔ دیر * ۔ لفظوں کے آخر میں مجہول یا کے لیے بڑی " ے " استعمال ہو گی اور معروف کے لیے چھوٹی " ی " جیسے کے کی دے دی ۔

(۳) واو اور یا کا جہاں معروف تلفظ ہے وہاں الٹا پیش اور کھڑا زیر واو اور یا کے ساتھ استعمال کیے جائیں ۔ جیسے مجبور ۔ رام پور ۔ پھر ۔ کھیر ۔ چین ۔

(۴) دن ۔ دل وغیرہ الفاظ میں زیر استعمال کیا جائے ۔ جیسے دن ۔ دل ۔

(۵) دکھ ۔ سکھ ۔ وغیرہ الفاظ میں پیس استعمال کیا جائے ۔ جیسے دکھ ۔ سکھ ۔

(۶) اجنبی الفاظ میں جیسا کہ men pen میں e کے تلفظ کے لیے ی مع زیر استعمال کی جائے جیسے مین پن ۔

(۷) lord, hot وغیرہ اجنبی الفاظ میں o کے تلفظ کے لیے " وْ " استعمال کیا جائے : ہوْٹ ۔ لوْرڈ ۔

(۸) all, call وغیرہ اجنبی الفاظ میں a کے تلفظ کے لیے " ا " استعمال کیا جائے : کاْل ۔ اْل ۔

(۹) نو ۔ سو وغیرہ الفاظ واو بالجزم کے ساتھ نوْ سوْ لکھے جائیں ۔

(۱۰) مثلا مینا وغیرہ الفاظ یائے بالجزم مثلا مینا جیسے لکھے جائیں ۔

(۱۱) اجنبی الفاظ cat. men وغیرہ میں a کے تلفظ کے لیے یا کے پیشتر کے حرف پر زبر دیا جائے ۔ جیسے مین ۔ کیٹ ۔

(۱۲) جہاں اجنبی الفاظ میں پہلا حرف ساکن ہوتا ہے وہاں جزم کی علامت لگائی جائے ۔ جیسے سْکول (school) سْنو (snow) ۔ بْرج (bridge) ۔

(۱۳) سنسکرت زبان میں نون کی مثل ایک حرف ہے ۔ ण اور یہ تلفظ پشتو اور سندھی زبانوں میں بھی ہے ۔ اس کے لیے " ڼ " استعمال کیا جائے (یعنی ن کے پیٹ میں ط) جیسا کہ گنیش ۔ نارائن ۔

---

* یہاں اشتباہ قائم رہے گا لہذا واضح علامت ہونی چاہیے مثلاً و پر خط ، یا ضمہ کو واو کی آواز مجہول کے لیے اور الٹے پیش کو واو معروف کے لیے استعمال کیا جائے ۔ (ادارہ)

(۱۴) سنسکرت زبان میں पुरुष वेष وغیرہ الفاظ میں سن پر ط ''س ،، استعمال کیا جائے ۔ جیسے پرس ۔ ویس ۔

(۱۵) سنسکرت میں ऋण ऋषि وغیرہ الفاظ میں جو پہلا حرف ہے اس کے لیے اردو میں ''ر،، استعمال کیا جائے جیسا کہ رِشی ۔ رِن ۔

(۱٦) سنسکرت میں प्रकाश प्राप وغیرہ الفاظ درشن درپ جیسے لکھے جائیں ۔

(۱۷) سنسکرت زبان میں क्रिया प्रि وغیرہ کریا اور پر جیسے لکھے جائیں ۔

(۱۸) اجنبی زبان کے (so-only.) وغیرہ الفاظ سو ۔ اونلی جیسے لکھے جائیں ۔

(۱۹) کی ۔ بن وغیرہ الفاظ میں زیر استعمال نہ کیا جائے ۔

(۲۰) انگریزی حرف ، ن ملفوظ لفظ کے آخر میں و سے کیا جائے جیسے (Love) لوو (Do) دوو ۔

(۲۱) سنسکرت کے '' انسوار ،، اور ''وسرگ ،، کے لیے ں اور ہ پر جزم دیا جائے جیسے سنہہ ۔ دہکنہ ۔

اردو لغت کی مجمل اشاعت

اردو لغت کے اجزا جو ''اردو نامے،، کے ساتھ ساتھ قسط وار چھپتے ہیں

چار آنے فی جزو کی شرح سے خرید کیے جاسکتے ہیں ۔

سابقہ اجزا میں اب صرف جزو نمبر ۹ تا ۲۴

بہت محدود تعداد میں باقی ہیں ۔

مینیجر

مراسلات

مکرمی ۔ تسلیم

آپ کی عظیم الشان لغت کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں :

۱۔ میرے پیش نظر اردو نامے کا شمارہ ۸ ہے جس میں لغت کی قسط اول چھپی ہے اس کا عنوان ہے 'مختصر جلی نسخہ'۔ اس کے پیش لفظ میں آپ نے لکھا ہے کہ "موجودہ مختصر ایڈیشن میں قدیم دکھنی زبان کی مثالوں کو خارج کر دیا گیا ہے ۔ اور دوسرے ادوار کی مثالوں میں بھی بہت سی تخفیف کر دی گئی ہے تاکہ اس مختصر نسخے کی ضخامت مناسب حدود میں رہے"۔ اس سے پہلے آپ نے ترقی اردو بورڈ کی زیر نگرانی "عظیم الشان تاریخی لغت" کا ذکر کیا ہے ۔ کیا آپ دو لغات مرتب کر رہے ہیں ۔ ایک مختصر دوسری مفصل ۔ میرے پاس اردو نامے کے ابتدائی شمارے نہیں اس لیے میں صحیح صورت حال سے واقف نہیں ۔ اردو نامے میں جو قسطیں چھپ رہی ہیں مجھے تو وہ عظیم اور مفصل معلوم ہوتی ہیں ۔ ایسی لغت کو مختصر کسی طرح نہیں کہا جاسکتا ۔ اور اگر یہ مختصر ہے اور آپ کے پاس اس سے زیادہ مواد موجود ہے تو پھر اسے کیوں نہیں شامل کرتے ۔ ایسی تاریخی اہمیت کی لغت روز روز تو مرتب ہوا نہیں کرتی ۔

۲۔ اردو زبان کی حدود واضح نہیں ۔ ہر زبان میں دخیل اور مستعار الفاظ ہوتے ہیں ۔ مرتب لغت کو مشکل پیش آتی ہے کہ کن الفاظ کو اس زبان کی لغت میں جگہ دے اور کسے نہ دے ۔ زبان کا ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لیے میں دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ بھی اپنے حصار میں داخل کر لیے جاتے ہیں جو ہر طرح بدرنگ ہیں ۔ ناگری پرچارنی سبھا کے ہندی شبد ساگر میں اردو کے تقریباً تمام الفاظ پر ہاتھ صاف کر لیا گیا ہے ۔ اثاث البیت ، اثاثہ ، آویزہ ، عائد ، آموختہ ، آراستہ ، آسودہ ، استعداد ، اخفائے واردات ، اخلاص ، ازالۂ حیثیت عرفی ، ابہام ، اتمام ، انفکاک ، درگزر جیسے الفاظ کو ہندی کا مال بنا لیا گیا ہے ۔ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی کثرت ہے ۔ اردو کے لغت نویس کے سامنے یہ مسئلہ بڑی کٹھن شکل میں آتا ہے کہ عربی فارسی اور انگریزی وغیرہ کے کن الفاظ کو قبول کرے اور کن کو مسترد ۔ ظاہر ہے کہ اردو ، عربی ، فارسی سے علیحدہ زبان ہے ۔ اردو کی لغتوں میں عربی فارسی کے بعض وہ دقیق اور اجنبی الفاظ شامل ہوتے ہیں جو اردو میں کبھی استعمال نہیں ہوتے ۔ مجھے کوئی شافی اصول سجھائی نہیں دیتا جو اردو اور عربی ، فارسی کے الفاظ کے بیچ خط فاصل کھینچ سکے ۔ شاہ عالم کی داستان عجائب القصص میں قوبضے ، قندز جیسے

عربی الفاظ ہیں ۔ غالب کے ابتدائی کلام میں انتعاش ، جستن ، نسستن ، رستن جیسے الفاظ ملتے ہیں اگر یہ اردو ہیں تو عربی فارسی کا کون سا لفظ اردو نہیں ۔

یہی کیفیت انگریزی الفاظ کی ہے ۔ اکبر الہ آبادی کا مصرع ہے : دل ہے یا پاکٹ کے اندر واچ ہے ۔ ایک اور شعر یاد داشت سے لکھتا ہوں :

ان کے دست ناز میں ہے ٹی پاٹ   اب کہاں باقی ہے ہم میں پانٹی

کیا واچ ، ٹی Tea اور پانٹی Piety جیسے الفاظ کو اردو لغات میں رکھا جائے ۔ اگر نہیں ، تو قباحت یہ ہوتی ہے کہ غالب یا اکبر کے کلام کو پڑھنے والا ان الفاظ کے معنی کے لیے آپ کی لغت سے رجوع کرے گا تو اس کو مایوسی ہوگی جو پسندیدہ صورت حال نہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی لغت پورے اردو ادب کو سمجھنے کے لیے کافی ہو ۔ آخر آپ تمام قابل ذکر ادبی کتابوں کو کھنگال کر ان کے تمام الفاظ لغت میں داخل کر رہے ہیں ۔ میرے نزدیک قندز اور پانٹی اردو کے الفاظ نہیں ، لیکن انہیں اردو لغت میں درج کرنا چاہیے کیونکہ یہ اردو کی ادبی کتابوں میں آچکے ہیں ۔ اس طرح ایک اصول یہ ہوا کہ اردو کے قابل ذکر ادیبوں نے جو بھی لفظ استعمال کیا ہے وہ خواہ کسی زبان کا ہو اسے لغت میں جگہ دی جائے گی ۔ ہاں کبھی کبھی کوئی مزاح نگار یا ناول و افسانہ نگار انگریزی کے پورے فقرے جو لکھ جاتا ہے انہیں لغت میں شامل نہیں کیا جائے گا ۔ آپ نے انتخاب و ترک الفاظ کا کیا اصول قائم کیا ہے براہ کرم واضح کیجیے ۔

۳ - تیسرا مسئلہ تلفظ الفاظ کا ہے ۔ انشا نے بڑا اچھا اصول بنا دیا تھا " کہ دوسری زبانوں کا لفظ اردو میں اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال پر منحصر ہے کیونکہ جو اردو کے خلاف ہے خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو ۔ " چند الفاظ کا تلفظ ملاحظہ ہو :

اصل زبان کی رو سے	اردو میں مروجہ تلفظ
موسِم	مَوسَم
نَقص	نُقص
سُوال	سَوال
عِلاوہ	عَلاوہ
سمندر (دال ساکن)	سمندر (ن ساکن دال مفتوح)
منٹ (ن مکسور)	منٹ (ن مفتوح)
سنیما (س مکسور ن مفتوح)	سنیما (س مفتوح ن مکسور)

انگریزی الفاظ کا اردو تلفظ مختلف ہوسکتا ہے، لیکن عربی فارسی کے مندرجہ' الفاظ کے اردو تلفظ کے بارے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہر پڑھا لکھا دوسرے کالم کا تلفظ بولتا ہے ؛ لیکن ہر لغت میں اصل زبان کا تلفظ دیا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اردو زبان بالغ اور جوان ہوچکی ہے اسے عربی فارسی کے غلبے سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے۔ اردو کی لغت میں اردو کا تلفظ دیجیے اصل زبان کا نہیں۔ موسم ، سوال ، علاوہ اور نقص کے اردو میں رائج تلفظ کو واحد صحیح تلفظ کے طور پر دیجیے۔ جس طرح اردو کی لغات نے سمندر کو قبول کرلیا ہے اور سمندر نہیں دیا جاتا اسی طرح عربی فارسی الفاظ کے معاملے میں بھی یہی مسلک ہونا چاہیے کہ اردو میں موسم بالفتح میں صحیح ہے اور بالکسر غلط۔ اس ضمن میں آپ کا فیصلہ جاننا چاہتا ہوں۔

۸۔ امید کرتا ہوں یہ لغت دکن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام کتابوں کے اجنبی الفاظ کو خصوصی طور پر شامل کرے گی تاکہ اردو ادب کی حد تک جامع ہوجائے۔

براہ کرم مندرجہ' مسائل پر اس سرامیے کے ساتھ روشنی ڈالئیے۔

مخلص　　　　گیان چند

(جواب کے لیے ملاحظہ ہو معالد اداریہ)

محترمی۔ تسلیم۔

محترم وارث سرہندی صاحب نے " اردو نامہ " شمارہ ۲۸ کے صفحہ ۱۱۲ پر جو " تاج اللغات " سے (مراد " جامع اللغات " ہوگا ، کیونکہ " تاج اللغات " تو بہت چھوٹی سی لغت ہے) چند الفاظ کی نشان دہی کی ہے کہ آپ کی " اردو لغت " میں جگہ نہیں پاسکے ، تو معاً مجھے خیال آیا کہ آخر وہ کون سی حدود ہیں جن کو مد نظر رکھ کر آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ کوئی ایک لفظ " اردو لغت " میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ مؤلف " جامع اللغات والسنہ متعلقہ " کے مطابق تو ھندوانہ اردو کے الفاظ بھی اردو ہی کہلائیں گے۔ مثلاً آج بھارت کے اردو جریدوں میں جو ادق ھندی الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں، یا جو متحدہ ھند و پاک کے وقت ھندوؤں کے اردو اخبارات میں ملتے تھے، وہ یقیناً ایک اعلیٰ پایے کی اردو لغت کے لغتی اندراج میں شمولیت کا ہر طرح سے حق رکھتے ہیں۔ اس وقت بھی آپ اردو کے ھندو ادیبوں کی کتابوں میں سے ایسے ادق الفاظ کو چن کر ان کی تحریروں کو عملاً بطور سند پیش کر رہے ہیں جو کہ مسلم ادیبوں کی تحریروں میں شاید کبھی بھی راہ نہ پاسکیں۔

البتہ ممکن ہے کہ ایک دوسرا مکتبۂ خیال ہو جو کہ بقول ڈاکٹر جانسن (جیسا کہ ڈاکٹر ڈنککن فاربز نے اپنی ہندوستانی ڈکشنری کے دیباچے میں نقل کیا ہے) اردو کو کئی معنوں میں Vulgar تسلیم کرتا ہو اور اس طرح اردو لغت میں مستر الفاظ کو Vocables کی حیثیت دینے سے گریز کرتا ہو۔

یہ کہنا بھی صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا کہ لغت میں صرف وہی الفاظ درج کیے جاسکتے ہیں جن کے استعمال کی کوئی نہ کوئی سند آپ کے حسب منشا اردو کی تعریف کے مطابق مل سکے۔ حسب منشا اس لیے کہ آپ شاید یہ کہہ کر اس لفظ یا محاورے کو مسترد کردیں کہ آزادی سے پہلے اردو میں اس کا استعمال نہ تھا، کیوں کہ اس وقت آپ پاکستان کے کسی خطے کو بھی ایسا نہیں تسلیم کرسکتے جہاں کے بولنے والوں کی مادری زبان اردو ہو۔ آخر معیار آپ کا اس وقت کیا ہوگا؟ (وہی جو سید احمد نے فرہنگ آصفیہ کے سر ورق پر سطر لکھا ہے) آپ اپنی "اردو لغت" کی ہی مثال لے لیجیے۔ اس میں اسناد نہ دینے کے اصولوں کا خاکہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے:

(۱) جب لفظ کسی دوسری لغت سے نقل کیا گیا ہو، مثلاً:

احنہ (نوراللغات)۔ احوان (فرہنگ آصفیہ)۔ ابدج (اصطلاحات پیشہ وراں)

اثاں (اصطلاحات پیشہ وراں)۔ اجوب (۱) پلیٹس۔ اجوب (۲) (پلٹس)۔

احکا (معنی نمبر ۲ اسراللغات)۔ ادارا (معنی VI ۱۹ (۱) ,(۱۱) بہ حوالہ فیلن)

(۲) جس لفظ کا قواعدی رسمہ بنادیا گیا ہو، مثلاً:

ابنیہ (جمع بناء)۔ ابلانا (مصدر وضعی "ابلا" سے)۔

(۳) جہاں کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کا بگاڑ ہو، مثلاً:

ابو (معنی نمبر ۲ ابو کا بگاڑ)۔ ابدا ابد (ابدا ابداً کا بگاڑ)۔

(۴)۔ جو بول چال کا لفظ ہو۔ مثلاً:

اٹ (بول چال)۔ اٹ پٹنگی (بول چال)۔ اٹک (معنی نمبر ۳ بول چال)۔

(۵) اگر کسی دوسرے لفظ کی طرف رجوع کرنے کا نشان دیا گیا ہو، مثلاً:

اٹ پٹانگ (رک: اوٹ پٹانگ)۔

(۶) جو الفاظ بطور سابقہ یا "حرف" استعمال ہوں؛ مثلاً:

ابن (معنی نمبر ۲)۔ اپ (حرف)۔

(۷) ۔ بعض جگہوں پر تو سند کی بجائے محض مثال (م :) یا " جیسے " سے کام لیا گیا ہے ، مثلاً :

اٹ (معنی نمبر۳ م :) اٹاو (معنی نمبر۱ تا نمبر ۳ م :) ابو (معنی نمبر ۱ م :) ۔
ان (معنی نمبر۲ جیسے) ۔

(۸) ۔ کچھ مقامات پر سند ویسے ہی غائب ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی تلاش جاری ہو یا محمل اندیشں میں یوں ہی چھوڑ دئے گئے ہوں ۔ مثلاً :

اپاڑ ۔ اپساس ۔ اپھاگی (معنی نمبر۲) ۔ اتارا (معنی ۷۱ ۱۷ ۱۸۰) ۔

مندرجۂ بالا مواقع پر اسناد کو قطعی نہ رکھنے کا اصول السہ نہیں ہے کیونکہ لغت جابجا ایسے دیگر الفاظ میں بھی اسناد سے بھری پڑی ہے ۔

بہرحال محولہ‌بالا فاربز کی ڈکشنری کا پہلا صفحہ ہی دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ نے " اردو لغت " میں الفاظ ابک (بمع ابکی اور ابکنا) ، ابتک (ابتلک ، ابلگ ، ابدری ، ابنوڑی) درج نہیں کیے ۔ یا مثلاً "جامع اللغات " سے بے شمار الفاظ چھوڑدئے گئے ہیں ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ نے فاربز کی ڈکشنری یا جامع اللغات مد نظر نہ رکھی ہو ۔ غرضکہ اسناد نہ ملنے پر الفاظ کو لغتی اندراج میں نہ لینا آپ کا اصول نہیں ہے ۔ اس لیے اگر یہ وضاحت ہوجائے کہ اردو لغت میں لغتی اندراج کی حدود کیا ہیں تو شاید ذہن میں صحیح تصویر آسکے ۔ میرا مقصد اس سے یہ نہیں کہ آج کل کی ریڈیو اردو کی بحث میں اس بات کو محدود کردیا جائے ۔ البتہ کسی لفظ کے اردو میں مستعمل نہ ہونے کی حدود متعین ہوجانی چاہئیں ، مثلاً ابصار (جمع بصر بمعنی دانائی) کو کوئی اگر اپنی کتاب کے نام " تحفۃالابصار " میں استعمال کرے تو یہ لفظ " ابصار " اردو کی لغت میں کیوں نہ شامل ہو ؟ اسی طرح خالص ہندی الفاظ " جو اردو میں مستعمل نہیں ، کی کیا تعریف کروگے ؟ مقامی کہاوتوں کو "مقامی" کا لیبل دے کر لغت میں کیوں نہ درج کیا جائے ؟ ترکیبی معنی دینے والے مشہور الفاظ ، مثلاً ابن آدم ، اہلی روزگار ، وغیرہ کیوں چھوڑے جائیں ؟ آج کل کی اردو میں ترجمہ شدہ اصطلاحات ، جن کا عام رواج بھی درسی کتب میں آگیا ہے ، یا خود "اردو نامے " میں استعمال ہوتی ہیں ، ان کے اندراج کے متعلق بورڈ کا کیا فیصلہ ہے ؟

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مقامات پر اشتقاق یا کم از کم اصل زبان کا حوالہ

نہیں دیا گیا ۔ مثلاً الفاظ ابو ، ابا ، اپل وغیرہ میں ۔ ہوسکتا ہے کہ مجمل ایڈیشن میں عام اشتقاق شامل نہیں کیے گئے کا اصول کارفرما ہو یا اختصار کے خیال سے بعض لفظوں کا اشتقاق حذف کردیا گیا ہو ۔

ڈاکٹر فاربز نے لفظ اتارنا کو دو دفعہ دکھایا ہے ۔ ایک کا اشتقاق تو وہی ہے جو آپ کے دیئے ہوئے معنی نمبر ، یعنی باقی رکھنا ، جمع کرنا کے لیے موزوں ہے ، مگر معنی نمبر ۲ یعنی چھڑانا کے لیے فاربز نے ایرادہ راست سنسکرت کا کوئی لفظ سمجھا ہے ۔ ہوسکتا ہے یہ لفظ ورت سے تعلق رکھتا ہو ۔ امید ہے فاربز وصاحب فرماسکیں ۔

اسی شمارے کے صفحہ ۱۱۱ پر آپ نے " ہاؤ بیر " کے لفظ سے متعلق محترم وارث سرہندی صاحب سے استفسار کیا ہے ۔ امید ہے کہ انہوں نے کچھ جواب دیا ہوگا ۔ بہر حال اپنی بساط کے مطابق میں کچھ عرض کرتی ہوں :

اپل ، بیر ملا ، کاک ساری ، ہاؤ بیر (ہو بیر) وغیرہ سب ایک ہی پھل کے نام ہیں ۔ اپل کسی درخت کا نام نہیں ہے ۔ البتہ جس جھاڑی کو یہ پھل لگتا ہے اس کا نام باما ، پیتھر ، بپھیری ، لور ، لسر ، لنگسور ، دھوب ، وسر ، وغیرہ مختلف مقامات پر بولا جاتا ہے ۔ آپ کی دی ہوئی سند بھی ظاہر کر رہی ہے کہ اپل بطور دوائی ایک قسم کا بیر ہے نہ کہ اس بیری کا درخت ۔ یہ مانا کہ اکثر پھل اور درخت دونوں کا ایک نام بھی ہوتا ہے ، مگر اس مثال میں ایسا نہیں ۔ مزید برآں آپ نے جو " کلاں " اور " خورد " اس درخت کی دو قسمیں لکھی ہیں ۔ ان میں کلاں قسم تو واقعی مندرجہ بالا جھاڑی کی ہے جس کو ہاؤ بیر کا پھل لگتا ہے ، مگر خورد قسم شاید آپ نے " چھوٹا لور " لے لیا ہے ، جو کہ بالکل علحدہ جنس Andromeda سے تعلق رکھتا ہے ۔ یا شاید آپ نے Anamirta Cocculus تو نہیں سمجھ لیا ؟ امید ہے آپ کتاب بحرالجواہر سے اپنی تسلی کرلیں گے ، اور علم نباتات (Botany) کی کوئی کتاب آپ کو اس پر روشنی ڈال سکتی ہے ، خصوصاً پنجاب پبلک لائبریری کے شمار نمبر Nihei کے تحت آنے والی کتابیں ۔

والسلام

ایس خانم ۔ مولوی فاضل

راولپنڈی ۔ ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۶۸ ع

بکرمی تسلیم

اردو نامہ کے تیسویں نمبر میں ڈاکٹر گیان چند کا ایک مضمون اردو عروض اور لفظ کا اجزائی حل شائع ہوا ہے ۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کا ایک مضمون اگست ۱۹۵۱ ع میں رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا ۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس مضمون کو پیش نظر رکھتے تو مضمون کی نوعیت دوسری ہوتی ۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا تھا کہ اردو عروض ہندی عروض پر مبنی ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کے مضمون پر کچھ گذارشات پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں ۔ انگریزی اصطلاحات کے مترادفات نامناسب ہیں ۔ ان میں پر الفاظ یہ ہیں :

ہجائے بلند : Long Syllable ہجائے کوتاہ Short Syllable ہجا : Syllable شدت Stress ۔ مگر قواعد کی اصطلاح میں شدت و رخوت حروف کی صفات ہیں ۔ یعنی ا ج د ک ق ط ب ت حروف شدیدہ ہیں اور باقی حروف رخوہ ہیں ۔ بل کا لفظ کچھ مناسب نہیں ہے ۔ کیونکہ استعمال دھمی ثوری نہیں ہے ۔ مگر اردو عروض میں اس اصطلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔

ہندی حروف متحرک بالقوہ ہیں ، اور اردو حروف ساکن ہیں ۔ لہذا اردو میں مصوتہ کا اضافہ کیا جاتا ہے ۔ ہندی کا ہر حرف لگھو کہلاتا ہے اگر لگھو کی حرکت کو طویل کر دیا جائے یا دوسرا لگھو ساکن کرکے اس کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس کو گرو کہتے ہیں ۔ عروض اردو میں ہجائے کوتاہ کو لفظ کا مستقل جزو نہیں سمجھا جاتا البتہ دو ہجائے کوتاہ یکے بعد دیگرے آئیں یا ہجائے کوتاہ کے مصوتے کو اتنا کھینچا جائے کہ اس کا اظہار کتابت میں حرف علت سے کیا جائے یا دوسرا حرف اس کے ساتھ ملا کر بولا جائے اس کو سبب کہتے ہیں ۔ سہ حرفی کلمہ یا جزو کلمہ وتد کہلاتا ہے چار حرفی کلمہ یا جزو کلمہ بشرطیکہ پہلے تینوں حروف متحرک ہوں فاصلہ کہلاتا ہے ۔

اردو کلمات میں شدت یا بل کا وجود نہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ بل کا احساس اہل زبان کو شعوری نہیں ہوتا مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ جس چیز کا شعوری احساس نہیں ہے وہ ہے بھی یا نہیں ۔ انگریزی زبان میں Accent یا Stress ہے ۔ اس کا شعور خود اہل زبان کو ہے ۔ انگریز تو ہم کو یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ انگریزی الفاظ میں ابتدا بالسکون ممکن ہے ، حالانکہ ابتدا بالسکون محال ہے ۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے الفاظ کے ابتدا میں حروف لکھے جاتے ہیں مگر بولے نہیں جاتے مثلاً Pseudonym, Psychology, Knife, Know Phthisis, Psalm وغیرہ ۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ایک عجیب بات کہی ہے کہ 'چشم ما'، اور 'عشق' میں ، میم متحرک ہے اور قاف ساکن ہیں، اور وزن میں کوئی فرق نہیں یہ امر تو ڈاکٹر صاحب سے مخفی نہ ہوگا کہ ساکن بعد ساکن متحرک کے حکم میں ہوتا ہے لہذا دونوں مساوی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے جن مصرعوں کی تقطیع کی ہے وہ بھی قواعد عروض سے ہم آہنگ نہیں :

۱ - بنی لکسمی دکھ کی رانی ، فعولن فعولن فعولن صحیح ہے۔ اور اگر 'کی' میں اشباع کیا جائے تو فعولن فعولن فعلن فع ہوگا۔

فعل فاعلن فعلن فعلن غلط ہے کیوں کہ صدر و ابتدا میں حذف کی اجازت نہیں ہے، اور نہ رکن مخلع کی اجازت ہے۔ متدارک اور متقارب کے اوزان میں جو التباس ہوتا ہے اس کے جانچنے کا معیار بحر مرحوم نے بہت اچھا مقرر کیا ہے یعنی جو رکن متحرک پر ختم ہوتا ہے اس کا مابعد متحرک سے شروع ہوگا اور جو ساکن پر ختم ہوتا ہے اس کا مابعد ساکن سے شروع ہوگا یعنی رباعی کے متعلق جو مشہور ہے :

وتد از پئے وتد است و سبب از پے سبب ست

اس کا اطلاق ان بحور پر بھی کیا ہے :

ہماری کہانی باقی ہے ، فعولن فعولن فعلن فع ہے۔ یعنی یہ بحر متقارب ہے۔ تیسرا رکن اثلم اور چوتھا ابتر ہے :

۲ - پھلے خوب گل بدنی نبری ،　　فعولن فعول فعولن فع
تمہارا شباب دمکتا ہے ،　　فعولن فعول فعولن فع

ان میں دوسرا رکن مقبوض اور چوتھا ابتر ہے - بحر متقارب ہے۔

۳ - یے ضرر نہیں روش دنیا ، ناموزوں ہے۔
اضطراب آج مجھے کیوں ہے ، ایضاً

(۴) جگ جگ سے اس دکھی دیس میں - فعلن فعلن فعولن فعل
دیوانہ آگیا ہے کہاں　　فعلن فعول فعلن فعل یا فعلن فعلن مفعولن فعل

ہر دو صورت میں ناموزوں ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی تقطیع میں تیسرا رکن مخلع ہے۔ ان اوزان میں یہ التزام نہیں ہے کہ وتد کے بعد وتد آئے اس لیے یہ اوزان خلاف عروض ہیں ۔

(۵) بھور گئی اب شام آگئی، ناموزوں ہے، وزن فاع فعولن فاع فاعلن ہے۔
بھور بھئی ہے صبح کی دلھن، فاع فعولن فاع فعولن

پہلا اور تیسرا رکن اثرم ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے دلھن کی ھا کو مخلوط پڑھا ہے۔

(۶) وہ میرے دیس میں آیا ۔ فاعلن فاعن فعلن تیسرا رکن مخبون مسکن ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض مصرعوں کو رواں اور بعض کو عکس ثابت کیا ہے۔ اگر مصرعوں میں موزونیت کے باوجود روانی نہیں ہے تو اس کی وجہ متنافر کلمات ہو سکتی ہے، اس سے الفاظ کی شدت و رخوت ظاہر نہیں ہوتی ۔ چونکہ فعلن فاعلن اور فعولن دونوں کی فرع ہے اس لیے ایک بحر میں دوسرا وزن شامل ہوجاتا ہے ۔ اس کی تفصیل راقم‌الحروف نے اپنے مضمون میں کردی ہے اور چونکہ یہ وزن ھندی کے ھیں اس لیے ھندی نام بھی دے دئے ھیں ۔

قواعد عروض میں بعض امور کی اجازت ہے صرف ان کو جائز قرار دینے کے لیے بعض اساتذہ نے اشعار لکھے ھیں ، مگر رواج نہ ھونے کی وجہ سے گوارا نہیں ھیں۔ مثلاً حکیم ضامن علی جلال لکھنوی فرماتے ھیں :

خدا سلامت رکھے میوں کی ٹھوکر کو نہیں جگاتی ہے سوتے ہوئے مقدر کو

"سلامت رکھے" میں مسکن اوسط کانوں کو ناگوار ہے۔

اسی طرح مرحوم اور کو ر وزن فع میں لکھنے تھے اس لیے مندرجہ ذیل شعر کے دوسرے مصرع میں روانی نہیں ہے۔

نہ خوب لاش پہ آ کر گناھگار کیا کہ آپ تو ہوئے پیدل ہمیں سوار کیا

دوسرا مصرع اس طرح پڑھا جائے تو رواں ھوجاتا ہے۔

کہ پیدل آپ ہوئے اور ھمیں سوار کیا

ھندی کی تقلید میں متقارب اور متدارک مضاعف الارکان بھی مستعمل ھیں۔ اس کی تفصیل میرے مضمون میں ملاحظہ ھو اور اگر ضرورت ہوئی تو اردو نامے میں اس کا اعادہ کردیا جائے گا۔

کراچی غضنفر امروھوی

مکرمی ۔ السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے ۔ نیا " اردو نامہ ،، ملا ۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں ۔ لغت کے صفحوں میں اضافے پر اصرار تو یقیناً تضیع اوقات ہوگا (بلکہ یوں کہنا چاہیے "ہمیں اپنی اوقات معلوم ہے ۔،،)

بورڈ کی شائع کی ہوئی بیں نئی کتابوں کا اشتہار دیکھا ۔ ان کتابوں پر اگر تبصرہ مقصود ہو تو میں حاضر ہوں ۔ میرا تو کام یہی ہے ۔ اس بہانے یہ کتابیں پڑھنے کا موقع بھی مل جائے گا ۔

میں محمد فیض بخش کی کتاب " تاریخ فرح بخش ،، کا انگریزی ترجمہ پڑھ رہا تھا کہ اس میں ایک جگہ یہ جملہ اور نوٹ نظر آیا :

> " I returned each time walking with fifteen thousand Kundah and rikabi rupees laden in my Palankeen .. " P 208 Vol II

اس پر انگریز مترجم W. Hoey نے یہ حاشیہ لکھا ہے :

> Two kinds of rupees then current in Oudh, so called from the designs on them. Kundah کونڈہ is a large shallow dish used as a 'feeding trough' and rikabi is a plate. Compare the use of Jhar Shahi, Katar Shahi, etc., names of particular coins, from their devices, tree, dagger, etc.

غالباً رکابی مذہب سے بھی مراد یہی ہے کہ جدھر روپیہ دیکھا اسی طرف ہوگئے ۔ محض کھانا پینا مراد نہیں ۔

اس بار قسط میں احساس کمتری یا برتری کی تعریف بہت الجھی ہوئی ہے ۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ترجمہ غلط ہے ۔ احساس کو Complex کے معنی میں استعمال کرنا خلط مبحث ہے ۔ بہر کیف یہ غلط العام ہے ۔

احساس برتری ضروری نہیں کہ " دوسرے سے بالا تر ہونے کی بنا پر پیدا ہو ۔ ،، یہ مصنوعی بھی ہوسکتا ہے ۔ درحقیقت ان دونوں کمپلکسوں کی شدت ایک طرح کا ذہنی مرض ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ مریض فی الواقع دوسروں سے بہتر یا کمتر ہو ، بلکہ اس کا خود فریبی کے تحت ایسا سمجھنا کافی ہے ۔

اگر آپ پسند فرمائیں تو نفسیات کی مستند لغات کی مدد سے کوئی جامع اور واضح تعریف مرتب کردی جائے ، کوئی مشکل کام نہیں ۔

لاہور

محمد سلیم الرحمن

محترمی ۔ السلام علیکم

اتفاق سے اردو نامہ شمارہ ۲۹ ، اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء نظر سے گزرا ۔ اردو نعت نگاری کے عنوان کے تحت ممتاز صاحب صفحہ ۲۵ پر سعدی کے ایک شعر کے متعلق رواروی میں لکھ گئے ہیں : " ان کی یہ رباعی نو زندہ جاوید ہے :

بلغ العلی بکمالہ کشف الدجا بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ و آلہ

موصوف نے دو مصرعوں کو چار مصرعوں کی شکل میں لکھا ہے ۔ رباعی کے لیے یہ طرح مخصوص ہے جس کا ہر مصرعہ کا رکن اول مفعول یا مفعولن ہوتا ہے ۔ یہ شعر بحر کامل میں ہے جس کی تقطیع متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن ہے ۔ دوسرے مصرعے کے تیسرے رکن میں سکون اوسط کے اصول پر زحاف مضمر استعمال کرنے سے متفعلن ہوگیا ہے ۔

اردو نامہ ایسے موقر رسالہ میں ایسی غلطی کا ہونا عروض سے ناواقف حضرات کو غلط فہمی میں مبتلا کرسکتا ہے اس لیے اگلے شمارہ میں اس کی اصلاح کردی جائے تو مناسب ہے ۔

سیتاپور ۔ ۲۶ فروری ۶۸ء سید محمد آفاق سیتا پوری

--

مکرمی ۔ تسلیم

مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی (اورنٹیل کالج) لاہور ، فروری سنہ ۱۹۶۹ ع میں غالب کی صد سالہ برسی شایان شان طریقے پر منانے کا اہتمام کررہی ہے ۔ اس سلسلے میں مجلس نے مطبوعات اور تقریبات کا ایک جامع پروگرام وضع کیا ہے ۔ "اشاریہ غالب" (Bibliography) اسی انشا پروگرام کا ایک حصہ ہے ۔

پچھلے سو برس میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے ، یہ کتاب ایک جامع اشاریے (انڈ کی شکل میں اس کا تعارف کرائے گی ۔ مجوزہ اشاریے میں تصانیف غالب کے علاوہ ، غالب پر لکھی ہوئی جزوی و کلی تصانیف اور اخبارات و رسائل میں غالب کی سیرت و شخصیت اور فکر و فن سے تعلق رکھنے والے مقالات و مضامین کے حوالے ابجدی ترتیب سے :

(الف) باعتبار مصنف ۔
(ب) باعتبار موضوع ۔

ضروری صراحتوں کے ساتھ درج ہوں گے ۔ نمونہ یہ ہے :

۱ ۔ شوکت سبزواری ، ڈاکٹر : غالب ۔''فکر و فن،، (مجموعۂ مضامین)
طبع اول : انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی سنہ ۱۹۶۱ ع
سائز : ۱۸ × ۲۲ صفحات ۲۶۴

راقم الحروف نے سجاد باقر رضوی صاحب (نائب معتمد ، مجلس یادگار غالب) کے تعاون سے '' اشاریۂ غالب ،، کا بہت سا کام مکمل کرلیا ہے ۔ اندراجات کی تعداد دو ہزار کے قریب ہوچکی ہے، اور توقع ہے کہ اب بھی بہت سی ایسی چیزیں ہوں گی جن تک مرتبین کی رسائی نہیں ہوئی ۔ ان کی کوشش ہے کہ اشاریہ ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہو اور ''غالبیات ،، پر بنیادی کتاب حوالہ کا کام دے ۔

اس ضمن میں اہل علم سے عموماً اور غالب پر لکھنے والوں سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ نمونۂ بالا کے مطابق غالب سے متعلق مواد کی نشان دہی اور قدیم و جدید اخبارات و رسائل سے مقالات و مضامین کے مندرجات کی فراہمی میں راقم الحروف کی اعانت فرمائیں ۔

سید معین الرحمن
لکچرار اردو ، شعبۂ السنہ
ایف ۔ سی ۔ کالج ، لاہور ، (۱۹)

جانده	۱۔(زاویہ بنانے کا نصف دائرے کی شکل کا پیمانہ)
	۲۔ کھیتوں کی پیمائش کی اکائی کی علامت)
	۳۔(چھپر وغیرہ کا باکھا)
جانا نمر جانا	۱۔(زرباقی میں کام آنے والی کھٹے کی چونچ کی شکل کی ہتوڑی)
	۲۔(ایک قسم کا کنجہ)
	۳۔ گڑ کو الٹنے پلٹنے کا کفچہ)
جیالک	(گلی ڈنڈا)
جانک	۱۔(کھلیان پر ٹپیا لگانے کی کاٹھ کی تھاپی)
	۲۔ وہ حصار جو ورڈ میں کھینچا جاتا ہے)
جاولی	(غلہ پھٹکنے کا چھاج)
چپکنا	(زخم کا ٹیس مارنا)
جبوڑ	(بکواس)
جیٹا	(پھیلے اور بجکے بیندے کا گھڑا)
جبران	(جھٹلانا)
جھڑا	۱۔(دلالی دوسرے)
	۲۔(صاف میدان)
جیڑ خندی	(بازاری عورت)
جیک	(موسیقی، ایک تال کا نام)
جن	(چینی، ہانڈی وغیرہ کی)
جبنا	۱۔(خجل ہونا)
	۲۔(خاموش ہونا)
	۳۔(پامال و برباد ہونا)
جیوٹا	(جانٹا، دھپ)
جیوٹی	(کھنیا ٹوپی جیسے: پاؤں میں جوتی نہ سرپر جبوٹی)
جب	(جتون، نظر، نیور)

جبا بند	(ھند) چاول یا دودھ کا بندا یا بڑا لڈو جو دریا برد کرنے کے لیے ارتھی پر رکھتے ہیں)
جبر	(سر کے جھوٹے بال)
جتی	۱۔(جنی، لال چڑیا کی مادہ)
	۲۔ ایک قسم کی کوڑی جس پر سیاہ دھبے ہوئے ہیں)
جہا بنانا	(فضیحت کرنا)
جبوڑنا	(جاک جاب کرنا)
جبا	۱۔(کمان یا غلیل کا غلاف)
	۲۔(بہتان، الزام)
جٹ پٹ	(کم قیمت دوائیں)

استقاق درکار ہے

جیاج	(بے قراری)
جر جٹا	۱۔(ایک قسم کی گھاس، چر چرا)
	۲۔(اونگا، خار دار گوبہ)
جرجرا	(ایک قسم کی گھاس، اونگا خاردار گونہ)
جلا	(ڈھول کے نکلنے پر رستم کے بار کی آہٹ)
جلچل	(ابرق، ابرک)
چلکا دودی	(درخت کی ایک قسم)
جوباندا	(شکر کے اجزا جو راب سے نتھرنے کے بعد باقی رہیں)
جونبر	(کشتی پر کھویے کے بیٹھنے کی جگہ)
جھاج	(مٹھا)
چپلی	(ڈھیکلی کا بہیا، ڈھیکلی)
جھور	۱۔(کونا، کنارہ)
	۲۔(آر)
	۳۔(کنارہ، ساحل)

ترقی اردو بورڈ کی تازہ مطبوعہ کتاب

جدید ترکی اردو لغت

ڈاکٹر محمد صابر ایم ۔اے۔ پی ایچ ڈی (استنبول یونیورسٹی) لیکچرار تاریخ اسلام و ترکی ادب کراچی یونیورسٹی نے ترقی اردو بورڈ، کراچی کے تعاون سے حال ہی میں "جدید ترکی اردو لغت" کو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ لغت جو متعدد پاکستانی و ترکی ماہرین لسانیات کے باہمی مشورے کے بعد منظر عام پر آئی ہے، نہ صرف عہد حاضر کے ملکی و بین الاقوامی ادبی و ثقافتی تقاضوں کو بجا طور پر پورا کرتی ہے بلکہ اس کا مطالعہ ترکی زبان و ادب کے علما، اور عام اہل ذوق حضرات کے واسطے بھی نہایت مفید اور کارآمد ہو گا۔

مرتب موصوف نے اس لغت میں تقریباً بیس ہزار الفاظ اور محاورات کے علاوہ علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور دیگر فنی و حربی اصطلاحات اورضرب‌الامثال کا بیش بہا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اس لغت کا مقدمہ مؤلف بجائے خود ایک جامع اور معلوماتی مقالہ ہے جس میں ترکی زبان کی بنیاد، شجرۂ نسب، زبان ترکی پر عربی و فارسی کے اثرات، خالص ترکی زبان کی تطہیر، قدیم و جدید عربی ترکی خطوط (رسم‌الخط) کے بعد لاطینی رسم‌الخط کا نفاذ، صوتیاتی نظام اور پاک و ہند کی مختلف زبانوں بالخصوص اردو اور بنگلہ ادب میں ترکی الفاظ کی شمولیت پر بڑے دلچسپ اور معلوماتی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ بلا شبہ جدید ترکی اردو لغت ہمارے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

۷۶۰ صفحات (۸ × ۲۲ × ۱۸) کاغذ سفید عمدہ ٹائپ کی طباعت مجلد سرورق رنگیں ۔

قیمت ۳۳ روپے فی جلد علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ : ترقی اردو بورڈ، جمشید روڈ نیو ٹاؤن کراچی یا
کراچی یونیورسٹی بک شاپ کراچی سے طلب فرمائیں ۔



آج انعامی بانڈ خریدیئے



کل بیش قیمت انعام حاصل کیجئے

انعامی بانڈوں پر آپ کو نقد انعام حاصل کرنے کے بہت سے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

دس روپے والے انعامی بانڈ کی ہر قرعہ اندازی میں آپ کو انعام حاصل کرنے کے ۱۲۰ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔
آپ ہر سلسلے میں ۲۵ ہزار روپے سے لے کر سو روپے تک کے انعام حاصل کر سکتے ہیں۔
پانچ روپے والے انعامی بانڈ پر پہلا انعام دس ہزار روپے۔ دوسرا انعام تین ہزار روپے
تیسرا انعام دو ہزار روپے اور ایک ایک ہزار روپے کے ۲۵ انعام ، ہر سلسلے پر
ہر قرعہ اندازی میں علیحدہ علیحدہ دیئے جاتے ہیں۔
قرعہ اندازی ہر مہینے ہوتی ہے۔ ایک مہینے دس روپے والے بانڈوں کی دوسرے مہینے پانچ روپے والے بانڈوں کی۔

اگلی قرعہ اندازی کے لئے اپنے بانڈ ابھی سے خرید لیجئے۔

انعامی بانڈ

ترقی کے ایک اور نئے دور کے لئے

بچت

تمام منظور شدہ بینکوں اور ڈاک خانوں سے دستیاب ہیں۔
جاری کردہ۔ سنٹرل ڈائریکٹریٹ آف نیشنل سیونگز، اسلام آباد

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ کی لاثانی شرح منافع

۱۰۰ ۱۸۰

۱۰۰ روپے کے بدلے ۱۰ سال میں ۱۸۰ روپے حاصل کیجئے

یہ سرٹیفکیٹ آپ کے روپے پر ۸ فیصد سالانہ منافع مہیا کرتے ہیں۔
۵ برس کے بعد منافع ۶ فیصد سالانہ اور مزید ۵ برس کے بعد دو فیصد زائد بونس ... گویا
دس برس میں آپ کے ایک سو روپے ۱۸۰ روپے کی خطیر رقم بن جاتے ہیں۔
اصل رقم اور منافع دونوں پر انکم ٹیکس معاف ۔ زیادہ سے زیادہ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیئے۔
اور پاکستان کی خوشحالی و استحکام میں عملی تعاون کیجئے۔
ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ ۵ روپے، ۱۰ روپے، ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے، ۱۰۰۰ روپے،
۵۰۰۰ روپے کی مالیت کے ہوتے ہیں اور اسٹیٹ بینک کے علاوہ شیڈولڈ بینکوں اور ڈاکخانوں
سے مل سکتے ہیں۔

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

۸٪

ہم خرما و ہم ثواب

جاری کردہ سنٹرل ڈائریکٹریٹ
آف نیشنل سیونگز۔ اسلام آباد

PRESTIGE DFP.100/80


گرمی دانوں سے
یقینی نجات!
TIBET
Prickly heat
POWDER
ANTISEPTIC
DEODORANT
پرکلی ہیٹ پاؤڈر
گرم مرطوب موسم میں تبت پرکلی ہیٹ پاؤڈر کے استعمال سے اپنی جلد کو سوزش اور خارش سے محفوظ رکھیئے - اس پاؤڈر میں ایسے جراثیم کش اجزا شامل کئے گئے ہیں جو جلد کو ٹھنڈک پہنچا کر فوری سکون بخشتے ہیں - اسکی لطیف خوشبو سے جسم مہک جاتا ہے اور آپ دن بھر ترو تازہ رہتے ہیں -
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھاکہ



یہ
آپ کے فرائض
میں سے تو نہیں۔
لیکن
صفائی
نصفِ ایمان ہے
اس کا تو سبھی کو خیال رکھنا چاہیئے
تاکہ آپ تندرست رہ سکیں
بیماریوں سے محفوظ رہیں
اور پاکیزگی آپ کا شعار بن جائے۔
پاک سرزمین کو پاک صاف رکھیئے
DFP.


زیادہ سے زیادہ
انعامی بانڈ
سے بچت
محفوظ بچت اور نقد انعام
آم کے آم گٹھلیوں کے دام
دس روپے کے ہر بانڈ کی ہر قرعہ اندازی میں آپ کو انعام حاصل کرنے کے ۱۲۰ مواقع حاصل ہوتے ہیں
آپ ہر سلسلے میں ۲۵ ہزار روپے سے لیکر سو روپے تک کے انعام حاصل کر سکتے ہیں۔
پانچ روپے کے بانڈ پر پہلا انعام دس ہزار روپے، دوسرا انعام تین ہزار روپے، تیسرا انعام دو ہزار روپے
ایک ایک ہزار روپے کے ۳۵ انعام، ہر سلسلے پر ہر قرعہ اندازی میں
علیحدہ علیحدہ دیے جاتے ہیں۔ انعامی بانڈوں پر قرعہ اندازی ہر مہینے ہوتی ہے۔
ایک مہینے دس روپے کے بانڈوں کی اور دوسرے مہینے پانچ روپے کے بانڈوں کی
اپنے بانڈ وقت پر خرید لیجئے تاکہ اگلی قرعہ اندازی میں انعام حاصل کر سکیں۔
انعامی بانڈ
وطن کی ترقی اور حفاظت کے لئے
بچت
جاری کردہ سینٹرل ڈائریکٹریٹ آف نیشنل سیونگز، اسلام آباد

مدرسہ صنعت و حرفت کے استادوں نے احصا
کرنے والی جو مشین ایجاد کی ہے اس کے ذریعے وہ
ایک گھنٹے میں جواب حاصل کرسکتا ہے۔
۱۹۲۳　آدمی اور مشین ، ۱۰

سیاروں کی حرکت کے سلسلے میں ایک نئی
شاخ ایجاد ہوئی ہے جو احصا کہلاتی ہے۔
۱۹۰۲　داستان ریاضی ، ۲۸

[ع : احصا ، مصدر (ح ص ی) بروزن اِفعال -
شمار کرنا]

اَحصائی : اسم کیفیت -

اس ھی کی طرف تمام منسوب
احصائی میں اس کی سب ھیں منسوب
۱۸۵۳　جامع المظاہر منتخب الجواہر ، ۲

[ع : احصا (رک : احصا) + ا + ی
(لاحقہ نسبت) جو اردو دانوں نے بڑھایا اور
عربی میں نا درست ہے]

اِحصار (کس نیز ا ، سک ح) امذ -

۱ - **(خارجی یا ذہنی) حد بندی میں منحصر یا محدود و محصور کرنے کا عمل یا کیفیت ، حصر کرنا -**

تناسبات کی مختلف صورتیں ہیں اور ان صور کا
احصار استقرائی اصول کے تابع ہے -
۱۹۰۸　اساس الاخلاق ، ۳۱۱

۲ - **(فقہ) وہ رکاوٹ جس کی وجہ سے عازم حج یا محرم سفر ملتوی کردے - جیسے مرض یا دشمن وغیرہ -**

جب احصار اس کا مٹ جائے اور ممکن ہو . . .
حج کا ادا نہ ہو جاوے -
۱۸۹۷　نور الہدایہ ، ۸ ، ۲۳۶

[ع : مصدر (ح ص ر) از باب افعال - روکنا
سفر سے]

اِحصان (کس نیز ا ، سک ح) امذ -

۱ - **کنوارا ، مجرد اور غیر شادی شدہ ہونے کی کیفیت ، پاک دامنی (عموماً عورت کے لیے مستعمل) -**

آیت میں اس کی حد کو احصان پر موقوف کیا ،
جو احصان اس کے حد مارنے کی شرط واسطے ذکر
نہیں کیا -
۱۸۶۰　فیض الکریم ، ۵۰۵

یہاں مباح کرنا احصان کی شرط پر موقوف تھا ،
پر جب احصان نہ پایا جاوے گا تو اباحت بھی
نہ رہے گی -
۱۸۶۶　تہذیب الایمان : ترجمہ ، ۳۰۷

۲ - **شادی بیاہ کا عمل ، بیاہا جانا ، شادی کرنا -**

نہ کافر ہوگا ہرگز بعد ایمان
نہ زانی ہوگا ہرگز بعد احصان
۱۸۵۵　ریاض المسلمین ، ۹۷

۳ - **وہ مرد یا عورت مسلم ، بالغ ، آزاد جو بصورت ارتکاب زنا مستحق درخواست سزا ہو ، برائیوں (بدکاریوں) سے نگہداشت**

(اردو قانونی ڈکشنری ، ۱۷) -

[ع : مصدر (ح ص ن) از باب اِفعال - شادی
کرنا ، شادی شدہ ہونا]

احضار (کس خف ا ، سک ح) امذ ۔

۱ ۔ **حاضر یا موجود کرنے یا کیے جانے کا عمل ، حاضر کرنا یا کیا جانا ۔**

روشن ضمیر نے واسطے احضار شہزادے کے اشارہ کیا ۔

۱۸۰۲ بہار دانش ، ۳۶

اپنا عزم مصمم کرکے بہ احضار لشکر حکم دیا ۔

۱۸۵۱ عجائب القصص : ترجمہ ، ۲ : ۱۸

یہ سن کر سلیمان نے حکم احضار فرمایا ۔

۱۸۷۷ عجائب المخلوقات : ترجمہ ، ۲۸۹

۲ ۔ **حاضری ، موجودگی ۔**

حضور ایسی تدبیر فرمائیں کہ میں ذات احضار سے بچوں ۔

۱۸۷۳ فسانۂ معقول ، ۱۶۳

عدم احضار کی کوئی وجہ معقول نہ ظاہر کی جائے ۔

۱۸۹۸ مجموعہ ضابطہ فوجداری ، ۳۶

[ع : مصدر (ح ض ر) از باب اِفعال حاضر کرنا]

احضاری : صف جو موجود ہو ، موجود ۔

[illegible] کے لمحوں میں واقع ہوتے ہیں ۔ [illegible] احضاری [illegible] سے منضبط ہوتے ہیں ۔

۱۹۳۵ تاریخ تمدن [illegible] ، ۱ : ۹۰

[ع : احضار + ی (لاحقۂ نسبت)]

احظاظ (کس خف ا ، سک ح) امذ ۔

۱ ۔ **متلذذ ہونے کی کیفیت ، لذت یابی ، التذاذ ، لطف اندوزی ۔**

تفریحوں پر جان دینے والا شخص احظاظ نفس کی ایک خاص صورت پر وارفتہ نہیں ہوتا ۔

۱۹۲۲ گوشۂ عافیت ، ۱ : ۱۵۸

۲ ۔ **مزہ ، حظ ، لذت ۔**

ان صورتوں میں محض کسی رجحان یا قیاس کی زیادہ حد ہی مخصوص ہوتی ہے ، جو حہ گونگی کے ذریعے احظاظ حاصل کرنا چاہتی ہے ۔

۱۸۹۵ فرنیالوجی ، ۱۳۵

[ع : مصدر (ح ظ ظ) از باب اِفعال = خیر و فضل یا نصیب والا ہونا]

احفاد (فت خف ا ، سک ح) امذ ۔ ج ۔

۱ ۔ **نواسے ، ذریات (مع خویشان و اصہار) ۔**

اولاد احفاد تمامی اپنے کو جمع کیا ۔

۱۸۵۱ عجائب القصص : ترجمہ ، ۲ : ۶۰

میرا سارا قافلہ پریشان ہوگیا ، اولاد و احفاد کہیں ، اسباب کہیں ۔

۱۸۹۹ مکاتیب امیر مینائی ، ۱۰

ان کی اولاد و احفاد کو ان کی مد [illegible] میں شریک ہونا پڑا ۔

۱۹۱۰ معرکۂ مذہب و [illegible]

[illegible] کی اولاد و احفاد اور [illegible] مع اہل ہنود کو ہے ۔

۱۹۱۵ حکومت [illegible]

۲ ۔ **انصار ، مددگار (اصحاب) ، [illegible] مددگار و [illegible]**

کرتی ہے یہ ایک بات جو ہے ظاہر و اظہر
اولاد مقدم ہے اور احفاد موخر
۱۸۹۳　سجاد راتبہ نوری، ق، ۱

[ع: حافد (ح ف د) کی جمع بروزن افعال
پوتا، اولاد و اصہار]

اِحفاظ (کسر حف ا، سک ح) امذ۔

حفاظت۔ نگہبانی، پاسداری۔

اخلاقی مجموعے کی بڑی یا اعلیٰ غرض احفاظ
حقوق ہی ہے۔
۱۹۰۸　اساس الاخلاق، ۲۰۳

[ع: ... (ح ف ظ) بر وزن اِفعال = غصہ دلانا
(ثلاثی مجرد "حفظ" کے معنی میں اِفعال
کے وزن پر اردو میں مستعمل، عربی میں
نا درست)]

اَحفَظ (فت ا، سک ح، فت ف)، صف۔

زیادہ یاد رکھنے والا، جس کا حافظہ زیادہ قوی اور مستحکم ہو، جو سہو و نسیان کا عادی نہ ہو۔

بحث و تفتیش کی، تا پہچانا احفظ و اضبط
کو مرتبے میں۔
۱۸۵۱　عجائب القصص: ترجمہ، ۲: ۲۵۱

ان سب (راویوں) میں ابو سفیان ثوری احفظ ہے۔
۱۸۶۰　فیض الکریم، ۵۵۳

[ع: اسم تفضیل (ح ف ظ) بر وزن افعل = بہت
بیدار چشم]

اَحَقّ (فت ا، ح) صف۔

۱۔ زیادہ حق دار، بہت مستحق۔

مراتب نہ سمجھے کیا غصب حق
احق تھے وہی پیس رب الفلق
۱۸۳۰　معارج الفضائل، ۲۳۱

آپ ہمارے نزدیک احق اور اقدم ہیں۔
۱۸۵۱　عجائب القصص: ترجمہ، ۲: ۵۹۹

امیر عبدالرحمٰن اموی صاحب اندلس نے کہا،
میں احق ہوں۔
۱۸۸۲　مطالع المدهور، ۳۰

حضرت علی احق و اولیٰ بالخلافت تھے۔
۱۹۰۶　الحقوق و الفرائض، ۳: ۴۵

۲۔ زیادہ حق، درست اور صحیح۔

علم تصوف احق و اسبق اور اشرف علوم ہے۔
۱۸۱۹　فغان بے خبر، ۲۳۶

متحرک، ... کا ... ہے تو وقف یا
سکون کریں، اور یہی وقف احق و اصل
وقف ہے۔
؟　ہدیۃ التوحید، ۲۳

[ع: احقّ، اسم تفضیل (ح ق ق) بر وزن
افعل = مستحق تر]

--- **خضبۃ الارض** (شد ق بضم، کس خ،
سک ض، فت ب، کس ت، غیر ملفوظ ا،
سک ل، فت ا، سک ر) امذ۔

**(طبعیات) وہ دائرہ جو خط استوا کے مرکز کو دائرۃ
آسیا کی طرح محیط ہے۔**

اس دائرہ کو دائرۂ احق خسبہ (خصبہ) الارض کہتے ہیں ۔

۱۸۰۸ رسالہ کائنات جو (خلیل خان اشک)، ۴۷

[ع : احقّ + (رفع) + خصبہ (سرسبزی) + (اصا) + ال (ات) + ارض (رک)]

احقاب (ف ا ، سک ح) امذ ۔ ج ۔

بہت سے سال ، مدت طویل (گذشتہ) ۔

جمع ہے احقاب، حقبہ کی یہاں
یعنی ایام و زمان یکراں

۱۷۸۰ تفسیر مرتضوی ، ۵۱

[ع : حقب (ضم ح ، سک ق) کی جمع بر وزن افعال = اسّی سال یا اس سے زیادہ]

احقاق (کس خف ا ، سک ح) امذ ۔

۱ ۔ دلائل اور براہین سے ثابت کرنے کا عمل ، ثبوت دینا ، اثبات ۔

احقاق باطل اور ابطال حق ہمارا شعار نہیں ۔

۱۸۹۲ خدائی فوجدار ، ۱ : ۱۰۰

مناظرہ ... احقاق حق سے عبارت ہے ۔

۱۸۹۹ مکاتیب امیر ، ۲۳۳

اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں ، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے ۔

۱۹۳۷ مکاتیب اقبال ، ۱ : ۲۹۸

احقاق حق اور ازہاق باطل ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے ۔

۱۹۴۳ حیات شبلی ، ۲۵

۲ ۔ کسی کا حق قائم کرنا ، حقدار کے حق کو تسلیم کرنا ۔

احقاق حق اور فریاد رسیِ عباد، عدل و انصاف، افضل عبادت ہے ۔

۱۸۴۶ تذکرۂ اہل دہلی ، ۵۹

[ع : مصدر (ح ق ق) بر وزن افعال = حق کہنا]

احقر (مت خف ا ، سک ح ، فت ق)

(الف) صف ۔

۱ ۔ (i) پست درجے والا ، نہایت حقیر ، ذلیل ترین ۔

نہ ولی بندہ ہے ترا کم تر
بلکہ ہر کمتران میں احقر

۱۷۰۷ ولی ، ضمیمہ کلیات ، ۴۲

شاعری سے نہ طلب کیجیے نہ فوقیت
خلق کی نظروں میں کردیں ہیں جو احقر اشعار

۱۷۸۰ سودا ، ک ، ۱ : ۳۲۰

بحق آل احمد ہو دعا مقبول بندے کی
نہ عبد اللہ بھی یارب ترا اک عبد احقر ہے

۱۹۲۸ مرقع لیلٰی مجنوں ، ۱۲

(ii) چھوٹا ، نہایت چھوٹا ، بے حقیقت ۔

اک لکہ فضائے آسمان پر
ہو لاکھ حقیر بلکہ احقر

۱۹۱۰ جذبات نادر ، ۳۰۵

(ب) امذ ۔

۲ ۔ خاکسار، ناچیز، راقم الحروف یا متکلم (ضمیر واحد متکلم یا نام کی جگہ بطور انکسار اپنے لیے مستعمل) ۔

محسن اس احقر کے تھے وہ سید عالی مقام
داغ جن کا ہے دلوں پر خود نہ گلزار جہاں
۱۸۰۳ اخلاق ہندی، ۲۹۶

دل لیبے میں کوئی نہیں دلبر سے زیادہ
اور دینے میں رنہار اس احقر سے زیادہ
۱۹۰۹ صنعت، ک، ۲۰۷

پس یہ احقر اس کا جواب خود لکھتا ہے۔
۱۸۸۰ ماسٹر رام چندر، ۶۸

تیرہ سو بارہ ہجری میں اسی قدر کا احقر نے احاطہ بنوایا۔
۱۹۰۵ یادگار دہلی، ۱۰۵

مجھلے انوار کو احقر کا جارا شغف میدان میں اترا تھا۔
۱۹۵۳ اپنی موج میں، ۲۳

[ع: اسم تفضیل (ح ق ر) بر وزن افعل = مقابلۂ حقیر]

ــــ الافراد / الانام / العباد (ضم ر، غیر ملفوظ ا، سک، ل، فت ا، سک، ف / غیر ملفوظ ا، سک ل، فت ا / غیر ملفوظ ا، سک ل، کس ع) امذ۔

رک: احقر (ب) ۲۔

سید الحبیب، احقر العباد، نور جمال عفی عنہ۔
نوائے جہاد ۱۸۵۷، الظفر دہلی،
۱۸۵۷ از جنگ آزادی، ۵۶۸

اہتمام ... احقر الافراد ... سے ایج دارالسلطنت لکھنو کے، کشمیری محلے میں چھاپی گئی۔

بحر حکمت، ۵۸ (منقول از اردو نامہ،
۱۷۹۸ ۳۸:۳)

گمنام، ناکام، نظام احقر الانام مدعا طراز ہے۔
۱۸۷۳ عقل و شعور، ۳

عرضی گزار شاہ ہے یہ احقر العباد
آئیں نہ اس طرف کو امام فلک نہاد
۱۹۱۲ سمیم، ق، ۹۱

[ع: احقر + ُ (رفع) ال (بع) + افراد/انام/عباد (رک)]

اِحکاک
(کس خف ا، سک ح) امذ (شاذ)۔

دو چیزوں کو ایک دوسری سے ملا کر گھسنا، رگڑنا۔

احکاک ... سے لذت تمام کبھی حاصل نہیں ہوتی۔
۱۸۳۵ مجمع الفنون: ترجمہ، ۱۵۳

[ع: مصدر (ح ک ک) بروزن اِفعال = کھجلانا]

اَحکام
(فت خف ا، سک ح) امذ۔

(الف) جمع۔

۱۔ (i) **حکام یا بزرگوں کی تقریری یا تحریری ہدایتیں جن میں کسی کام کا کرنا یا نہ کرنا لازم یا مستحسن قرار دیا گیا ہو۔**

احکام بجا سب اس کے لانا
اسرار سے اس کے فیض پانا
۱۷۷۱ ہشت بہشت، ۷۰

در محوطۂ لاالہ الا اللہ
رسول کا ولد عم و حاکم احکام
۱۸۱۸ انشا، ک، ۲۶

میرے مولا کے ہیں سب احکام قرآن و حدیث
راے حق رائے نبی ہے عین رائے بوتراب
۱۸۰۳　　مظہر عشق، ۵۱

یہ قانون مرتب ہوتا ہے ان احکام سے جو کہ
ایسے گروہ پر حکومت کرنے والوں نے جاری کیے
ہیں۔
۱۸۷۶　　شرح قانون شہادت، ۱

رجسٹر تعمیل احکام و مراسلات، نقشہ تقسیم
اوقات۔
۱۸۸۹　　دستور العمل مدرسین، ۶

دربار خلافت کے احکام کی طرف جلد توجہ کریں۔
۱۹۱۰　　فلپانا، ۱۹

فکر حساب روز جزا بر محل کرو
احکام بر حسن کے بارو عمل کرو
۱۹۱۲　　سمبیم، ق، ۵

احکام جاری ہوچکے ہیں کہ جتنی فوج ...
درکار ہو، لے۔

(ii) وہ کام جن کے متعلق برابروالوں یا چھوٹوں کی طرف سے اصرار ہو (بیشتر طنزیہ)، فرمائشیں۔

۱۹۲۳　　راج دلاری، ۱۵۲

اب ہم صرف اس مرض کی دوا ہیں کہ ان
کے احکام کی تعمیل کریں۔
۱۹۱۹　　جوہر قدامت، ۱۶۸

۲۔ ضابطے، قاعدے، قوانین۔

بعش گاہ جہاں خوش ہو خرمی نے آج
کیے بدل بمباحث مناہی کے احکام
۱۷۸۰　　سودا، ک، ۱: ۲۹۹

وہ احکام ... سیاست ملکی اور انتظام مدنی
سے متعلق ہیں۔
۱۸۷۰　　خطبات احمدیہ، ۳۴۸

۳۔(دینیات) اعمال و عبادات سے متعلق ہدایات جن کے بجا لانے یا نہ بجا لانے کا ثواب ہے، دینی اوامر یا نواہی۔

حسب احکام ساسنر کے رسم ... قابل پابندی
تصور کی گئی ہے۔
۱۸۷۶　　شرح قانون شہادت، ۵۷

نماز کے ارکان و احکام سکھائے۔
۱۸۸۰　　تذکرۂ غوثیہ، ۵۶

انبیاے سابق کی شریعت میں جن احکام کو
خدا چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔
۱۸۹۸　　سرسید، مضامین، ۲۵

خدا وہ احکام جو امن کے قائم رکھنے کے لیے
ضروری اور مناسب ہوتے تھے پیغمبروں پر نازل
کرتا تھا۔
۱۹۰۶　　الحقوق و الفرائض، ۱: ۳

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند
۱۹۳۶　　ضرب کلیم، ۶۲

قانون الٰہی کے منشا اور احکام کے خلاف جہاں ایک برائی بھی نظر آئے ، معاً ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے زور بازو سے اس کو مٹانے کی کوشش کرے۔

۱۹۵۸ ابوالکلام ، مضامین ، ۱۰

۴ ۔ مستقبل کے واقعات و حالات کی پیشگوئیاں جو حسب ذیل وجوہ پر مبنی ہوں۔

(i) نجوم ، رمل یا جفر وغیرہ کے مفروضہ قاعدوں سے استخراج۔

رمال نجومی جفری جو غیبوں کے احکام دیے تابے جہاں نے سارے ازر پھینکے تختوں پر قرعے

۱۸۳۰ نظیر ، ک ، ۵۳۴

نجومیوں نے زائچہ کھینچا اور احکام صادر کیے۔

۱۹۰۸ انتخاب فتنہ ، ۲۱۵

انہوں نے ان کے چند احکام متعلق بہ علم نجوم لکھ کر بھیج دیے ہیں۔

۱۹۱۳ حالی ، مکاتیب ، ۱۹

میرے نکالے ہوئے اکثر احکام ایسے مطابق واقعہ ثابت ہوئے کہ حیرت ہوتی تھی۔

۱۹۳۷ واقعات اظفری ، ترجمہ ، ۹

(ii) خوابوں کی تعبیر کے علم کی بنا پر (تعبیرات و تفسیرات)۔

خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔

۱۹۱۰ آزاد ، مقدمہ دیوان ذوق ، ۲۲

(iii) بنا بر تجربہ آثار و علامات پر نظر کر کے قیاساً۔

م: حاسدوں نے ان کے احکام کو غلط ثابت کرنا چاہا ، مگر آخر کار ان کے تجربے اور بصیرت کی داد دینا پڑی۔

(iv) اعضا کے حال و خط ، خصوصاً ہاتھوں کی لکیروں کے اثرات کی بنا پر۔

م: پامسٹ نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں ، ان میں سے بیشتر احکام تو اس وقت تک صحیح ہی نکلے ہیں۔

۵ ۔ ستاروں کی گردش کے اثرات و نتائج جو فرد یا جماعت کو پیش آنے والے ہوں (علم نجوم وغیرہ کے قواعد سے معلوم کر کے)۔

یہ دور اور نوبتیں ہیں کہ موافق احکام نجوم کے آدمیوں میں جاری ہیں۔

۱۸۱۰ اخوان الصفا ، ۲۰

رمالوں نے زائچے کھینچے ، احکام روز و شب دیکھے۔

۱۸۹۰ فسانۂ دلفریب ، ۹۸

بانیان طلسم کو احکام نجوم سے یہ حال معلوم ہوا تھا۔

۱۸۹۲ بوستان خیال ، ۹ : ۱۸۷

۶ ۔ (مجازاً) کسی شے کے خصوصیات اور لوازم جو دوسری پر منطبق کیے جائیں۔

پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتب کر دیے۔

۱۸۷۹ مقدمہ حالی ، ۱۰۱

(ب) واحد (متروک)

۷ - حکم، فرمان، ہدایت۔

تب اس نے احکام اس مضمون کا جاری کیا۔

۱۸۵۹ عہد نامہ، ۷ : ۲۱

یاں کاں لگائے ہے کھڑی زینب نا کام
سن لوں گی کلام آپ کا اور بھائی کا احکام

۱۸۷۵ دبیر، دفتر ماتم، ۹ : ۱۹۳

رنڈی نہ کربلا میں کوئی جائے اے بوا
حاکم کا لکھنؤ کے یہ احکام ہو گیا

۱۸۷۹ جان صاحب، د، ۱۱۱

[ع : رک: حکم جس کی یہ جمع بر وزن
أفعال ہے]

- عشرہ کس صف (فت ع، سک ش،
فت ر) امذ۔

دین موسوی کے دس بنیادی قوانین جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس وقت نازل ہوئے جب وہ کوہ طور پر خدا کی ہم کلامی سے مشرف ہوئے تھے۔

موسوی شریعت ہے جس کا لب لباب دس حکم ہیں جو احکام عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔

۱۹۰۲ ترجمہ قرآن (نذیر احمد)، ۷۶

موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر خدا کی ہم کلامی نصیب ہوئی اور احکام عشرہ عطا ہوئے۔

۱۹۲۳ سیرۃ النبی، ۳ : ۳۲۹

[ع : احکام + ف : ِ (اضا) + ع : عشرہ (رک)
مرکب توصیفی]

——کرنا محاورہ (متروک)۔

علم نجوم وغیرہ کے قاعدے سے ستاروں کے اثرات دریافت کرکے نجومی کا مستقبل کی بابت رائے دینا، نیز تجربے کی بنا پر آثار سے یہ بتانا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

ہم تو کہتے ہیں وہ ہوگا جو خدا نے چاہا
وہ بھی سنتے ہیں منجم جو کچھ احکام کریں

۱۸۳۶ آتش، ک، ۲۴۱

——لگانا محاورہ۔

۱- رک: احکام کرنا۔

کوئی شکل فرح کی کسی طرح سے عملاً کے وہم و خیال میں نہ آتی، احکام لگاتے لگاتے حیران و پریشان ہوتے۔

۱۸۹۵ فسانۂ دلفریب، ۱۳

۲- قانون یا اصول و آئین کو کسی پر نافذ کرنا اور اس کے مطابق عمل ہونے کا حکم دینا۔

موذن پر تو بہا ہی زہر کھائے
وہی احکام سب اس پر لگائے

۱۸۶۱ الف لیلہ (منظوم)، ۳ : ۴۷۷

- نجوم کس اضا (ضم ن، و مع) امذ۔

مستقبل میں واقع ہونے والی باتیں جو علم نجوم وغیرہ کے مقرر اصول و قواعد کے ذریعے دریافت کی جائیں۔

داستان طلسم کو احکام نجوم سے یہ حال معلوم ہوا اور کل امور آئندہ دریافت ہوئے ۔

۱۸۹۰ بوستان خیال، ۹ : ۱۸۷

[ع : احکام (رک) + ف : ِ (اضا) + ع : نجوم (رک) مرکب اضافی]

---نکالنا محاورہ

نجوم وغیرہ کے مقرر اصول و قواعد کے ذریعے مستقبل کا حال دریافت کرنا ۔

اسی وقت قرعہ ڈالا اور احکام نکال کر بادشاہ سے عرض کیا ۔

۱۹۰۲ آفتاب شجاعت، ۱ : ۲۰۰

اُحکام (کس خف ا ، سک ح) امذ ۔

(تعمیرات) وہ ستون وغیرہ جو عمارت کے کسی حصے کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لیے بنایا جائے ۔

بالائی احکام ، سہاروں پر کے منفی خماو کے معیار کو برداشت کرسکے ۔

۱۹۳۱ تعمیروں کا نظریہ اور تجویز، ۲ : ۶۵۱

جہاں بنیادی طبقات غیر یقینی تھے ، احکام کا استعمال کامیابی کے ساتھ کیا گیا ۔

۱۹۳۸ رسالۂ رڑکی (چنائی) ، ۱۰۷

[ع : مصدر (ح ک م) از باب افعال = محکم کرنا]

احکامی : صفت ۔

جو عمارت کو محکم اور مضبوط کرنے کی غرض سے ہو ۔

زیادہ احکامی سلاخیں پٹوان لوہے یا نرم فولاد کی ہوا کرتی ہیں ۔

۱۹۰۰ رسالہ تعمیر عمارت، ۳۸

[ع : احکام + ف : ی (لاحقہ نسبت)]

احکامات (فت حف ا ، سک ح) امذ ، ج ۔

رک : احکام جس کی یہ جمع الجمع اردو میں مستعمل ہے ۔

میں نے ... اپنی تمام عمر میرے اور میرے حبیب کے احکامات کی نافرمانی میں گزاری ۔

۱۹۲۵ اودھ پنچ ، ۱۰ : ۲۰ ، ۳۸، ۳۷

احکامیہ (فت خف ا ، سک ح ، کس م ، شدی بفت) صف ۔

جن میں احکام اور فرمان (بیشتر شرع کے) بیان ہوئے ہوں ، حکموں سے متعلق ۔

قرآن مجید کی آیات احکامیہ پر غور کرنے کی ضرورت پڑی ۔

۱۹۱۴ شبلی (مقالات) ، ۱ : ۲۷

[ع : احکام + ی (لاحقہ نسبت) + ہ (لاحقہ تانیث)]

اَحْکَم (فت ا، سک ح، فت ک) صف۔

۱۔ بڑا حاکم یا سب سے بڑا حکمران۔

فاتح ابواب و فتاح فتوح دو جہاں
حاکم واحکم حکیم و اہل حکمت واہ واہ

۱۸۷۳ مناجات ہندی، ۹۸

کب نہ تھا وہ کب خدائے احکم واعدل نہیں
آخر نہیں یا اول اول نہیں

۱۸۷۰ دیوان اسیر، ۳ : ۲۳۷

۲۔ بہت زیادہ مستحکم و مضبوط۔

کوئی مسئلہ اس مسئلے کی حقیقت سے اقوی اور اعلیٰ اور اتم اور احکم نہیں ہے۔

۱۸۸۷ نصوص الحکم : ترجمہ، ۱۰۷

[ع : اسم تفضیل (ح ک م) بروزن افعل]

ـــ الحاکمین (ضم م، غیر ملفوظ ا، سک ل، کس ک، ی مع)

(الف) صف۔

۱۔(i) سب دنیاوی و دینی حاکموں پر حکمران اور ذی اقتدار، جس کا حکم ہر حاکم کے حکم پر فائق اور غالب ہے (خدائے تعالیٰ کے لیے مستعمل)

یہ مانا کہ آقا و حاکم ہو لیکن
کوئی تم پہ بھی احکم الحاکمیں ہے

? اردو گلستان، ۱۷۸

اس زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے ... ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ میں ڈالنا چاہیے۔

۱۸۸۱ مکاتیب سر سید، ۱۶۱

(ii) بہت اچھا یا بہتر جج۔

عرب کا یہ حساب یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ ستر سال والے کو احکم الحاکمین..... کہتے تھے۔

۱۸۹۸ ایام عرب، ۱ : ۳۳۰

(ب) امذ۔

۲۔ باری تعالیٰ، خداوند عالم (وصفی نام کے طور پر مستعمل)

خدا ظاہر باقدرت، و خدا باطن با نور، عجب حکمت احکم الحاکمین۔

۱۵۸۲ جانم (کلمۃ الحقائق)، ۶۰

احکم الحاکمین یہ میری ناچیز قربانی قبول کر۔

۱۹۳۱ سیدہ کا لال، ۱۹۱

[ع : احکم + ــِ (رفع) + ال (تع) + حاکمین (رک : حاکم جس کی یہ جمع ہے) مرکب اضافی]

اَحْلام (فت خف ا، سک ح) امذ۔ ج۔

۱۔ خواب جو سوتے میں نظر آتے ہیں (بیشتر اضغاث کے ساتھ مستعمل)

اضطراب و اختلاط نے دخل کیا ہے... اور اسی کا نام اضغاث احلام ہے۔

۱۸۴۵ احوال الانبیا، ۱ : ۲۹۹

اس حالت میں وہ سب خواب اضغاث احلام ہیں۔

۱۹۱۰ شبلی ، مکاتیب ، ۲ : ۱۲۰

۲ - پریشان خواب جو بیشتر معدے کی خرابی ، فکر یا علالت کے باعث سوتے میں یا نیم بیداری میں نظر آتے ہیں اور ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی ، اضغاث احلام ۔

ایسے خواب احلام کا حکم رکھتے ہیں اور مطلق قابل توجہ نہیں ہوتے ۔

۱۸۹۶ کاشف الحقائق ، ۲ : ۳۰۹

[ع : حلم (ضم ح ، سک ل) (= خواب) کی جمع بر وزن افعال]

اَحلَم (فت خف ا ، سک ح ، فت ل) صف۔

غصے کو بہت ضبط کرنے والا (یا) برد بار (بیشتر ترکیب میں)

ام الخیر نے کہا : اے معاویہ ! تو قریش میں احلم الناس مشہور ہے ۔

۱۹۰۱ مقالات حالی ، ۱ : ۲۵۸

[ع : اسم تفضیل (ح ل م) بر وزن اَفعَل]

اِحلِیل (کس مف ا ، سک ح ، ی مع) امذ۔

۱ - وہ سوراخ جس میں سے پیشاب نکلتا ہے۔

رہزن نطفہ بد خواہ ہو اول ہی قضا
اس کی پشت پدری سے نہ کبھی تا احلیل

۱۸۵۴ ذوق ، د ، ۳۲۱

احلیل میں دوا پہنچا دیں ۔

۱۸۷۲ رسالہ سالوتر ، ۲ : ۸۲

بچہ اس وقت تک آگے کی طرف پیشاب نہ کر سکتا ہو جب تک اس کے احلیل کو اوپر کی طرف نہ اٹھایا جائے ۔

۱۹۳۷ جراحیات زہراوی ، ۱۰۳

۲ - پستان سے دودھ نکلنے کا سوراخ ۔

شدت تشنگی و حدت خور میں جاری ہوئے احلیل نہ ثرسی سے سرشار

۱۸۹۳ سجاد رائے نوری ، ق ، ۱۱

[ع : اسم (ح ل ل) بروزن افعیل = پستان سے دودھ نکلنے کا سوراخ ، (ج : احالیل)]

اَحمال (فت خف ا ، سک ح) امذ۔

سامان یا اسباب کے بوجھ ، گٹھڑیاں ، صندوق وغیرہ (جن میں سامان بار ہو)، ساز و سامان (بیشتر اثقال کے ساتھ مستعمل)

آں حضرت وہاں رونق افروز ہوئے اور احمال و اثقال اپنے ادا کیے ۔

۱۸۵۱ عجائب القصص : ترجمہ ، ۲ : ۶۱۹

لوگ تمام مع احمال و اثقال . . . . بخیر و خوبی پہنچ گئے ۔

۱۸۷۰ خطبات احمدیہ، ۱۸۰

مع عیال و اطفال و احمال و اثقال جزیرۂ مذکور کو روانہ ہوا ۔

۱۸۹۲ فسانۂ معقول ، ۲۱۳

میری چھوٹی بہن کو جو بیرون قلعہ چیلوں کے کوچے میں رہتی ہیں مع احمال و اثقال قلعے میں لوا لاؤ۔

۱۹۱۲		حیات النذیر ، ۳۰

[ع : حِمْل (کس ح ، سک م) کی جمع بروزن اَفعال ۔ بوجھ جسے لادا جائے]

اِحمال (کس خف ا ، سک ح) امذ ۔

لادے جانے والے بوجھ کی برداشت اور سہار۔

بار احساں قابل احمال، ہم عاجزان ناتوان کے، دوش ہمارے پر رکھیے ۔

۱۸۵۰		غزوات حیدری ، ۳۸۰

[ع : مصدر (ح م ل) بروزن افعال ۔ بوجھ اٹھانے میں مدد کرنا]

اَحمد (فت خف ا ، سک ح ، فت م)

(الف) صف ۔

۱ ۔ بہت زیادہ حمد باری تعالیٰ کرنے والا۔

کسی عمل کا یہ رتبہ نہ احترام ہوا
خدا کی حمد سے احمد نبی کا نام ہوا

۱۹۱۲		شمیم ، ریاض شمیم، ۵ : ۱

۲ ۔ بہت زیادہ قابل تعریف ، ستودہ تر۔

ظاہر میں وہ احمد ہے تو باطن میں احد ہے
یہ میم جو اس میں ہے فقط بہر مدد ہے

۱۹۱۲		شمیم، ریاض شمیم، ۳ : ۷

حمد کے لائق خدا ہے نعت کے قابل رسول
حامد ومحمود و احمد جس نے پائے ہیں خطاب

۱۹۱۹		کیف سخن ، ۱۰۴

(ب) امذ ۔

۳ ۔ پیغمبر خدا حضرت محمد صلعم کا لقب (اکثر مجتبیٰ ، مختار یا مرسل و غیرہ کے ساتھ مستعمل)

رکھیے آب میں جس کی آمد مجھے
نہ درپیش ہے نعت احمد مجھے

۱۸۸۰		میر ، ل، ۹۶۰

حکم علی سے مہر کی رجعت ہوئی اسیر
شق القمر جو احمد مختار نے کیا

۱۸۵۴		دیوان اسیر (ریاض مصنف) ، ۳۵

کس منہ سے کیجیے لب جاں بخش کا بیان
چوسی جنھوں نے احمد مختار کی زبان

۱۸۷۴		انیس ، ۱ : ۲

انیس الغریبین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۱۸۸۷		خیابان آفرینش ، ۳

مسجد احمد مرسل میں ہوئے سب حاضر
خاک اس مسجد انور کی ہوئی زیب جباہ

۱۸۹۲		مہتاب داغ ، ۳۰۹

ہمشکل مصطفیٰ سا جو دلبر جدا ہوا
احمد کے اہل بیت میں محشر بپا ہوا

۱۹۱۲		شمیم، ق، ۹

[ع : صفت مشبہ (ح م د) ۔ بہت تعریف کیا گیا]

۔ ثانی کس صف ، امذ ۔

امام حسین کے صاحبزادے حضرت علی اکبر کا لقب جو سراپا حضور کی شبیہ تھے اور کربلا میں اٹھارہ برس کی عمر میں شہید ہوئے۔

ارشاد کیا احمد ثانی نے یہ سب سے
ایسا نہ ہو تم عذر کرو حشر میں رب سے

۱۸۷۵ دبیر، دفتر ماتم، ۲ :

اے احمد ثانی تجھے کیا کہہ کے میں روؤں
ہم شکل رسول دوسرا کہہ کے میں روؤں

۱۹۱۲ سمیم، ف، ۳۳

[ع : احمد + ف : (اضا) + ع : ثانی (رک)]

ـــــــکی پگڑی محمود کے سر

اس موقعے پر مستعمل جب کسی چیز یا بات کی ذمہ‌داری دوسرے کی طرف منسوب کردی جائے، کسی کا چھدا کسی کے سر، کلاہ تقی بر سر نقی۔

دنیا میں کسی مشہور ہر دل عزیز مصنف اور کلام کے واسطے احمد کی پگڑی محمود کے سر کرنے کی بہار دیکھیے۔

۱۹۱۲ معرکہ چکبست و شرر، ۲۷۷

ـــــــکی داڑھی بڑی یا محمود کی کہاوت۔

اس موقعے پر مستعمل جہاں یہ مقصد ہو کہ بے فائدہ بحث و تکرار سے کیا حاصل، کام سے کام ہے۔ حجت سے کیا غرض۔

نجم الامثال، ۲۶، محاورات ہند، نور اللغات ۱ : ۲۸۷)

ـــــــمحمود (ف خف م، سک ح، وسع) امذ۔

بلا امتیاز ادنیٰ یا اعلیٰ و شناسا یا نا شناسا وغیرہ، اپنا یا غیر کسے باشد (بیشتر کوئی یا کسی وغیرہ کے ساتھ مستعمل)۔

احمد محمود کسی کا مال ہو انہیں ہضم کرلینے سے مطلب، احمد محمود کوئی ہو انہیں سب کے آگے ہاتھ پھیلا دینا۔

۱۹۲۳ نور اللغات، ۱ : ۲۸۸

احمدی (فت خف ۱، سک ح، فت م)۔

(الف) صف۔

۱۔ احمد (حضرت رسول کریم) سے منسوب، محمد صلعم سے نسبت رکھنے والا۔

سرا ہر تن بقا یعنی احمدی۔

۱۴۲۱ بندہ نواز، شکار نامہ (از شہباز، فروری ۱۹۶۲)

عیسوی بولے کہ عیسی سور تھے
احمدی بولے کہ احمد نور تھے

۱۷۵۰ ریاض غوثیہ، ۶۶

دوسرا منظر یا تماشا احمدی محمدی ہے کہ راگ تعریف محمد صلعم سے شروع ہوتا ہے۔

۱۸۹۱ کشاف اسرار المشائخ : ترجمہ، ۲۶۳

۲۔ مرزا غلام احمد قادیانی (بانی فرقۂ احمدیہ) کا پیرو، قادیانی مذہب رکھنے والا۔

هر فرقہ خواہ وہ اهل فقہ کا هو اهل حدیث
هو احمدی هو یا قرآنی ۔

۱۹۲۳ احیائے ملت ، ۱۹

قادیان کے احمدیوں میں خانہ جنگی هورهی ہے۔

۱۹۳۷ مکاتیب اقبال ، ۲۰ : ۳۳۶

(ب) امذ ۔

۳ ۔ سونے کا سکہ ضرب ٹیپو سلطان میسور (فرهنگ قانونی ، ولسن ، ۲۰) ، نیز احمد شاہ ابدالی کا سکہ جو دهلی میں رائج تھا (نور اللغات ۱ : ۲۸۸) ۔

[ع : احمد + ی (لاحقہ نسبت)]

اَحمَر (فت خف ا ، سک ح ، فت م) صف ۔

۱ ۔ سرخ ، لال رنگ کا ۔

۱ ہے یک رنگ سب لیکن نرے جگ میں ہے بوقلموں
تو دستانچ کہیں احمر ، کہیں اصفر ، کہیں ارزق

۱۶۷۹ شاہ سلطان ثانی ، د ، ۶۱ (الف)

فی‌الحقیقت گوگرد احمر کو گنوایا ۔

۱۸۰۵ آرائش محفل (افسوس) ، ۲۳۸

اے بدخشاں نبی کے لعل احمر السلام
وے گلستان علی کے لالۂ تر السلام

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۱۳۳۰

تیرے حضور رنگ بدلتا ہے شرم سے
احمر سحر کو شام کو ہے اصفر آفتاب

۱۸۵۴ دیوان اسیر (ریاض مصنف) ، ۹۶

نیلم پکھراج لعل احمر
هیرا مانک عقیق گوهر

۱۸۸۲ مادر هند ، ۹

بتاتی ابیض و اصفر تو ہے آداب دنیا کے
سکھاتی اسود و احمر کو ہے ارکان دیں مسجد

۱۹۳۱ چمنستان ، ۱۳۱

[ع : صفت مشبہ (ح م ر) بروزن اَفعل = جس کا رنگ سرخ هو] ۔

۔۔ قانی کسر صف ۔

گہرا سرخ جو تقریباً سیاهی مائل هو ۔

نہا کر خون میں دشمن کے وہ تیغ اور بھی نکھری
کہ پہلے حصرمی تھا رنگ اب ہے احمر قانی

۱۹۱۶ نظم طباطبائی ، ۳۲

خون اس وقت تک نکالتے رهنا چاهیے جب تک اس کا رنگ احمر قانی ...... یا سیاہ نہ هوجائے ۔

۱۹۳۶ شرح اسباب : ترجمہ ، ۲ : ۲۸۷

[ع : احمر + ف ۔ (صف) + ع : قانی ، اسم فاعل (ق ن و) = گہرے سرخ رنگ والا ، مرکب توصیفی) ۔

اَحمَری (فت خف ا ، سک ح ، فت م) صف ۔

سرخ رنگ رکھنے والا ، سرخ رنگ کا ۔

رہے بیچہ چمن پھولاں احمری
کہ هنستی ہے خوشحال هو دهرتری

۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۵۹

زخموں کے ، جسم پاک بہ گل ھائے احمری
اک ایک شاخ نخل شہادت ھری بھری

۱۹۱۲ نسیم ، ق ، ۱۷

[ع : احمر (رک) + ی : ی (لاحقہ نسبت)]

---یاقوت (و سع) امذ .

سر کے رنگ کے مشابہ سیاھی مائل سرخ یاقوت (رک) جس کی آب رنگ کی تیزی سے دبی ھو ، دوسرے درجے کا یاقوت (فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران ، ۴ : ۹۰)

اَحْمَق (فت ح ، سک ح ، فت م) صف .

۱ . جس میں بات کو سمجھنے کی صلاحیت کم ھو یا نہ ھو ، بیوقوف ، ناسمجھ .

احمقاں ھور احمقاں کی باتاں کا کیا اعتبار .

۱۶۳۶ سب رس ، ۱۱۳

بعضے دوئی احمقاں کہتے ھیں کہ بندہ خدا ھوا .

۱۶۵۹ میراں جی خدا نما ، شرح تمہیدات ، ۶۸

تمن لوگ احمق سراسر کھجے
ھے نادان جیسے دوانے بچے

۱۷۴۴ قصہ منصور حلاج ، ق ، ۱۰۴

میں ایسی احمق ھوگئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا سو میں مان لیتی .

۱۸۰۲ باغ و بہار ، ۵۵

خواھش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ھوں اس بت بیداد گر کو میں

۱۸۶۹ غالب ، د ، ۱۹۰

وہ کون احمق ھوگا جو ان باتوں کو جھوٹ کہہ دے گا .

۱۸۷۴ مجالس النساء ، ۲

احمق عاقل نہیں کہا جا سکتا .

۱۹۱۴ شبلی ، مقالات ، ۱ : ۳۶

۲ . کلمۂ زجروتوبیخ ، مترادف : جاھل ، الو ، گدھا ، پاگل ، نالائق وغیرہ .

کبھو زلف طویل القد کوں اپنے کہ اے احمق
کبھی کون چھوڑ دے تو جو بڑی سب سے کہاتی ھے

۱۷۳۳ آبرو ، د ، ۸۷

ذرا ھی منہ پھوڑنے کو احمق ملا دیا تجھ میں کھوٹ ھم نے
غرور تیرا ھی توڑنے کو جلانے کاغذ کے نوٹ ھم نے

۱۹۱۰ جذبات نادر ، ۲۲۵

[ع : صفت مشبہ (ح م ق) بر وزن اَفْعَل]

---الذی (ضم ق ، غیر ملفوظ الف ، شد ل بفت) صف .

بہت بے وقوف ، بڑا احمق ، حماقت سے بھرا .

یہ آپ کا احمق الذی شہزادہ ھے .

۱۸۲۴ فسانۂ عجائب ، ۹۵

[ع : احمق + ُ (رفع) + الذی (= وہ جو)]

° الذین (ضم ی ، غیر ملفوظ ا ، شدل بفت ، ی مع ، سک ن) صف ۔

احمق الذی (رک) کا مزید علیہ ، بہت زیادہ بے وقوف ۔

ہزار بار سزا پا کے منہ نہ چڑھتے ہیں
مشیر کیا کہوں ان احمق الذین کو

۱۸۷۳ مشیر ، ق ۱۰

[ع : احمق : ° (رفع) + الذین جمع الذی (رک)]

° الناس (ضم ی ، غیر ملفوظ ا ل ، شد ن) صف ۔

بہت بے وقوف ۔

فیض تعلیم سے نمرے ہو جو منکر انسان
احمق الناس اسے جانیے بلکہ نسناس

۱۸۵۳ ذوق ، د ، ۳۲۹

[ع : احمق + ° (رفع) ا ال (مع) + ناس (رک)]

بنانا محاورہ ۔

چالاکی سے کسی کو اپنی نیک نیتی باور کرا کے فریب دینا اور مطلب نکالنا ، گفتگو یا برتاؤ سے کسی کر مسخر کرکے اپنے حق میں وہ کام کرالینا جسے وہ عقل سے کام لینے کی صورت میں ہرگز نہ کرتا ۔

تیز ہوش نے ... نادان کے گریبان میں ہاتھ ڈالا کہ ... مجھے احمق بنانا ہے ۔

۱۸۳۶ بستان حکمت ، ۱۳۵

الٹی خفگی جتاتی ہو تم
احمق مجھے پھر بناتی ہو تم

۱۸۹۰ دفتر سحر ، ۶۵

اس قسم کا آدمی آپ کو خود احمق بنا رہا ہے ۔

۱۹۵۶ مناظر احسن ، عبقات : ترجمہ ، ۱۳

ـــــ بننا محاورہ ۔

رک : احمق بنانا جس کا یہ لازم ہے ۔

اس بے مثال شکل و شمائل کو دیکھ کر
احمق بنے کوئی مہ کامل کو دیکھ کر

۱۸۷۰ دیوان مہر (الماس درخشاں) ، ۹۸

ہم جو پروا نہ کرو گے مطلق
آپ دنیا میں بنو گے احمق

۱۹۱۰ کلام مہر (سورج نارائن) ، ۹۶

ـــــ پن (ـــ پَنا) (فت پ) امـذ ۔

بیوقوفی ، حماقت ، ناسمجھی ، جہالت ۔

فرہنگ آصفیہ ، ۱ : ۹۴

[ع : احمق + ا : پن/پنا (لاحقۂ کیفیت)]

احمقانہ (فت حف ا ، سک ح ، فت م ، ن) صف ۔

جو حماقت پر مبنی یا بیوقوفی کی بنا پر ہو ۔ جاہل اور بیوقوفوں کا سا (کام یا بات)

آپ حکومت کی احمقانہ ... حکمت عملی کے خلاف برطانوی رائے عامہ کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوں گی ۔

۱۹۳۷ مکاتیب اقبال ، ۲ : ۲۹۰

[ع : احمق (رک) + ا : انہ (لاحقۂ نسبت)]

خاور نامہ

مُرتّبہ:

مع مقدمہ:

ترقی اردو بورڈ

URDU DEVELOPMENT BOARD

اردو نامہ

ترقی اردو بورڈ کا باتصویر مجلہ



Price 1/50



جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، بورڈ کے دفتر میں حقی صاحب اور چند مہمانوں کے ساتھ۔

یہ تصویر مولانا حامد حسن قادری مرحوم کی دوسری برسی کے موقع پر لی گئی۔



حقی صاحب ڈاکٹر قریشی صاحب کو لغت
مسودات دکھا رہے ہیں۔

اب تک لغت کی پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں
چھٹی جلد جاری ہے اور باقی جلدوں کے لیے ۹ لا
سے زائد الفاظ و اسناد کا ذخیرہ جمع ہے۔

اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

اردو نامہ

شمارہ ۳۲ - جولائی تا ستمبر ۱۹۶۸ء

نگراں

جناب ممتاز حسن

ادارۂ تحریر

شان الحق حقی

معتمد

نسیم امروہوی

مدیر

خواجہ حمید الدین شاہد

نائب مدیر

مضامین

بیاد زیبا

مراسلات

شعبۂ لغت

سرورق : نواب سراج الدین سائل دہلوی

(ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۳۷)

سید یوسف بخاری پبلشر نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا۔

ترقی اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر ۴۲۱۶۳

زر سالانہ چار روپے

پرچہ ایک روپیہ

منزل، جمشید روڈ، کراچی-۵

(پاکستان)

مطبوعہ : دی انٹر سروسز پریس لمیٹڈ، کراچی-۴

اُردُونامہ

زبان — ایک سیاسی مسئلہ ؟

ہمارے ملک میں لوگوں کو لسانی مسائل سے تو کم سروکار ہے البتہ زبان پر ایک سیاسی مسئلے کی حیثیت سے ضرور چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اکثر لوگ زبان کو صرف ایک سیاسی مسئلے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے دور غلامی کی بخشی ہوئی میراث ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک غیر قوم نے ہمارے ملک میں آکر اپنی زبان ہم پر مسلط کردی۔ اس بات نے مختلف لسانی گروہوں کو چوکنا کردیا۔ اس قوم سے ہمارا تعلق کم و بیش دو صدی تک رہا، لیکن اس نے اپنے آپ کو غیر ہی رکھا، اور ہم نے بھی اسے غیر ہی سمجھا۔ مغلوں کا دور اقتدار اس سے کہیں کم مدت تک رہا تھا۔ لیکن وہ ایک دو عشروں ہی میں یہاں رس بس گئے تھے، اس لیے ان کی زبان بھی غیر زبان نہیں رہی تھی۔ فارسی زبان مسلم عہد کی ابتدا ہی سے یہاں رائج تھی۔ ملک کے عوام اور ملک کی زبانوں نے فارسی کو قبول کر لیا اور اس سے خوب خوب اخذ و اکتساب کیا۔ رفتہ رفتہ خود فارسی بولنے والوں نے ہی ملکی زبانوں کو اپنالیا۔ یہ ایک قدرتی عمل تھا جو کسی شعوری رد و کد یا تعصب کے بغیر رونما ہوا۔ اگر انگریز بھی یہاں رس بس جاتے تو یہ قدرتی عمل ان کی زبان کے ساتھ بھی ہوتا۔ مقامی زبانوں پر اس تاریخی واقعہ کے اثر سے ایک رنگ اور چڑھ جاتا اور کھٹکنے نہ پاتا۔ کچھ نہ کچھ تو پھر بھی چڑھا لیکن کھٹکتا رہا۔ جس طرح انگریز غیر رہے ان کی زبان بھی غیروں کی غیر اور غلامی کی نشانی بنی رہی۔ یہ سانحہ ایک ایسے وقت میں رونما ہوا جو علوم جدیدہ کی ترقی اور تاریخ انسانی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ انگریزی کے تسلط کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ہماری زبانیں ترقی کی شاہراہ سے الگ جاپڑیں۔ زمانہ جتنی تیزی سے آگے بڑھتا رہا اس سے بھی زیادہ تیزی سے یہ رو بہ تنزل ہوتی گئیں، ع :

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اس برصغیر میں وسیع سلطنتوں کے قیام کے ساتھ ہی ایک مشترکہ زبان کی بنیاد پڑچکی تھی جو یقیناً سنسکرت سے قرابت رکھتی تھی اور غالباً پالی سے ملتی جلتی تھی جو بودھ سلطنت میں رائج رہی۔ اردو اسی مشترک زبان کی ارتقائی شکل ہے۔ اردو کے عناصر ترکیبی مع لغات و قواعد اس کے

شاہد ہیں کہ اس میں ملک کے کئی خطوں اور کئی زبانوں کے اثرات موجود ہیں ۔ لیکن جس وقت جدید معیاری اردو کی تشکیل ہوئی تو مغربی ہندی حاوی رہی ۔ ویسے بھی کلیہ بھی ہے کہ کوئی زبان صرف اختلاط سے پیدا نہیں ہوتی ، اس کی کوئی اصل ضرور ہوتی ہے جس پر پیوند لگتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ جہاں تک جدید اردو کا تعلق ہے اسے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں ہی سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ لیکن جس کثرت سے نہ صرف آس پاس بلکہ دور دراز کی دوسری بولیوں کے اثرات اس میں پائے جاتے ہیں شاید ہی دنیا کی کسی اور بولی میں ہوں گے ۔ یہ اثرات لغت سے بڑھ کر قواعد تک سرایت کیے ہوئے ہیں ۔

یہ مخلوط زبان مغلیہ دور سے اب تک برصغیر کے کونے کونے میں ایک مشترک ذریعۂ اظہار کے طور پر کام دیتی رہی ہے ۔ اس میں اور عام ہندی میں کوئی فرق نہیں ۔ البتہ جدید ہندی کی موجودہ روش نے دونوں زبانوں میں ایک مغایرت پیدا کردی ہے جو بظاہر بالکل غیر طبعی ہے ۔ "بن"، معنی بھیس ہندی اور اردو کا مشترک لفظ ہے ، لیکن "ورنتر"، دونوں کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا ۔ "تت سم"، اور "تدبھو"، کا بھی فرق اردو اور جدید ہندی کا بنیادی فرق ہے ۔ ہندی کی اس روش کو الٹی گنگا بہانا کہا جائے گا ۔ اقتضائے لسانی کے تقاضے سے "ورنتر"، کو پھر ایک دن "بن"، کی طرف راغب ہونا چاہیے ۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ، اردو کو ایک نعمت غیر مترقبہ کہنا چاہیے ۔ کسی ایسے ملک کے لیے جس میں کئی زبانیں رائج ہوں اور جس کے دو خطوں کے درمیان اتنا فرق و فاصلہ موجود ہو سب سے بڑی اور لازمی ضرورت ایک مشترک ذریعۂ اظہار ہے ۔ اردو زبان آزادی کی جدو جہد میں بھی ہمارا مشترک ذریعہ اظہار رہی ، اور آزادی کے بعد بھی ہمارے لیے اس کا وجود ناگزیر تھا ۔ ایک گھر کے لوگ آپس میں بات چیت نہ کرسکیں تو کیا ہو؟ اردو نہ ہوتی تو لوگ دیوانے ہوجاتے ۔ افسوس ہے کہ اس حقیقت پر سیاسی مصلحتوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں ۔ تاہم اس وقت اردو کی خیر خواہی اور خود ملک و قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس سیاسی مسئلہ کو طول نہ دیا جائے بلکہ رفت گزشت کرنے کی کوشش کی جائے ۔ اردو کی ترقی کے لیے جس قدر تعمیری کام ممکن ہوں وہ ضرور کیے جائیں ، مگر زبان کے مسئلے پر سیاسی بحث میں نہ الجھا جائے ۔ دستور ملک کے مطابق ہماری دو قومی زبانیں ہیں ، اردو اور بنگالی ، یہ ایک مسلمہ قانونی صورت حال ہے ۔ سیاسی مسئلہ یہاں ختم ہوجانا چاہیے ۔

اس امر قانونی سے قطع نظر جہاں تک ایک مشترک زبان کے وجود کا تعلق ہے ، وہ امر حقیقی کے طور پر اردو ہی ہے ۔ دنیا کسی حقیقت کو بہت عرصہ تک نظر انداز نہیں کرسکتی ۔ جب سیاسی بگولوں کی گرد بیٹھ جائے گی تو ایک مشترک زبان کا وجود ایک روشن اور خوش آیند حقیقت کے طور پر منصف مزاج ذہنوں کو خود بخود قبول ہوجائے گا ۔ یقین ہے کہ مستقبل کے انسانوں کا ذہن ہمارے تعصب زدہ ذہنوں کی نسبت زیادہ حق شناس ہوگا ۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اردو سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والے، علاقائی زبانوں کے ساتھ بھی دلچسپی پیدا کریں۔ بنگالی کو بھی یہ حق ہے کہ وہ مغربی پاکستان میں کسی حد تک دخل پائے۔ ہمارے کانوں میں آئے اور ہماری نظروں سے گزرتی رہے، کہ آخر وہ ہمارے ہی ملک کی زبان ہے اور اکثریت کی مادری زبان ہے۔ ہم اسے اپنا نہ سکیں، تو اس سے رواداری ضرور برتیں۔ تبھی ذہنوں اور دلوں کا غبار چھٹ سکتا ہے، تبھی حقائق روشن ہوسکتے ہیں۔ قدرت نے ابھی اردو کی تکمیل و اتمام کا اعلان نہیں کیا ہے۔ کیا خبر ہے کہ یہ زبان آیندہ کیا کیا رنگ نکالے گی۔ غالباً اپنی اصل و اساس سے بہت دور نہ جاسکے گی لیکن رواداری کی اس روایت کو ضرور نباہے گی جو اس کے خمیر میں شامل اور اس کے پھلنے پھولنے کی ضامن ہے۔

ش - ح - ح

مشکلات غالب مصنفہ نیاز فتح پوری پر ایک تنقید

عبد الرب نواب

مشکلات غالب، مرزا غالب کے صرف ان چند اشعار کی شرح ہے جو زیادہ تر مشکل خیال کیے گئے۔ مصنف میرے دوست ہیں اگرچہ خاکسار کو دکھانے کا بھی موقع نہیں ملا، اس لیے میری یہ تنقید کسی شخص کے خیال کی حامل نہیں ہے بلکہ محض برائے تحقیق کے پیش نظر ہے۔ صاحب موصوف نے بڑی فراخ دلی سے مجھے اس کی اجازت دے دی ہے۔

عبد الرب کوکب

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

شارح:

مفہوم یہ ہے کہ میرے شوق شہادت کا جذبۂ بے اختیار دیکھیے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لیے بے اختیار ہوگئی اور اس کا دم باہر آگیا۔ دم باہر آنا بے اختیار ہونے کے مفہوم میں اردو کا محاورہ نہیں اور محض اختراع ہے غالب کی۔ ایسے ابہام کی شاعری کہتے ہیں۔ جو اب بالکل نامقبول ہے۔

ناقد:

بات صرف اتنی ہے کہ غالب نے شمشیر کو دیکھا کہ اس کی دھار اس کے سینے سے باہر ہے تو یہ کہہ اٹھا کہ کسی کو قتل کرنے کے شوق کا بے اختیار جذبہ شمشیر کو اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی دھار اس کے سینے سے باہر آگئی۔ اسی مفروضہ واہمہ کے تحت نیام سے شمشیر باہر نکالنے کے بعد جب پھر اس کو نیام میں ڈالتے ہیں تو لوگ عموماً تلوار سے نیام پر ایک ہلکی سی ضرب لگاتے ہیں تاکہ جراحت یا قتل کا ایک ٹوٹکا ہوجائے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

شارح:

مفہوم یہ ہے کہ میرے اشعار سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے لیکن ان کا سمجھنا محال ہے یعنی جس طرح جال میں عنقا نہیں پھنس سکتی اسی طرح فہم و ادراک کے جال میں میرے شعر کا مفہوم بھی نہیں آسکتا۔

ناقد :

یہاں غلطی اس بات کی ہوئی ہے کہ عالم تقریر سے اشعار غالب سمجھے گئے ہیں حالانکہ یہاں وہی تقریر مراد ہے جو تحریر کی ضد ہے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہم مجنونوں کی بے معنی بکواس کا کوئی کیا مطلب سمجھے گا ۔ خواہ کسی کا علم و دانش، سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے ہماری ز ژ کا مدعا ایسا ہی ناپید ہے جیسے عنقا ، کہ نام کا تو ہے لیکن کام کا نہیں ۔ جیسا کہ غالب نے ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

غالب کے اشعار تو سمجھنے والے تو سمجھ جاتے ہیں لیکن بعض لوگ واقعی غالب کے اشعار کا مطلب نہیں سمجھتے ۔

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شارح :

مفہوم یہ ہے کہ میں چونکہ اسیری میں بھی آتش زیر پا ہوں اس لیے میری زنجیر کا حلقہ موئے آتش دیدہ ہوکر رہ گیا ہے ۔

یہ شعر بھی ناپسندیدہ ابہام و رعایت لفظی کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر ۔ لفظ حلقہ، ہر حلقہ کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے خالی نہیں ۔

ناقد :

یہاں یہ سمجھا گیا ہے کہ واقعی زنجیر کے حلقے آگ سے جل گئے ہیں اور موئے آتش دیدہ بن کر رہ گئے ہیں اسی لیے ابہام کا الزام لگایا گیا ۔ حالانکہ اضطراب (آتش زیر پا) کی کشمکش میں زنجیروں کے ٹوٹ جانے کو حلقہ ہائے زنجیر کے جل جانے سے تشبیہ دی ہے یعنی شاعر کہتا ہے کہ میں اسیری میں بھی اس قدر بیقرار اور مضطر ہوں کہ زنجیر کے حلقے بھی اس کشمکش میں ٹوٹ کر رہ گئے جیسے آگ بتانے (دکھانے) سے بال جل کر اور حلقہ بن کر رہ جاتا ہے ۔ یہاں کوئی ابہام نہیں ہے بلکہ استعارے سے کام لیا گیا ہے ۔ نیز یہاں لفظ حلقہ بطور اسم مطلق نہیں کہ نقص کا طعن وارد کیا جاسکے ۔ بلکہ یہ لفظ اسم جنس کے طور پر مستعمل ہے ۔ جبھی تو 'ہر' کی قید سے بے نیاز ہے ۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

شارح:

مفہوم یہ ہے کہ ہمارا داغ دل محض ہماری پریشاں خاطری کا نتیجہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ داغ کا سرمایہ محض دود ہے جس کی آشفتگی ظاہر ہے۔ مدعا یہ کہ جب تک آشفتگی پیدا نہ ہو داغ دل میسر نہیں آسکتا۔

ناقد:

آشفتگی سے یہاں پریشان خاطری مقصود نہیں ہے نہ آشفتگی جنوں۔ بلکہ انسان کی بے راہ روی اور گنہگاری مراد ہے۔ اور انسان کی اصل آشفتگی یہی ہے۔ خیالات کا الجھاو اور دل کی خرابی — انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو سب سے پہلے ایک موہوم سا سیاہ نقطہ دل پر نمایاں ہوتا ہے۔ بار بار گناہ کرنے سے یہ نقش سیاہ درست ہوتا یعنی پیدا ہوتا ہے۔ حدیث نبوی سے بھی یہی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ پس گناہوں سے دل پر داغ پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔ شارح کے بیان کردہ مدعا سے نہ یہ بات ظاہر ہوتی ہے نہ ثابت ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ نقش سویدا دل کے سیاہ نشان کو کہتے ہیں جو گناہوں کے سبب پڑجاتا ہے اور 'درست کیا، یعنی ظاہر کیا اور پیدا کیا مطلب ہے۔ اردو زبان میں پہلے اسی طرح بولا جاتا تھا اور یہ فارسی کا تتبع ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

شارح:

یہ شعر بھی غالب کے ان اشعار میں سے ہے جو باوجود سادہ ہونے کے مشکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ الجھن ''زیاں و سود،، کے ذکر نے پیدا کردی ہے کیونکہ کسی سے معاملہ ہونا، باہم عہد و پیماں کی گفت و شنید، کا مفہوم رکھتا ہے اس لیے اگر 'تجھ سے، کا خطاب ''محبوب،، سے ہے تو معنی یہ ہونگے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملۂ محبت اور عہد وفا لینے پر جھگڑ رہے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور سارا طلسم درہم برہم ہوگیا۔ لیکن اس صورت میں 'زیاں تھا نہ سود تھا، کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر خطاب خدا سے ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ کاروبار حیات سے رابطۂ قدرت سمجھنے کی کوشش محض خواب و خیال ثابت ہوئی اور ہماری بے خبری ونا آگہی بدستور باقی رہی، جو سود و زیاں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

ناقد:

وہی پرانی منطق 'باوجود سادہ ہونے کے مشکل' شارح خود کہتے ہیں کہ یہ سادہ سا شعر ہے لیکن ڈرامائی انداز میں فوراً ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ 'مشکل ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے،

اس میں نہ تو سود و زیاں کے الفاظ نے الجھن کا کردار ادا کیا نہ معاملہ سے معاملۂ عہد وفا مراد ہے۔ نہ معاملہ خدا سے ہے نہ کاروبار حیات سے رابطۂ قدرت، نہ بے خبری و آگہی کی بقا۔ غرض خیالات کے الجھاؤ اور ذہنی اضطراب نے ایک ہنگامۂ بے خبری پیدا کر دیا ہے۔ یہ ساری خرابی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ معاملہ سے "محبوب سے عہد وفا کرنے پر جھگڑنا" سمجھ لیا گیا۔ یہی خشت اول تھی جو کج رکھ دی گئی اور ساری عمارت ثریا تک ٹیڑھی چلی گئی یہاں دراصل معاملہ سے صرف میل اور لگاؤ مراد ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا ہی جاتا ہے۔ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ خواب میں جو تجھ کو دیکھا اور تجھ سے ملا یہ صرف خیال کی شعبدہ بازی تھی اور یہ بلاشبہ خواب و خیال کی بات تھی۔ لیکن جب آنکھ کھل گئی اور یہ طلسم ٹوٹ گیا تو پھر سود و زیاں کا کیا سوال۔ خواب میں تجھ کو دیکھنے سے نہ کچھ فائدہ ہوا نہ آنکھ کھلنے سے کوئی نقصان۔ معاملہ سے عہد و پیمان سمجھ لینا بہت دور کی کوڑی لانا ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ خیال کو معاملہ کہا یعنی محض خیالی بات تھی۔ خدا سے خطاب کی طرف تو سوء ظن بھی نہیں ہوسکتا۔ خدا نہ خواب میں آسکتا ہے نہ خیال میں اس سے معاملہ ہوسکتا ہے۔
ع :- کجا بود ... کجا ماندیم۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

شارح :

شارح شعر کا مفہوم پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ خبر نہیں کہ دل کسی وقت اپنے پاس تھا اور اب وہ چلا گیا ہے۔

ناقد :

یہ مطلب 'رفت و بود' کا لیا جا رہا ہے۔ یہ اس قدر صاف شعر ہے کہ اس کی شرح کی مطلق ضرورت ہی نہیں تھی جیسے کہ خواب و خیال والا شعر۔ شعر کے مفہوم سے اس مطلب کو کوئی تعلق نہیں نہ 'دل تھا' کا کوئی ذکر نہ 'چلا گیا' کا ذکر۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ایک عرصہ سے درس عشق لے رہا ہوں لیکن ابھی ابتدائی سبق سے آگے نہیں بڑھا۔ رفت و بود کے ابتدائی سبق میں پھنس کر رہ گیا۔ جیسے:

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر	ماہمچناں بہ اول وصف تو ماندہ ایم

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شارح :

حسن کی ظاہری سادگی و بے پروائی پر نہ جاؤ۔ یہ دراصل ہشیاری ہے اور اس طرح وہ امتحان لینا چاہتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی بے پروائی دیکھ کر عشاق اپنی حد سے آگے بڑھ جائیں۔

ناقد:

یہاں "جرأت آزما" کے لفظ نے شارح کو دھوکے میں ڈالا کہ اس کا مطلب وہ یہ سمجھے کہ معشوق عشاق کی جرأت کو آزمانا چاہتا ہے، کہ عشاق اپنی حد سے آگے تو نہیں بڑھ رہے ہیں۔ ایسا سمجھنے میں کوئی تک نہیں ہے۔ بلکہ شاعر کہتا ہے کہ حسن یار تغافل کا رو یہ یعنی سادگی اختیار کرکے اپنے اثر کو آزما رہا ہے۔ چنانچہ اس کی یہ سادگی بڑی قیامت ہے اور اس کی یہ بے خودی کی سی کیفیت اور الہڑ پن درحقیقت بڑی ہشیاری ہے۔ حسن دراصل اپنے اثر کو آزمانا چاہتا ہے کیونکہ عاشق دراصل اس کی سادگی اور بےخودی اور الہڑ پن پر مرمٹے ہیں۔ کوئی یار کی پرکاری اور ہشیاری پر نہیں ریجھا۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غرض حسن تغافل اختیار کرکے اپنی جرأت و ہمت کو آزمانا چاہتا ہے کہ یہ تغافل کارگر ہوتا ہے یا نہیں۔ آزمانا اپنے رعب اور اثر حسن کو آزمانا ہے۔

میں عدم میں بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

شارح:

میں جب حالت عدم میں تھا تو اس وقت بھی میری آتش نفسی کا یہ عالم تھا کہ میری سے عنقا کے پر جل جاتے تھے لیکن اب تو میں دنیائے عدم سے بھی بہت دور آگے نکل گیا ہوں اس لیے اب اس عالم کا ذکر نہ کرو جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مرتبۂ فنا ذات، نام صرف معدوم ہوجانے کا نہیں بلکہ اس سے بھی آگے گزر جانے کا ہے۔

ناقد:

یہاں پرے سے مراد یہ ہے کہ میں عدم سے باہر ہوں۔ یعنی اب مجھے اپنے کو فنا فی کر دینے کے سبب موجود بوجود الواجب سمجھو ورنہ اس وقت جب کہ عالم فنا میں تھا تو ایسا فانی تھا کہ عنقا بھی اتنا معدوم نہیں۔ کیونکہ وہ کم از کم وہمی و خیالی وجود تو رکھتا ہے اور میں تو بحالت عدم وہم و خیال میں بھی نہیں تھا اس لیے میرا عدم عنقا کے عدم سے بھی بڑھ گیا اسی کو 'بال عنقا جل گیا' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ گویا اپنے کو اسم تفضیل کی ڈگری حد تک لے گیا ہے۔ 'ورنہ' کا مطلب ہے جب میں عالم عدم میں تھا اور وجود مطلق میں جا کر ضم نہیں ہوگیا تھا۔ اب شعر کا مفہوم اس کے الفاظ کے جوڑ کے ساتھ منضبط اور منسلک ہوگیا۔

عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس شعر کا مفہوم صحیح بیان کیا گیا ہے لیکن جس چیز نے تنقید کی ضرورت پیش کی وہ یہ کہ شارح نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ "مبالغہ ہے لیکن گوارا"۔ اگر اس کو مبالغہ مان لیا جائے تو گوارا نہیں بلکہ ناگوار ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایسا بھی مبالغہ کیا جائے کہ صحرا کا محض وجود ہی اٹھا دیا کہ صحرا میں آگ لگ گئی۔ یہ تو وہ مثل ہوئی کہ

"پانی میں آگ لگادی زمین آسمان کی ۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"۔

یہاں مبالغہ ہے ہی نہیں۔ اس کو "جوہر اندیشہ" کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ عقل و فکر، سوچ اور اندیشہ کی گرمی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر کبھی وحشت کا دھندلا سا خیال آ بھی جاتا ہے کہ جنون وحشت کی کارفرمائی میں صحرانوردی ہی کریں تو یہ عقل و فکر اس منصوبہ کو خاک میں ملا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کو 'صحرا جل گیا' کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ "جوہر اندیشہ" کے الفاظ کے 'فائدہ' استعمال کو ضرور پیش نظر رکھیے تاکہ معلوم ہو کہ کوئی مبالغہ نہیں۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

شارح :

تنگی دل کے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی میری تنگی دل (رنج و ملال) کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اس کے اندر سے نکلا تو پروں سمیت نہ نکل سکا اور دل ہی میں چھوڑ گیا حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تیر تنگی دل کی داد دیتا اور زخم کو وسیع کر دیتا۔ مدعا یہ کہ میں ایسا تنگ دل، رنجیدہ و ملول انسان ہوں کہ محبوب کا تیر کھانے کے بعد بھی میری دل تنگی نہیں جاتی۔

ناقد :

داد دینا قدر کرنے اور تحسین سمجھنے کو کہتے ہیں۔ زخم کا تنگی دل کی داد دینا تو درحقیقت یہ تھا کہ بہ سبب فشار تیر سینۂ بسمل کے زخم سے پھر ایسا تیر باہر نکل ہی نہ سکتا لیکن جب تیر نکل گیا تو گویا تیر کے زخم نے تنگی دل کی داد نہ دی۔ پرافشاں ہونا پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ جانا ہے نہ کہ پروں کو دل ہی میں چھوڑ دینا۔ کہا جاتا ہے کہ تیر اپنے پروں کی وجہ سے اڑتا ہے لیکن اگر اس کے پر نہ ہوں یا اسے پر گرا دے تو پھر اڑ کیسے سکے گا اور سینے سے باہر کیسے نکل سکے گا۔ یہ بات ہے کہ پرافشاں ہونے سے پر گرا دینے کے معنی ہرگز نہیں لیے جاسکتے۔

تنگی دل کی داد دینا زخم کو وسیع کرنے کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔ بلکہ تنگی دل کی لاج رکھنے کے معنی میں ہے۔

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

شارح :

"بقدر لب و دنداں" یعنی محض اس حد تک کہ صرف لب و دنداں لذت حاصل کرسکیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرا دل حسرت زدہ جو لذت درد کا ایک کھلا ہوا وسیع دستر خواں تھ جس سے کافی لذت درد حاصل کی جاسکتی تھی لیکن لوگوں نے اس سے صرف بقدر لب و دنداں یعنی بہت کم فائدہ اٹھایا۔ یعنی میرے کلام کو جس نظر غائر سے دیکھنا چاہیے تھا لوگوں نے نہیں دیکھا اور اس کے محاسن کو پوری طرح نہیں سمجھے۔

ناقد :

اس شعر کا مدعا حاصل کرنے کے لیے اس کی کیا ضرورت تھی کہ یہ کہا جائے کہ یہ اس مفہوم کا حامل ہے کہ میرے کلام کے محاسن کو کسی نے پوری طرح نہیں سمجھا۔

نیز بقدر لب و دنداں سے "بہت کم فائدہ" کا مفہوم لینا بھی بالکل نامناسب ہے بلکہ ظاہر ہے ک اس سے حسب استعداد کا مفہوم ہی مستنبط ہوسکتا ہے۔ یعنی میرے لذت درد کے احساس جتنی جتنی بھی استعداد لوگوں میں ہے اسی قدر میرے درد کا اندازہ لگا لیے ہیں اور اس خواں لذ درد سے حسب ضرورت و حسب مرضی استحصال کرتے ہیں۔ کوئی میرے دل حسرت زدہ کے د کو زیادہ سمجھتا ہے اور کوئی بہت کم۔ ہر ایک اپنے آئینہ میں میرے درد کو دیکھتا ہے۔

یہ مفہوم تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ دل حسرت زدہ سے حسب بیان شارح میرا دل حسرت ز سمجھ جائے۔ ورنہ اگر دل کو مقید کرنے کی بجائے مطلق رکھیں تو بات اور بھی زیادہ صاف۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے یہاں ایک کلیہ بیان کیا ہے یعنی ہر شخص کا معمور حسر دل گویا ایک مائدہ درد ہے اور وہ اس سے اسی قدر لذت یاب اور منتفع ہوسکتا ہے جتنی اس کے اند غم دوستی اور غم فطرتی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ یہ ایک ابہام ہے کہ غالب لوگوں نافہمی کا الزام لگاتا ہے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

شارح :

زندگی میں ہر وقت موت کے کھٹکے سے میرا رنگ زرد رہتا تھا۔ لیکن کاروبار حیات مجھے کبھی خوشی حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ تمام اسباب زندگی فنا ہونے و میں اور جس چیز کو بقا نہ ہو اس پر خوش ہونا کیا۔

ناقد :

یہاں کاروبار حیات (الی آخرہ) سے کوئی تعلق شعر کو نہیں۔ مقصد یہ کہنا ہے کہ چو مرنے پر سب کا رنگ زرد پڑجاتا ہے اس لیے لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بہ سبب موت میرا رنگ

اڑ گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا نہیں۔ میرا رنگ بعد مرگ جو اڑا ہوا دیکھتے ہو سو یہ مرنے سے پہلے بھی بہ سبب میرے عشق اڑا ہوا اور زرد تھا۔ پس ماندگان یہ سمجھتے تھے کہ میت کا رنگ اس وجہ سے زرد ہے کہ زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ غلط ہے اس لیے کہ عاشق کو بھی کہیں موت کا ڈر ہوتا ہے۔ پہلے مصرع میں گمان بیان کیا گیا ہے لوگوں کا۔ دوسرے مصرع میں اپنی طرف سے اس گمان کی تردید کی ہے اور صفائی پیش کی گئی ہے۔

حیات میں خوشی حاصل نہ ہونے اور فانی چیزوں پر خوش نہ ہونے کے نظریہ کو شعر کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

ناقد:

میرے محبوب کو تسبیح ہاتھ میں لیے رہنا اس لیے پسند ہے کہ اس طرح وہ گویا ایک ہی وقت میں سو دل اڑانے کا سماں سامنے لاتا ہے۔ غیر دلچسپ خیال آرائی کے سوا اس شعر میں کچھ نہیں۔

ناقد:

بت دل ربا کو تسبیح پھیرتے ہوئے دیکھنا نہ کسی کو پسند آتا ہے نہ غالب کو پسند آتا تھا۔ کیونکہ یہ ریا کارانہ زہد تو زاہد ہی کی عبادت کے لیے موزوں ہے۔ مالا جپنے کو حسن کی طرف نہ منسوب کیا جاسکتا ہے نہ معشوق کی خصوصیات میں سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لیے تسبیح محبوب کے ہاتھ میں نہ دیکھیے بلکہ زاہد ہی کے ہاتھ میں رہنے دیجیے۔ شاعر کہتا یہ ہے کہ زاہد کو تسبیح پھیرتے ہوئے دیکھیے اور ہاتھ کے ایک ہی دور میں سو دانے گن لینا یہ نظارہ اس بت مشکل پسند کو بہت ہی پسند ہے کیونکہ یہ عمل ایک زاہد اور ایک زاہد فریب میں بطور قدر مشترک ہے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

شارح:

اس شعر میں غالب نے اپنی انتہائی ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ محبوب عیسیٰ نفس میرے اندر نئی روح پھونکنے آیا تھا لیکن یہاں ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے افسوں پڑھنے کے لیے لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ میں اس جنبش کے صدمہ سے مر گیا۔ مدعا یہ ہے کہ میرا حال دعا اور دوا دونوں سے گزر گیا اور میری جاں بری کی صورت باقی نہیں۔

ناقد :

یہاں دم عیسیٰ کا لفظ بتا رہا ہے کہ حالی حبیبی لب مراد نہیں بلکہ دعا پڑھ کے پھونک مارنا مراد ہے ۔ مگر وفور ناتوانی کے سبب میں اس پھونک کی زد کو بھی برداشت نہ کرسکا اور دم نکل گیا ۔ یہاں عیسیٰ سے محبوب مراد نہیں بلکہ خود نامزد عیسیٰ ہیں اور دعا اپنی کمزوری کو بتانا ہے نہ کہ دعا اور دوا سے گرز جانا ۔ کچھ پڑھ کے پھونک مارنا عیسیٰ کا کام ہوتا ہے نہ کہ کسی معشوق کا شیوہ ۔

سماں کیا کبھی بیداد دشنہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

شارح :

اس میں لفظ ''کاوش،، سے فائدہ اٹھا کر قطرۂ خوں کو دانۂ تسبیح ظاہر کیا گیا ہے ۔ کیونکہ تسبیح کے دانے بھی سوراخ کرکے بنائے جاتے ہیں یہ شعر بھی محض الفاظ کا کھیل ہے اور ناگوار ندرت بیان ۔

ناقد :

یہاں لفظ '' کاوش،، سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے بلکہ یہ لفظ محض برائے قرب سلا سب ہے اور صرف مژگاں کی رعایت لفظی کی مناسبت سے لایا گیا ہے ۔ مژگاں یار کا کام دل میں کریدنا ہوتا ہے ۔ نہ کہ قطرۂ خوں میں سوراخ ڈالنا ۔ یہاں تو قطرہ ہائے خوں کو دانہائے تسبیح مرجاں سے تشبیہ دی ہے کیونکہ دونوں سرخ ہوتے ہیں ۔ یعنی مژگاں نے دل میں اتنے زخم ڈالے کہ لگاتار خوں کے قطرے چشم کے ذریعہ ٹپک پڑے بالکل ایسے جیسے تسبیح مرجاں کے دانے ہوتے ہیں ۔ آخر اس تشبیہ میں کون سی ناگوار ندرت بیان ہے ۔ بھائی! یہ صرف الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ معنی کا بھی ہے ۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

شارح :

میں اپنی تباہی کا گلہ کس سے کروں جب کہ خود میری ساخت و تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ ہے یعنی جس طرح دہقان کا محنت کرکے خرمن جمع کرنا بجلی گرنے کا باعث ہے اسی طرح خود میرا وجود میری تباہی کا باعث ہے ۔

ناقد :

برق کو آسمانی برق سمجھا گیا ہے ۔ حالانکہ اس برق کا ہیولا آسمانی حرارت کو نہیں بتایا گیا بلکہ خون گرم دہقاں کو بتایا گیا ہے یعنی یہی خون گرم دہقاں اسی کے پیدا کیے ہوئے

عرش پر بجلی سی کوند گئی یا ایک ہیولا تھا۔ کہتا ہے میں تھا ہی خون بگڑنے کے لیے جیسے دہقان کہ خرمن دانا ہی ہے اس کو بگاڑنے کے لیے یعنی وہ اپنا خون گرم کرکے یعنی بہت محنت کرکے خرمن تیار کرتا ہے۔ پھر برق گر کر اس غلہ کو کھا جاتا ہے۔ گویا اس کے خون کی حرارت اور گرمی اسی کے خرمن پر بجلی بن کر گری۔

خون گرم کو برق کا ہیولا اس لیے کہا کہ ٹھوس مادہ یعنی جسم موجودہ وجود میں آنے سے پہلے ہیولا کی صورت یعنی بے شکل ذرات کی مقناطیسی یعنی اجزائے لایتجزیٰ کی صورت میں ہوتی ہے اسی کو اسم کہہ لیجیے

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

شارح:

مدعا یہ ہے کہ ہماری نگاہ میں اصل چیز راہ فنا کا جادہ ہے۔ کیونکہ آخر کار اسی سے شیرازہ عالم کے تمام اجزائے پریشاں منسلک ہوجاتے ہیں یعنی زندگی محض پریشانی و آشفتگی کا نام ہے اور مرتے دم تک اس سے مفر نہیں۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سب انتشار ختم ہوجاتا ہے اور عالم کے تمام اجزائے پریشاں ایک ہوجاتے ہیں۔

ناقد:

اس شعر کے سمجھنے میں شارحین کو بہت الجھن ہوتی ہے اور نتیجے میں مشکلات غالب کے مصنف کو بھی۔ موت جو اجزا کو پریشاں کرنے کا سبب بنتی ہے یہ کہ کسی شیرازہ میں باندھنے کا سبب۔ یہ سب تعلیق الغلط بالغلط ہے اور محض سخن فہمی کی پریشان خاطری کا ایک مظاہرہ یا تماشا ہے۔

شاعر کہتا یہ ہے کہ ہم جادۂ فنا یعنی فنا پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی فنا پریشاں شدہ اجزائے مخلوقات کی دوبارہ شیرازہ بندی کا سبب بنے گی اور پھر سے انسان اور سارا عالم تخلیق ہو پائے گا اور جب تک عالم فنا نہ ہوجائے اس کے یہ اجزائے پریشاں پھر ایک بندھن میں نہیں آئیں گے اس لیے فنا ہونا عین قرین مصلحت ہے ورنہ نہ اجزا پریشاں ہونگے نہ از سرنو ترتیب عناصر ظہور میں آئے گی۔ غالب بعث بعد الموت کے مسئلہ کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہے۔

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

شارح:

رنگ شکستہ ، اڑا ہوا رنگ۔ جب چہرے کا رنگ اڑتا ہے تو اس میں سفیدی کی جھلک آتی ہے۔ اسی لیے رنگ شکستہ کو صبح سے تشبیہ دی۔ مفہوم یہ ہے کہ میرے اڑے

ہوئے رنگ کا نظارہ معشوق کے لیے گویا وقت صبح کا نظارہ ہے جب عام طور پر پھول کھلنا شروع ہوتے ہیں ۔ اس لیے میرے رنگ شکستہ کی صبح کو دیکھ کر محبوب کے گلہائے ناز کو بھی کھلنا چاہیے ۔ یعنی میری شکستگی رنگ کو التفات محبوب کا باعث ہونا چاہیے ۔ اس شعر میں ناگوار تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں ۔

ناقد :

شعر کو سمجھنے میں اڑے ہی تکلف اور تصنع سے کام لیا گیا ہے ۔ رنگ شکستہ کی صبح ، یعنی چہ ؟ کیا رنگ شکستہ کی بھی کوئی صبح نمودار ہوا کرتی ہے ؟ اگر ہو بھی تو گلہائے ناز محبوب ایسی مکروہ صبح میں کیوں کھلیں ۔ عاشق کے اڑے ہوئے رنگ کا بھیانک نظارہ کیا معشوق کے لیے وقت صبح کا نظارہ بنایا جا سکتا ہے ۔ یہ ساری خرابیاں صرف اس لیے ہوئی ہیں کہ صبح کو ترکیب مقلوب کے طور پر مضاف سمجھ لیا گیا یعنی معناً یہ کہ لفظاً ۔ پھر یہ کہ عاشق کے رنگ شکستہ کو صبح سمجھا گیا اور کہا گیا کہ اس کو صبح سے تشبیہ دی ۔ اب تو اونٹ کسی کروٹ بھی نہیں بیٹھ سکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ صبح مضاف الیہ ہے بلا کسرہ اضافت اور رنگ شکستہ صبح سے ، صبح کے وقت یو پھٹنا ہی سمجھا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں ۔ اور یہی وقت ہوتا ہے جس کو عربی میں فلق اور انگریزی میں Dawn کہتے ہیں جس کے لغوی معنی رنگ شکستہ صبح کے ہیں ۔ اس شعر میں صبح کے خوش آیند وقت سے تفریح دل کی تعلیم ہے ۔

یہ تو رہا تغزل سے باہر کا مطلب اور تغزل آورس مطلب یہ ہے کہ رنگ شکستہ سے عاشق کا نہیں بلکہ معشوق کا وہ اڑا اڑا رنگ مراد لیا جائے جو صبح کے وقت بیدار ہونے پر معشوق کے چہرے کو سازگار کرتا ہے ۔ گلہائے ناز صحیح معنی میں اگر کھلتے ہیں تو اسی بے ساختہ پن اور بے تکلفی کے سامنے میں ۔

کیوں اندھیری ہے شب غم ، ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

شارح :

بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ان بلاؤں کا تماشا دیکھنے کے لیے آج دیدۂ اختر اوپر ہی کی طرف مائل ہے ۔ زمین کا رخ نہیں کرتا اور یہی سبب ہے شب غم کی اندھیری کا ۔ یہ شعر دور از کار خیال کے سوا کچھ نہیں ۔

ناقد :

سارے نکلے ہوئے ہوں یعنی دیدۂ اختر کھلے ہوں اور چاندنی رات ہو لیکن اس کے باوجود تاریکی ہو ۔ یہ ایک متضاد کیفیت ہے اس بات کو نبھانے کے لیے مجبوراً شارح کو یہ قرار دینا پڑا کہ لفظ "ادھر" بالضم ہے یعنی دیدۂ اختر اوپر کی طرف ہے ۔ اور اسی تکلف کے نتیجہ میں کہنا پڑا

یہ یہ شعر دور از کار معنی کے سوا کچھ نہیں۔ دیدۂ اختر سے ستارے اگر نہ سمجھے جائیں تو یہ پیچیدگی نہ پڑتی۔ دراصل یہاں دیدۂ اختر سے مراد اپنی بد اختری لی گئی ہے جس کا ثبوت "بلاؤں کا نزول" والے الفاظ سے ملتا ہے۔ کیونکہ بد اختری ہی کے سبب بلائیں نازل ہوتی ہیں اور لفظ ادھر بالضم نہیں بلکہ ادھر بالکسر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دیدۂ بد اختری میری ہی طرف کھلا ہوا ہے اور بد اختری میری ہی طرف گھور رہی ہے۔ جبھی تو بلاؤں کا نزول ہوتا ہے۔ زلفی ایرانی کا شعر ہے

از بسکہ بہ حیلہا کردیم کہ خون تا در رسید		این شب تاریک من با دیدۂ اختر رسید

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

<u>شارح :</u>

مطلب یہ ہے کہ وہ زمانہ یاد کر جب شکار کی جستجو میں تیرے دام کا حلقہ دیدۂ بےخواب کی طرح کھلا رہتا تھا لیکن اب یہ دور ختم ہو گیا ہے کیونکہ تیرے دام میں اب اتنے صید آچکے ہیں کہ اب کسی تازہ شکار کی تجھے فکر ہی نہیں۔

<u>ناقد :</u>

انتظار ایک چیز ہے اور جستجو ایک چیز۔ شعر سے یہ مفہوم کہاں نکلتا ہے کہ تیرے دام میں بہت صید آچکے ہیں اور اب تجھے کسی تازہ شکار کی فکر نہیں۔

شاعر اس شعر میں معشوق کے قبل از شباب زمانہ کو یاد دلاتا ہے جب کہ وہ دراصل تھا کہتا ہے کہ اب تو تو نوجوان ہے لیکن وہ دن یاد کر جب کہ تو دھان پان تھا۔ تیری زلفوں کے گول حلقے دیدۂ بےخواب کی طرح کسی عاشق کی گھات میں تھے اور شکار کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ شباب کی آنکھیں ابھی کھلی نہیں تھیں لیکن استعداد فتنہ شباب پیدا ہو چکی تھی۔

خدا ترا یہ کم سن دراز سن تو کرے		سمجھ کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

<u>شارح :</u>

مدعا یہ ہے کہ خون جگر صرف مژگان یار کی امانت تھا اور اسی کے لیے یہ خون بہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مژگان یار نے اس امانت کا حساب مجھ سے لینا چاہا تو مجھے پھر از سرنو خون کے آنسو بہانا پڑے اور اس امانت کو اس طرح واپس کیا۔

ناقد :

شعر کے اندر کہیں بھی یہ چیز محذوف نہیں کہ میں نے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے ہیں یا یہ کہ از سر نو خون کے آنسو بہانا پڑے ۔

شاعر یہ کہتا ہے کہ تھوڑا سا خون جگر نہیں بلکہ سارا خون جگر مژگاں یار کی امانت تھا مجھی سو ایک خوبی کا ایک ایک قطرہ یعنی سارا خون جگر آنکھوں سے بہا کر اس امانت کا پورا پورا حساب دینا پڑا ۔ اب نہ جگر ہے نہ جگر میں خون ۔ جس خیانت کا دعویٰ شارح نے کیا ہے یہ بات جذبۂ عشق کی صداقت کے کس قدر خلاف ہے ۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

شارح :

آئینہ اگر ٹوٹا ہوا نہ ہو تو اس میں ایک ہی عکس نظر آئے گا لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اس کے ہر ہر ٹکڑے میں الگ الگ صورت نظر آئے گی ۔ اس حقیقت کے پیش نظر غالب کہتا ہے کہ توڑے میرا دل (جو تیری آرزوؤں کا آئینہ دار تھا) ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے ہزاروں آرزوؤں کا ماتم دار بنا دیا ۔ مدعا یہ کہ دل ٹوٹنے سے میری تمناؤں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ۔

ناقد :

دل کے ٹوٹنے سے اگر تمناؤں میں اور اضافہ ہوگیا ہے تو شاعر اپنی آرزوؤں کا ماتم کیوں کر رہا ہے ایک آرزو ٹوٹی تو اس کے بدلے سو آرزوئیں مل گئیں ۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آئینہ میں ایک ہی تصویر تھی ، آئینہ ٹوٹا تصویر ٹوٹ گئی گویا میری آرزوؤں کا شہر اجڑ گیا ۔ اب آئینہ میں ایک تصویر بھی نہیں رہی ۔ توڑے آئینہ‘ دل جو توڑا ۔ اس میں تیری تصویر تھی اس تصویر کے ضائع ہونے سے میں ہوں اور اپنی آرزوؤں کا ماتم ہے ۔

جا گزیں ہے دل میں پہلے سے تری تصویر بھی، اس قدر انداز ٹیڑھا رکھ نصاب تیر بھی

شہر پر جو زبر دیا گیا ہے یہ بالکل غلط ہے تمثال دار کا مطلب جو آرزوؤں کا آئینہ دار لیا گیا یہ بھی صحیح نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں ”حامل تصویر“ اور مدعا وہ نہیں جو بتایا گیا بلکہ یہ کہ مجھے دل ٹوٹنے کا غم نہیں ۔ تیری تصویر ٹوٹنے کا ماتم ہے جو میرے دل کے اندر تھی اور جو یک شہر آرزو یعنی بہت بہت آرزوؤں کا مرکز تھی ۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

شارح :

تیرا جلوہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کو ہر وقت دیکھتی رہے اور تیرے اس تقاضائے جلوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خود جوہر آئینہ بھی مژگاں ہوجائے یعنی تجھے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے ۔

جوہر آئینہ کو مژگاں سے تشبیہ دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دیکھنا مژگاں کا کام ہے یا نگاہ کا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ جوہر آئینہ تار نگاہ بن جانا چاہتا ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔

ناقد:

اس شرح سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جوہر آئینہ دیکھنے کی تمنا کرتا ہے حالانکہ شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ مژگاں ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ دیکھنے کا کام تو دیدۂ آئینہ نے انجام دیا ہے اور اس دیدہ کے مژگاں اس آئینہ کے جوہر ہیں۔ یعنی تقاضائے نظر محبوب کو پورا کرنے کے لیے آئینہ چشم بن گیا ہے۔ جلوہ جو تھا یہ تھا کہ کوئی سراپا مطمح نظر ہو۔ چنانچہ اس نے اپنا حسن آئینہ میں دیکھا۔ آئینہ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے اندر کے جوہروں سے جو بوقت صیقل لکیروں کی صورت میں تھے مژگاں کا کام لیا چنانچہ اس طرح تقاضائے نگاہ یار پورا ہوا۔

اب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اگر غالب حسب اصلاح شارح تار نگاہ کو جوہر آئینہ بنا کر پیش کرتا تو بات اتنی غیر موزوں ہوتی۔ شاعر خود بھی تو دیکھنے کا کام مژگاں کے سپرد نہیں کر رہا ہے جیسا کہ جوہر آئینہ کو تار نگاہ بنا دیں یا ایسی اصلاح دیں۔ اسے روشنی طبع تو برتن بلا سمجھی۔

مست خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

شارح:

مفہوم یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد کا انتظار تھا اور اس کے نہ آنے پر خمار کی کیفیت طاری تھی لیکن یہ اس شدت کی کیفیت تھی کہ مسلسل انگڑائیوں کی وجہ سے، جو لازمی نتیجہ ہیں خمار کا، خط ساغر تا خط سیمہ تک یعنی تمام بزم بادہ میں گویا ہنگامۂ قیامت کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔ انگڑائیوں میں چونکہ ایک صورت ہنگامہ و تلاطم کی پائی جاتی ہے اس لیے اسے رستخیز اندازہ کہا گیا۔ غالب کا یہ شعر دور از کار تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

ناقد:

میں بھی صرف اس کا مفہوم لکھ دیتا ہوں تاکہ معلوم ہوجائے کہ اس میں دور از کار تخیل نہیں بلکہ غالب کا یہ شعر تخیل آفرینی کا ایک شاہکار ہے۔ اس شعر میں غالب نے بزم طرب کی ایک ایسی وجد انگیز تصویر کھینچی ہے کہ فردوسی بھی ہنگامۂ رزم کی کچھ ایسی ہی تصویر کھینچ سکتا تھا کہ ایسا معلوم ہو گویا یہ اپنا آنکھوں دیکھا حال ہے۔

میخانے میں سارے مے کش جمع ہیں اور شراب کے گرد (تا محیط بادہ) حلقہ باندھے بیٹھے ہیں ساقی نہیں آیا اس کا انتظار ہو رہا ہے، بعد بصد انتظار آیا، نشۂ شوق سے نے خمار کی صورت اختیار کرلی تھی اب اس خمار کو دور کرنے کی کوشش قیامت آفریں تھی۔ حلقے میں بیٹھا ہوا ہر مے کش ساقی کے آگے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ بیسیوں ہاتھ انگڑائی کی صورت میں کھل گئے تھے گویا یہ د۔

انگڑائیوں کا ایک تصویر گھر (صورت خانۂ خمار) بن گئی تھی۔ یہاں انتظار ساقی ، شوق مے ، خمار کی قیامت آفرینی پر غالب نے روشنی ڈالی ہے اور اس منظر کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے جو تخئیل کا ایک نادر ترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ اب دور ار کار کا میں کیا جواب دوں آپ ہی جواب دے دیجیے۔ "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

شارح :

کاروبار عالم کی رونق صرف اس حقیقت پر منحصر ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے اور ہر شخص کو مرنا ہے۔ اسی خیال کے زیر اثر ہر شخص مصروف کار رہتا ہے۔ اگر موت کی کیفیت نہ ہو تو پھر نہ معلوم ہنگامۂ دنیا ختم ہوجاتے اور جینے کا کوئی لطف باقی نہ رہے۔

ناقد :

یہاں شارح نے صرف دوسرے مصرع پر روشنی ڈالی ہے اور یہ مصرع تو اتنا صاف ہے کہ ایک طالب علم سے بھی پوچھو تو وہ بھی اس کا صحیح مطلب بول اٹھے گا۔ شارح پہلے مصرع کا مطلب کھنے میں گول ہوگئے ہیں حالانکہ سمجھنے کی چیز بس یہی مصرع تھا۔ یہاں شاعر کو کہنا یہ مقصود ہے کہ عمل کی طرف رجحان اور کسی کام کی خوشی جذبۂ ہوس (تمنائے سرط ، تمنائے بیجا) پر منحصر ہے۔ ہوس ہی نہ ہو تو کام کی خوشی ہی کیا ہوسکتی ہے۔ جیسے کہ جینے کی کیا خوشی ہوسکتی ہے اور جینے کا کیا مزہ آئیگا اگر مرنا بھی اس کے ساتھ لگا ہوا نہ ہو۔ موت ہی کی وجہ سے زندگی کی قدر ہے۔ ہوس ہی کی وجہ سے نشاط عمل مقبول ہے۔ نشاط بے ہوس غیر دلچسپ۔ زندگی بے خوف مرگ بالکل بے مزہ۔ اس شعر میں غالب نے ایک نفسیاتی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی تشبیہ بالکل طابق النعل بالنعل دی گئی۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ ہوس کو مرنے تمنائے زیست سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا قرینہ دوسرے مصرع کے "جینے" میں ہے۔ یہ بات نفسیاتی اصول سے بالکل غلط ہے کہ مرنے کا خیال مصروف کار رکھتا ہے۔ نہیں بلکہ ہوس یعنی جینے کی تمنا مصروف بہ کار رکھتی ہے۔

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

شارح :

دشمن پر آپ کی بیجا نوازشیں دیکھ کر اگر میں شکایتیں کرتا ہوں تو آپ کو اس کا گلہ کیوں ہے۔ شکایتوں کو رنگین اس لیے کہا گیا کہ اس کا تعلق محبوب اور غیر کے ربط رنگیں سے ہے۔

ناقد:

میں سمجھتا ہوں، غلط ہے۔ آپ کو گلہ کیوں ہے، یہ بھی غلط۔ شاعر کہتا یہ ہے کہ آپ رقیب سے ناز بھرے رنگین شکوے شکایتیں کر رہے ہیں میں اس کا کیا گلہ کروں جب کہ یہ شکایت ہائے رنگیں بجائے خود رقیب پر نوازشیں ہیں اور وہ بھی دوزمعنی سمجھا۔

عاشق کی شکایتوں کو رنگین قرار دینے کے بعد اس کو عاشق سے منسوب کرنے کے بعد تاویل یوں کرنا کہ اس کا تعلق محبوب اور غیر کے ربط رنگیں سے ہے کیسی عجیب بات ہے۔ مطلب آفرینی کی بنیاد ہی غلط فہمی پر ہے۔ شاعر معشوق سے شکایت ہی کب کر رہا ہے اور معشوق کو بھی عاشق سے گلہ کب ہے۔ اب اس غلط فہمی کا آپ ہی کوئی کیا گلہ کرے۔

نگہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

شارح:

میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بالکل بے حجاب اور بے تکلف ہو کر ملو لیکن تم تغافل سے کام لیتے ہو جو میرے لیے سخت صبر آزما ہے۔

ناقد:

یہاں بے حجاب ہو کر ملنے کی فرمائش کرنے اور تغافل کے الزام کا شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ شاعر کہتا یہ ہے کہ یہ غلط انداز نگاہیں صبر آزما سہی لیکن تم سادگی سے ملو۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو میں پھر نوک وار کھانے کے لیے تیار ہوں۔ دزدیدہ نگاہی سے میرے صبر کو کیا آزماتے ہو۔

نگاہ بے محابا کے مقابلہ میں تغافل نہ ہے۔ آنکھیں چرا کر انجان بن سے دیکھنا۔

نفس موج محیط بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

شارح:

ہماری ہر سانس خود اپنی ہی بےخودی کی موج ہے اس لیے ساقی کے تغافل کی شکایت بے‌جا ہے کیونکہ اس کے تغافل سے ہماری بے خودی میں تو کمی ہو نہیں سکتی۔

ناقد:

کہتا ہے کہ ساقی اگر شراب نہیں دیتا ہے نہ دے۔ ہمیں اس کا کوئی گلہ نہیں اس لیے کہ ویسے تو شراب کی ہمیں ضرورت تھی نہیں۔ شراب بے خود ہونے کے لیے ہی پی جاتی ہے۔ اب

ہم از خود بے خود ہیں۔ تغافل سے بے خودی میں کمی یا عدم کمی کا کیا ذکر۔

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صبا کیا

شارح:

غالب کا یہ شعر باوجود سادہ ہونے کے کافی الجھا ہوا ہے۔ عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اس لیے عطر پیراہن کے معنی خوشبوے لباس کے ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیراہن مراد ہے؟ اپنا یا محبوب کا! بعض افراد نے خود غالب کا پیراہن قرار دیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباس یار مراد ہے اور غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہن محبوب کی خوشبو کو ادھر ادھر لیے پھرتی ہے اور ہم تک نہیں پہنچاتی تو ہم کو اس کا غم کیوں ہو جب خود ہم میں اس خوشبو سے لطف اٹھانے کی تاب نہیں۔

ناقد:

یہاں ساری خرابی ترکیب نحوی کے غلط استعمال کی وجہ سے ہوئی اور شعر کا پورا مفہوم غلط فہمی کی نذر ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ عطر پیراہن میں اضافت سادہ نہیں بلکہ اضافت مقلوب ہے اب یہ غالب کے لباس کی ضرورت ہے نہ یار کے لباس کی۔ عطر پیراہن ایک لفظ ہے یعنی وہ دماغ جو عطر کا پیراہن رکھتا ہے اور عطر و خوشبو کا خواہشمند ہے۔ باغ میں اگر صبا گھومتی پھرتی ہے اور آوارہ بن کر جو طرف پھولوں کی خوشبو پھیلا رہی ہے تو غم نہیں کیا۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

شارح:

جس طرح پانی کے ہر قطرہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں سمندر ہوں بیجا نہیں ہے اسی طرح ہم بھی اگر یہ دعویٰ کریں کہ ہم وہی (یعنی خدا) ہیں تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ہم بھی اسی ایک جزو ہیں۔

ناقد:

ہم نہ خدا ہیں نہ خدا کا جزو ہیں ، نہ غالب نے ایسا کہا ہے بلکہ یوں کہا ہے کہ ہم اس کے ہیں یعنی اس سے نسبت رکھتے ہیں۔ قطرہ انا البحر کہتا ہے کہا کرے ہم تو ایسا نہیں کہیں گے بلکہ یہی کہیں گے کہ ہم اس سے صرف نسبت رکھتے ہیں اور یہی بڑی چیز ہے۔ قطرہ کی طرف چھوٹا تھا کہ یوں بول اٹھا۔

اگر "اس سے" کے الفاظ ہوتے تو جزویت کے معنی نکل سکتے، "کے" ہمیشہ نسبتی ہوا کرتا ہے

پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدہ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

شارح :

ہماری شرم نارسائی الطاف خداوندی حاصل کرنے کے لیے صرف ایک ہی تحفہ رکھتی ہے اور وہ تحفہ اس دعوئ پارسائی کا ہے جو سو سو طرح سے خون آلود (ناکام) ہے۔

ناقد :

یہاں شعر کا مفہوم مطلق اور آزاد ہے۔ صرف ایک اصول بتایا جا رہا ہے۔ اپنی ہی شرم نارسائی کی تخصیص کی ضرورت نہیں۔ اصول یہ بیش کیا جا رہا ہے کہ شرم نارسائی یعنی کوتاہیوں اور گناہوں کی ندامت کریم کے دربار میں ایک تحفہ ہے۔ اسی اعتراف گناہ سے کریم کا کرم حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن دعوائے کسی پارسا کا دعوائے پارسائی آغشتہ بخوں ہے سو سو خرابیوں سے آلودہ ہے ایسی صورت میں کرم کی امید نہیں ہوسکتی۔ شارح نے شرم نارسائی کو مبتدا قرار دیا ہے اور تحفہ کو بدل منہ اور دوسرے پورے مصرع کو بدل۔

صورت حال یہ ہے کہ پہلا مصرع ایک الگ جملہ ہے اور دوسرا مصرع دوسرا جملہ ہے۔

تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

شارح :

زباں کی تمنا کا تقاضا یہ تھا کہ محبوب سے اپنی بے دست و پائی کا شکوہ کیا جائے لیکن جب اپنی بے زبانی ، مجبوری اور بے چارگی نے اس کی اجازت نہ دی تو محبوب کو خود رحم آگیا اس لیے ہم کو دراصل اپنی بے زبانی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو حصول مدعا کا سبب بنی۔

ناقد :

ہر شعر میں محبوب دخل انداز نہیں ہوا کرتا۔ بعض شعر بطور تعلیم اصول یا تنبیہ کے بھی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ بے دست و پائی کے شکوے کا تعلق محبوب سے نہیں ہوسکتا بلکہ اپنی قسمت سے ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس کا تعلق قسمت سے یا قدرت سے ہے۔ اگر محبوب سے ہو بھی تو یہ شکایت رفع کرنے کی محبوب کو قدرت ہے بھی کہاں کہ یہ کہا جائے کہ اس کو رحم آگیا۔ لیکن رحم آگیا تو پھر بتایا جائے کہ پھر محبوب نے کیا تیر مار لیا۔ اور پھر یہ کہ بے زبانی اجازت دینے کے موقف میں بھی کہاں ہے وہ تو تمنائے زباں سے ماؤف اور منفعل بنی ہوئی ہے غرض یہ کہ پورا مطلب غلط فہمی کی نذر ہے۔

تمنائے زباں سے مطلب ، بولنے کی تمنا ہے۔ بولنے کی تمنا تو محو اور وقف ہوگئی ہے بے زبانی اور خاموشی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ، اب بے دست و پائی کا شکوہ کرنے کے لیے فرصت اور موقع ہی کہاں رہا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ شکایت کا تقاضا یا جذبہ تو مٹا ، اگر زبان کھولنے کی آرزو اس طرح محو نہ ہوجاتی تو ہم شکر کی بجائے قسمت کی شکایت ہی کرتے رہتے۔

ہر شعر میں محبوب "میں تیرا مہمان،، کہہ کر دخیل کیوں ہو۔

گرنہ اندوہ شب فرقت بیاں ہوجائیگا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہوجائیگا

شارح :

دوسرے مصرع میں مہر دہاں کو مقدم اور داغ مہ کو موخر کر دیجیے تو مطلب صاف ہوجاتا ہے ۔ یعنی اگر شب فرقت کی تکلیف میں نے بیان نہ کی تو بھی میری یہ خاموشی (مہر دہاں) داغ مہ کی طرح سب پر آشکار ہوجائے گی ۔ مہر اور داغ کی مناسبت ظاہر ہے ۔

ناقد :

یہاں مطلب کو از راہ تکلف سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے مجبور ہونا پڑا کہ مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم بنائیں مگر اس سے بھی کام نہیں بنتا ۔

پہلا مصرع تو صاف ہے سمجھنا تو صرف دوسرے مصرع کو ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میں نے اندوہ شب فرقت بیان نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ بھی کہ میرے منہ پر مہر لگ گئی تھی اور وہ مہر داغ ماہ کی تھی یعنی شب فرقت میں جب میں چاند کو دیکھتا ہوں تو اس پر داغ دکھائی دیتے ہیں بہ شکل مہر ۔ یعنی چاند کے منہ پر بھی اندوہ دلی چھپانے کے لیے مہر لگ گئی ہے گو چاند مجھ کو بھی اندوہ دلی چھپانے کی تعلیم دے رہا ہے ۔ یہ وجہ ہے کہ میں اندوہ شب فرقت بیان نہیں کرسکتا اور مصلحت بھی اسی میں تھی کہ منہ پر مہر لگ جائے ورنہ راز دل ظاہر ہوجاتا جیسا کہ چاند کا اندوہ اور راز دل اب تک چھپا ہوا ہے ۔

یہ بالکل بیجا مطلب ہے کہ میری خاموشی داغ مہ کی طرح سب پر آشکار ہوجائے گی ۔ گویا یہ بات ہوئی کہ میں خاموش رہوں تو میری خاموشی سب پر ظاہر ہوجائے گی اور بیان کروں تو خاموشی آشکار نہ ہوگی جیسا کہ کسی مسخرے نے کہا تھا کہ

"حسمان تو زیر ابروان اند		دندان تو جملہ در دہان اند

زہرہ گر ایسا ھی شام ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتو مہتاب سیل خانماں ہوجائے گا

شارح :

اگر شام ہجر کی تکلیف میں پتا پانی ہوجاتا ہے تو عجب نہیں کہ پرتو مہتاب (چاندنی) بھی آب آب ہوجائے اور میرا گھر سیلاب میں ڈوب جائے ۔

ناقد :

شام ھجر میں اگر رونا اسی طرح آب آب ہونا رہے یعنی بے انتہا تکلیف پہنچتی رہے تو شام ھجر کی نہیں جاندنی، جیسے کہ سیلاب، سرے گھر کو تباہ کردے گی۔ ورنہ اے جناب! پتے کا پانی ہونا جو عموماً تمکن جاندنی نمون پانی پانی ہوجانے کہا اس کو بھی شام ھجر کی تکلیف پہنچتی تھی۔ تما مپ بھوٹ جاتا ہے اور اس کا زہر آگیں (پانی) بہ نکلتا ہے تو پھر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ مدعا یہ کہ اگر شام ھجر میں یہی اندوہ کا عالم رہا تو میرے پوری طرح برباد ہوئے بغیر دونی صورت نظر نہیں۔

گر نگاہ گرم فرماتی رہے تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہوجائے گا

شارح :

مفہوم یہ ہے کہ اگر میری نگاہ گرم (نظر عتاب) اسی طرح مجھے ضبط محبت پر مجبور کرتی رہی تو میرا خون میری رگوں میں بالکل اسی طرح نہاں ہوجائے گا جیسے خس میں شعلہ پنہاں ہوتا ہے۔ (خس میں شعلے کا پنہاں رہنا اس لیے تصور کیا گیا کہ خس میں جل جانے کی اہلیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے)۔

ناقد :

نہاں شاعر نے پہلے مصرع میں عمومیت رکھی ہے نہ کہ خصوصیت۔ اسی خصوصیت کے گمان نے شارح کو، مجھے، کا لفظ بڑھانے پر مجبور کیا اسی طرح پر بنائے غلط شرط کی جزا یہ قرار دی ہے کہ خون رگ میں نہاں ہوجائے گا اور 'جیسے' کے حرف تشبیہ کو مشبہ بہ شعلہ خس کو بنا لیا گیا ہے۔ اگر یہ نسخہ درست ہوسکتی تو صرف تشبیہ کا محل شعلہ سے پہلے ہونا ضروری تھا۔ اس پر غور نہ کرنے کے سبب سارا مفہوم زیر و بالا ہو گیا۔ اگر شعر کی نثر بنالی جاتی تو کتنی آسانی سے مطلب سمجھ میں آجاتا یعنی — اگر نگاہ گرم یوں ہی تعلیم ضبط فرماتی رہے تو شعلے بھی خس میں نہاں ہونے لگیں گے۔ یعنی جلانے پر بھی بھڑکیں گے نہیں، ایسے نہاں جیسے خون رگوں میں نہاں رہا کرتا ہے۔ اب نہاں سے خشک مراد لینے کی بھی ضرورت نہ رہی۔ نہاں کے معنی پوشیدہ کے ہوتے ہیں نہ کہ خشک کے اور پھر یہ کہ خون تو رگوں میں نہاں رہتا ہی ہے تو نہاں ہوجانے کی کیا بات ہوئی۔ شارح نے ''خون،، کو فاعل اور ''نہاں ہوجائے گا،، کو فعل بنایا ہے حالانکہ اس فعل کا فاعل خون نہیں شعلہ ہے۔

باقی آئندہ

لفظ بلوچ کی لغوی و تاریخی تحقیق

عبد الحلیم ابو الغانی

میں نے اپنے مقالہ "سبی" میں لکھا تھا (۱) کہ لفظ بلوچ مملکت شام کے حلب نامی علاقے کی رہنے والی ایک قدیم تاریخی قوم کے نام کی حیثیت سے ہمارے علم میں ہے (۲)۔ اور عربی تاریخوں میں یہ نام یوں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے (بلوص)۔ چونکہ عربی حروف تہجی میں حرف (چ) کی آواز نہیں ہے، اس لیے (بلوچ) کی جگہ (بلوص) پڑھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے (بلوص، بلوچ) ایک ہی قوم کے دو مترادف نام ہیں، اور یہی وہ قوم ہے جس کا نام بابل کی تاریخی یادداشتوں میں (بروسو) بیان کیا گیا ہے، جبکہ "آرامی پہلوی" میں یہی نام 'بروھو' پڑھا جاتا تھا۔

یہ باتیں میں نے متذکرہ بالا مقالہ میں کچھ اس سے زیادہ وضاحت، لیکن پھر بھی اختصار کے ساتھ، لکھی تھیں کیونکہ اس بحث میں مجھے ملکہ سبا کا مرکزی مقام اور اس کی قومیت پر تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نظر سے کچھ لکھنا تھا۔ بلوچی، براھوی قوم کے تاریخی پس منظر کے متعلق جو تاریخی معلومات اور تاریخی شہادتیں ہمارے پاس ہیں، اور ان میں جو ربط اور تسلسل ہے، ان پر ایک جداگانہ بحث کی ضرورت ہے، تاکہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔
آج کی صحبت میں ہم اس تاریخی موضوع کے صرف ایک پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ بلوچی اور براھوی اس ایک قوم کے دو مترادف مگر خالصۃً اصطلاحی نام ہیں نسلی اور نسبی نام نہیں ہیں۔ بحث کا دوسرا پہلو کہ نسب کے اعتبار سے یہ لوگ کون ہیں؟ اور قدیم تاریخی اقوام کی فہرست میں یہ لوگ کن کن ناموں سے یاد کیے گئے ہیں؟ اور ان کا سلسلہ نسب کن قدیم اقوام سے ملتا ہے؟ امید ہے اس پر کسی دوسری صحبت میں بحث کرسکیں۔

میں نے اپنے دوسرے دو مقالوں (باتنی) اور (بلوچی نقوش) میں اس بات پر بحث کی ہے (۳) کہ عبرانی حروف تہجی کا حرف (D) عربی حروف تہجی کے حرف (ص) کا مترادف ہے۔ اور چونکہ عبرانی

۱۔ اشاعت مجلہ اولس کوئٹہ بابت سال ۱۹۶۳ء
۲۔ تاریخ ڈیرہ غازی خان طبع ۱۸۷۸ء
۳۔ یہ دونوں مقالے بھی مجلہ اولس کوئٹہ میں شائع ہوچکے ہیں۔

حرف (D) کی آواز حقیقت میں پشتو حروف تہجی کے حرف (خ) ھی کی آواز ہے ۔ اور یہ کہ پشتون قوم کے علاوہ دنیا کی دوسری قومیں اس حرف کی صحیح آواز ادا کرنے پر قادر نہیں ھیں ۔ اس لیے عربی حروف تہجی میں اس عبرانی (پستو) حرف کی آواز کے لیے حروف (ص ، ث) اور لاطینی گرامر میں اس آواز کے لیے حرف (̃ڈ) استعمال کیا جاتا ہے(۱) ۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی اس حرف کی صحیح آواز نہیں ہے ۔

دوسری بات یہ کہ اس عبرانی حرف (D) کا تلفظ پشتو زبان میں حرف (چ) سے بھی کیا جاتا ہے ۔ کیونکہ پشتو میں علاقائی لہجوں کے اختلاف کی وجہ سے حروف (خ ح) ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کیے جاتے ھیں ۔ اس کی مثال یوں ہے ، جیسا کہ لاطینی حروف میں سے حرف (C) سے حروف (س ، چ ، ک) تینوں کی آوازیں لی جاتی ھیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کچھی ، اڑبا ، براھی ، بلوچی ، فارسی ، ارمڑی اور پشتو کے عام لہجہ کا لفظ بلوچ عربی زبان میں (بلوص ، بلوث) اور پشتو کے اپنے مخصوص لہجہ میں جو اس کا قدیم ترین "مغربی اراسی،، لہجہ ہے ، اور یہی مغربی اراسی لہجہ عبرانی زبان کا بھی ماخذ ہے بلکہ یوں سمجھیے دوسرا نام ہے ۔ اس میں اس لفظ کا تلفظ (بلوخ) کی شکلوں میں کیا جاتا ہے ۔ اس وضاحت کے پیش نظر اگر اسے رومن حروف میں لکھنا ھو تو اسے [illegible] لکھنا ھی زیادہ موزوں ھوگا ۔

جب یہ بات علم میں آگئی کہ عبرانی حرف (D) کو عربی حروف تہجی میں (ص ، ث) پڑھا گیا ہے ، تو یہ بھی معلوم ھونا چاہیے کہ (بلوص ، بلوث) حقیقت میں عربی لغت نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک "عبرانی،، لغت ہے ۔ اور اس لفظ کا مادہ یہ ہے [BLC = بلخ = بلص : בלץ]
اور عبرانی زبان کی لغات میں اس لفظ کے معنی حالت فعلی کے لحاظ سے دو طرح سے کیے گئے ھیں (۲)

(الف) ایک معنی وہ ھیں جو حالت فاعلی کے لحاظ سے کیے گئے ھیں ۔

(ب) اور دوسرے وہ ھیں جو حالت مفعولی کے لحاظ سے کیے گئے ھیں ۔

اگر (پعل) یعنی حالت فاعلی کے لحاظ سے لغت (بلح* ، بلچ) کا لغوی مفہوم مراد لیا جائے اور (پعل) یعنی حالت مفعولی کے لحاظ سے لغوی مفہوم مراد لیا جائے تو ان دونوں کے درمیان واضح فرق موجود ھوگا ۔ یہاں حل طلب سوال جو سامنے آرھا تھا وہ یہ تھا کہ جب ھم ایک قوم کو (بلوح ، بلوخ*) کے نام سے یاد کرتے ھیں تو کیا ھم کو لغت (بلوح*) کے لغوی معنی حالت فاعلی کے مطابق مراد لینے ھوں گے ، یا یہ کہ حالت مفعولی کے مطابق اس کا لغوی مفہوم مراد لیا جائے گا ۔ اس سلسلے میں بابل کے آشوری زبان کے لغت (بروشو) اور اراسی پہلوی زبان کے لغت (بروھو) نے ھماری

۱۔ عبرانی گرامر صفحہ نمبر ۳ طبع الہ آباد ۱۸۷۹ء ۔

*(نوٹ) عبرانی گرامر میں اس حرف کی آواز یوں ضبط کی گئی ہے (ST) اس لیے علامت کے طور پر اس (ST) کو مرکب شکل میں (̣ڈ) لکھا جاتا ہے ۔

۲۔ عبرانی لغات صفحہ نمبر ۱۷ طبع الہ آباد ۱۸۸۰ء ۔

رہنمائی کی تاکہ ہم پس منظر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرسکیں ، اور یہ دیکھیں کہ دو ہزار سال قبل مسیح کے بعد کی تاریخی قوموں کی سرگزشت کیا رہی ہے ، ان کو کن واقعات اور حادثات کا سامنا کرنا پڑا تھا ، عمرانیات کے اصول کے تحت ان کا عمل اور ردعمل کیا کچھ تھا ، اور تاریخ کے صفحات پر ان کے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کی نوعیت کیا رہی ہے ۔ اس مطالعہ سے ہمیں یہ آسانی ہاتھ آگئی کہ لغت [ب ل ص ، ب ل غ] کے ریشے سے بنائے گئے لغت (بلوخ ، بلوچ) کا لغوی مفہوم ہم کو حالت فاعلی کے مطابق مراد لینا ہو گا ۔ چونکہ لغت (بروہ) پر بحث کرنے سے لغت بلوچ کا مفہوم اور بھی زیادہ واضح ہوجاتا ہے ، اس لیے آگے چل کر ہم لفظ (بروہ) سے بھی اختصار کے ساتھ بحث کرنا مناسب سمجھتے ہیں(۱) ۔

پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ لغت (بلوچ*) کا مادہ لفظ (بلخ*) ہے ۔ عبرانی زبان میں لغت (ب ل ص ۔ ب ل خ* ۔ ب ل ج) کے معنی (پعیل) یعنی حالت فاعلی میں یوں ہیں : (ب ل خ* ۔۔ گھیرلینا ، روک لینا) جبکہ حرف (ب ل خ*) کے معنی ہیں کسی چیز پر ہاتھ ڈالنا ، کسی شخص کے بدن کو ستائش کرنے کے لیے اسے چھونا ، اس سے لگنا ۔ اصل مادہ کے اس لغوی مفہوم کی رو سے بلوخ* ، بلوچ کے معنی ہوجاتے ہیں ، گھیرنے والا ، روکنے والا ، مزاحم ہونے والا ، ہاتھ ڈالنے والا ، کسی پر چڑھ دوڑنے والا ۔ اگر غور سے کام لیا جائے تو موجودہ پشتو زبان میں آج بھی اس ریشے کے کئی الگ لغات موجود ہیں ۔ جن کی گردان یوں ہے :۔

بَلَخ ۔ بَلَج (بلخہ) بلخیدل بلخیږ اوبلخیدلہ ۔ اوبلخہ ۔ مہ بلخہ ۔ بلخی ۔ بلوخ ۔ بلوخیدنہ ۔ بلوخی ۔

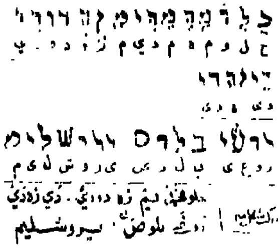
ترجمہ :(۱) کسی چیز کا کسی چیز سے لگنا (۲) گھیر لینا ، روک لینا (۳) مزاحمت(۴) وہ مزاحمت کرتا ہے (۵) وہ روکتا ہے (۶) اس نے روکا (۷) اس سے مزاحم ہو جاؤ (۸) مزاحمت مت کرنا (۹) مزاحمت نہیں کرنا (۱۰) مزاحمت کرنے والا (۱۱) مزاحمت پیشہ (۱۲) بلوچی ۔ پشتو زبان میں آج بھی بلوخہ* لڑائی جھگڑے اور حملہ کرنے کو کہا جاتا ہے ۔

حضرت سلیمان علیہ‌السلام کے صحیفے ''غزل الغزلات،، (نشید الانشاد) باب نمبر ۵ آیت نمبر ۱۶ میں بھی یہ لفظ (بلوخ*) ان ہی متذکرہ بالا معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحیفہ بائیبل کے مجموعہ میں شامل ہے ۔ اور باب نمبر ۵ کے درس نمبر ۱۶ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے ۔ اس میں حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا اسم گرامی صاف طور پر محمد ذکر کیا گیا ہے ۔ ہم افادہ عام کی خاطر اس

۱۔ لفظ بروہ سے ہم نے اپنے دوسرے مقالہ ''بروھی،، میں تفصیل سے بحث کی ہے اور بلوچی بروھی کے نسل اور نسب متعین کرنے کے لیے ہم نے ایک الگ مقالہ سری کے عنوان سے تحریر کیا ہے ۔

*نوٹ : جن الفاظ پر اسٹار بنا ہے وہ اس مضمون میں بار بار آئے ہیں ان کا صحیح املا اس صفحے کی ۱۶ ، ۱۷ کی گردان میں دیکھیے ، ٹائپ کی مجبوری کی بنا پر جگہ جگہ درج نہیں کیا جاسکا (ادارہ)

درس نمبر ۱۶ کے اصل عبرانی الفاظ اپنے عبرانی رسم الخط میں نقل کرتے ہیں۔ اس سے ایک دوسرا تاریخی فائدہ بھی حاصل ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس (عزل ، نشید) کے جو الفاظ عبرانی حروف تہجی میں لکھے ہوئے ہیں اگر یہی حروف عربی حروف تہجی میں حرف بہ حرف لکھے جائیں تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اس نشید کی زبان خالص اور سو فیصد عربی ہے۔ جس کا لہجہ خصوصیت کے ساتھ شمالی مغربی پاکستان کے مشہور قبیلے "آفریدی" کا ہے۔ یہ نشید موجودہ مجموعہ عہد نامہ عتیق میں عبرانی حروف تہجی میں یوں لکھا ہوا ہے۔



ترجمہ: حلوی (خدائی) کی قسم میں اسما محمد جیسے محمد۔ اور وہ ایسے ہیں جیسا کہ میں اور اسی کی تربیت سے اے (ملوص ، ملوح) لوگو! یعنی بیت المقدس کے رہنے والو! نبوت ، روحانیت اور معرفت کے موصوف یروشلم (بیت المقدس) میں آگئے ہیں۔

وضاحت:

(الف) عبری زبان میں حرف (ت) کی جگہ حرف (ح) کا تلفظ کیا جاتا ہے اس لیے بائیبل کے موجودہ حرف (ت) کا تلفظ حلو کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عبری زبان میں حرف (د) کو حرف (ل) سے تبدیل کیا جاتا ہے۔ جیسے (دس ، ا) کی جگہ (لس ، ا) وغیرہ اس لیے لفظ خدائی کو عبری کے مخصوص افریدی لہجہ میں آج بھی حلوئی پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ اگر لفظ خدائی بھی پڑھیں گے تو اپنے سبائی لہجے کے مطابق خدوئی پڑھتے ہیں۔

(ب) بائیبل کے پڑھنے والوں کو چونکہ عبری زبان کا علم نہیں ہوتا اور نہ یہ علم ہے کہ موجودہ عبری درحقیقت عبرانی زبان ہی کی بنیادی اور اصلی قدیم شکل ہے۔ اس لیے "خلو محمدیم" کے جملہ میں لفظ "یم" کے حرف (ی) کو مکسور پڑھنے کی بجائے ساکن پڑھکر (محمدیم) پڑھا کرتے ہیں۔ اور پھر اس کی عجیب و غریب تاویل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ جملہ بالکل صاف ہے۔ حضرت

۱۔ جناب قاضی سلمان منصور پوری نے اپنی تالیف رحمۃ للعالمین جلد نمبر ۱ حاشیہ صفحہ (طبع لاہور ۱۹۰۳ء) میں لفظ ... کو عربی حروف میں ملوب حروف (ب) سے ضبط کیا ہے اگرچہ ایسی ... تلفظ بھی درست ہے۔ لیکن جہاں تک عرب مورخین کا تعلق ہے وہ اس لفظ کو حرف (ص) سے (ملوص ...) لکھتے رہے ہیں (اثر افغانی) ... یہاں صفحہ ۲۶ کی سطر ۱۶ کا وہ لفظ دیکھیے جو بالا کے میں جلی ہے (ادارہ)

سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں خلو محمدیم (۱) ' (خدا کی قسم محمد میں ہوں) اور پھر خود اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ: (میں ایسا ہوں جیسے وہ ، اور وہ ایسے ہیں جیسے میں) ہیں میرے اور ان کے صفات اور تعلیمات ایک ہیں۔

(ج) اس درس میں بیت المقدس کے رہنے والے خصوصیت کے ساتھ (بلوص) کے نام سے یاد کیے گئے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ عبرانی زبان کے لغات میں لغت (ب ل ص) کے ایک معنی یہ بھی بتائے گئے ہیں (۲) (انجیروں کے باغوں کی باغبانی کرنا)۔ یہ معنی ابھی جگہ کچھ اس قدر کے ہیں کہ جس کا تعلق تاریخ سے ہے۔ جس کے سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر ڈالنا پڑے گی۔ واقعات یہ ہیں کہ عبرانی قوموں کی تاریخ میں (انجیروں کے باغات) اصطلاحی اعتبار سے دو معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں:

(۱) یہ کہ (انجیر پشتو لغت) (انجیر۔ اردو ، فارسی لغت) (انجیل۔ عبرانی لغت) ایک ایسا لفظ ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی کتابوں میں (روحانیت اور نبوت) کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور (انجیر ، انجیر ، انجیل) کے باغوں سے مراد نبوت اور روحانیت کی تعلیمات ہیں اور ان کی نگرانی اور باغبانی (ب ل ص) درجے کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ وہ فرد ، گروہ ، جماعت ، قوم ، جو روحانیت اور نبوت کی تعلیمات کے لیے (بلخہ*) کرنے والا ہو، یعنی آگے بڑھکر مزاحمت کرنے والا اور جہاد کرنے والا ہو۔ وہ چونکہ (بلخہ*) کر رہا ہے لہذا (بلوخ*) ہے ، مجاہد ہے ، لڑاکا ہے جنگجو ہے۔ اس اعتبار سے (بلوخ*) ایک اصطلاحی نام قرار پاتا ہے کہ جو لوگ یا فرد تعلیمات نبوت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو کر جہاد کرنے والے ہوں وہ بلوچ ، بلوخ* کہلاتے ہیں۔ اس اصطلاحی اعتبار سے جب (بلوچ کے معنی (محافظ دین) کے لیے جائیں گے اور دین سے مراد وہ تعلیمات لی جائیں جو توراۃ ، زبور ، اور صحیفہ' سلیمان کے ذریعہ ہدایت کے لیے نازل کی گئی تھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مندرجہ بالا درس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اس دین کی حفاظت کے لیے جہاد کرنے والے تھے۔ اور ان ہی کے سامنے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور آمد کی بشارت بیان کی جا رہی تھی تو اس پس منظر کی روشنی میں واضح ہوجاتا ہے کہ یہ لفظ بلوچ ایک ایسا اصطلاحی معنی اور اصطلاحی تعبیر ہے جو لفظ (بلخہ* جنگ) کے لغوی معنی میں من وجہ خصوصی پیدا کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ (بلخہ* ۔ ہاتھ لگانا ، لڑنا) اچھے اور برے دونوں مقاصد کے لیے ہوسکتا ہے۔ نیکی کے لیے (بلخہ* لڑائی) بھی بلخہ* ہے اور بدی کے لیے (بلخہ* لڑائی) بھی بلخہ* ہے لیکن یہ بلخہ* جب دین کی تعلیمات کی حفاظت کے لیے ہو تو ظاہر ہے کہ وہ جہاد ہے اور ایسا لڑنے والا مجاہد (بلوچ*) کہلاتا ہے۔ آگے چل کر ''تاریخی شہادت،، کے عنوان سے اس پر مزید بحث کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ مسوع لفظ 'سم' فارسی کے لفظ ہمسم ، ام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تلفظ دو طرح سے کیا جاتا ہے (یسم) حرف اول مکسور دوئم ساکن ، اور (سم) حرف اول موقوف دوئم ساکن یہ لغت (سم) دراصل عبرانی لغت ہے اور فارسی لفظ (ام) ارامی لغت ہے۔

۲۔ عبرانی گرامر صفحہ نمبر ۷۴ طبع الہ آباد ۱۸۰۹ء

۲) لفظ (ب ل ت ۔ ب ل ص) اور اس مادہ سے بنائے گئے لفظ بلوچ کے دوسرے معنی سمجھنے کے لیے ھمیں قرآن مجید اور توراۃ کی درج ذیل آیتوں کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ھوگی۔ قرآن مجید کی آیت ھے : والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین ○ مسلمان عالموں نے اس آیت کی مطبق توراۃ کی کتاب استسنا' سورت نمبر ۳۳ آیت نمبر ۲ سے کی ھے۔ اس آیت کے عبرانی الفاظ یہ ھیں :

ویوسر یھووہ مسیناتی بازراح مسعیر لامو ○ ھوپیع مھر پاران واتاءر ○ بیوت قودش میمنو ابنی داب لامو ○

اس آیت کے مندرجہ بالا الفاظ ھم نے موجودہ عہد نامہ عتیق کے عبرانی نسخہ کے مطابق نقل کئے ھیں۔ مگر پستو زبان کے صحیح تلفظ کے پیش نظر اس آیت کے کلمات چونکہ صحیح ترتیب اور ترکیب سے نہیں لکھے گئے ھیں اور بعض الفاظ و کلمات کو ایک دوسرے سے غلط ملا کر ان کے اصل مفہوم کو مسخ کردیا گیا ہے۔ اس لیے آیت کے الفاظ کو یوں پڑھنا چاھیے۔ ذیل میں ھم نے اس آیت کا ترجمہ بھی اس کی صحیح ترکیب اور انشا' کے مطابق کردیا ھے۔ آیت کے الفاظ ھیں :

وی وبر یھووہ ھم سیناتی با وزارہ م سعیر لامو ھو پیہ م ھورے پاران وانہ مری ب بوت قودش م ی منو ابنی دا خہ لامو ○

ترجمہ : (وی و) اور اس نے یہ کہا (مر۔ مری) اے سرزمین (۱) عرب کے رھنے والو (یھو) خداوند عالم ھو (یھو نو ایک) ھے (وہ) ھی تھا جس نے (ھم) بزرگی بخشی (۲) (سیناتی) طورسینا (۳) کو (با) پھر (وزارہ) دھیان دیکر نگاہ ڈالنے والا بھیج دیگا (م) طرف سے (شعیر) کوہ سعیر کے (لا) اور اس کے

۱۔ سرزمین عرب کا قدیمی نام مری ھے۔ اس اعتبار سے اسے مری اسھل اور مری استھان بھی کہا گیا ھے اور اس جغرافیائی حطہ کے رھنے والوں کو مری، مورو، سورہ، ماروتا بھی کہا گیا ھے۔ بلوچ قوم کا ایک قدیم نام مری بھی ھے۔ جس کی طرف مختصراً اشارہ آگے چلکر آجائے گا۔

۲۔ لفظ ھم کے معنی ھیں بزرگی پستو میں یہ لفظ اب بھی اسی معنی میں مستعمل ھے میاں نرمہ داد ابن اخوند رونزہ کا ایک شعر ھے :

۳۔ عبرانی زبان کے اپنے اصلی لہجے میں حرف (س) غیرمنقوطہ کی آواز نہیں ھے۔ اس لیے سیناتی کو سیناتی، قدس کو قودش اور سعیر (سرات) کو شعیر پڑھا گیا ھے۔

الف یو کڑہ لہ میمہ 		ودے دوارو معنی ھم

الف اور میم ایک جان لو۔ ان دونوں کے معنی بزرگی کے ھیں۔ لفظ ابراھیم میں بھی ایک جزو ھم بزرگی کے معنی ھیں۔

بعد ابھی (مو)(۱) تم نے (ھو) بمعنی ''ھاں،، کہنا ھوگا۔ تصدیق کرنا اور مان لینا ھوگا (پیہ) اس محبوب پیغمبر کو جو چاند سے زیادہ خوبصورت ھے (پیہ۔ محبوب۔ چاند) (م) تم سے کہتا ھوں کہ یہ پیہ (ھر۔ ھورے) بمعنی ''وھاں،، سے جس جگہ کا نام (پاران) فاران ھے۔(وانہ) (واتہ۔ وتل۔ معنی نکلنا) یعنی مبعوث ھوگا۔ (مری) اور ھاں یہ پاران وھی ھے جوکہ سرزمین عرب میں ھے۔(ب) (اس لفظ کے لغوی معنی ''پھر،، اور ''لے جائے گا،، دونوں ھیں) یعنی اس کے بعد خداوند عالم اسے لے جائے گا۔(قودش) (قدس) یعنی بیت المقدس تک۔(م) تم سمجھ لو (ی) یہ ایک بات (منو) جان کر ''مان لو،، کہ (انشر) انسنا ، ابشل ، ویش یعنی تقسیم اور بانٹا جانا ھے۔ خدا کی رحمتوں ، آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کا یہ جو بیان کیا جا رھا ھے (دا) (اس) پیغمبر جو کہ پیہ ھے (خہ*) (حہ* ۔ یٹ تک۔ پاس) تک جب ان تعلیمات کا سلسلہ پہنچ جائے گا تو اس پر آن کر یہ سلسلہ (لاسو) آخر اور ''اختتام،، تک پہنچ جائے گا۔ یعنی وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی، ایس ، تقسیم کا جو سلسلہ جاری ھے وہ پاران سے جلوہ گر ھونے والے محبوب پیغمبر پر آن کر ختم ھوجائے گا۔ وہ خاتم الانبیا ھوگا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ھے۔(ورنہ توارت کی اس آیت میں اس کا ذکر بھی کیا جاتا۔ جیسا کہ سینائی ، قودش اور پاران سے آنے والوں کا ذکر کیا گیا ھے) پشتو اور عبرانی میں (لم) آخر کو کہا جاتا ھے۔ اس اعتبار سے لامو وہ جو لم میں یعنی سب سے آخر میں آنے والا ھو۔ علم تفسیر اور تاریخ کے عالموں کی رائے یہ ھے کہ قرآن مجید اور توراۃ دونوں میں :

(الف) سینا سے آنے والے سے اور اس جملہ سے کہ '' جس نے بزرگی بخشی طور سینا کو،، مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ھیں۔ تورات کے الفاظ ھیں (یھووہ ھم تسینائی) ''وہ ایک خدا ھی تھا جس نے بزرگی بخشی دی طور سینا کو،، اور قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی متعدد آیات میں طور سینا کو اس بزرگی بخشی دیے جانے کی پوری تفصیل بیان کی گئی ھے کہ طور سینا پر تجلی ھوتی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی طور سینا پر پیغمبری اور تورات کی الواح عطا کی گئیں اور کلام الٰہی سے مشرف کیا گیا۔

(ب) قرآن مجید کے والتین والزیتون سے وہ علاقہ مراد ھے جو تورات میں (ب وزارہ م شعیر) کے الفاظ میں یاد کیا گیا ھے۔ اس تطبیق کی وجہ یہ بیان کی گئی ھے کہ کوہ شعیر کا پہاڑی علاقہ ھی وہ علاقہ ھے جہاں (تین) اور (زیتون) کے باغات ھیں۔ اور اس علاقے سے (وزارح وزارہ) کرنے والے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ھیں۔ عبرانی زبان میں (زارنہ) کرنے کے معنی ھیں ، دھیان دیکر کسی چیز پر نگاہ رکھنا۔ اس مادہ سے (زرے ، زرنی) وغیرہ متعدد لغات آج بھی پشتو زبان میں مستعمل ھیں۔ خداوند عالم کی صفت ''رقیب،، جو معنی رکھتا ھے وھی معنی عبرانی پشتو لغت (زریے) کے ھیں۔

۱۔ پشتو میں اس لفظ کا دونوں طرح (مو ، م) تلفظ کیا جاتا ھے۔ جو اردو کے الفاظ ''آپ،، اور ''تم،، کے مترادف ھیں۔ پشتو کے یہ دونوں لغات جمع مخاطب کے معنی میں استعمال کیے جاتے ھیں۔ جیسا کہ تورات کی اس آیت میں بھی جمع کے معنی میں استعمال کیے گئے ھیں۔

(ج) اور باران کی چوٹیوں کے ساتھ (سری) کا لفظ استعمال کرکے اس کے جغرافیائی محل وقوع کو متعین کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ باران کے نام سے ایک جگہ صحرائے سینا میں بھی ہے(۱)۔ اور یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ باران سری اسنھان (عرب) میں ہے۔ اس سری والے باران سے (واتہ) چونکیں چمکنے والے اور مبعوث ہونے والے اور چاند جیسے جلوہ گر ہونے والے سے ہو (بہ) محبوب اور خوبصورت ہے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی باران ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں "ھذا البلد الامین" کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا تاریخی پس منظر کی روشنی میں اس اعتبار سے کہ یروشلم کے آس پاس کوہ سعیر کا علاقہ وہ سر زمین ہے جہاں انجیر کے باغات تھے اور (ب ل و ص ۔ بلوچ) کے یہ معنی بتائے گئے ہیں: انجیروں کے باغات کی رکھوالی کرنے والے تو اس اعتبار سے لفظ بلوچ کے یہ معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ "اس قوم کے لوگ جو سر زمین یروشلم میں انجیروں کے باغات کے مالک تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے (۹۵۰ ق م) میں یہاں خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے اور ساتھ ہی اس تعبیر کے لازمی معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ "بلوچ" وہ لوگ تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے (۱۴۵۰-۱۵۵۰ ق م) میں کوہ شعیر کی سر زمین پر آباد تھے۔ ان کی تمام زندگی (بلوخہ*) یعنی لڑائی اور جھگڑے کی تھی اور روحانیت اور نبوت کے عالم اور میراث کے محافظ تھے اور حفاظت کے مقصد کے لیے جہاد کرنے والے بھی تھے۔ اور مندرجہ بالا دونوں تعبیروں کی رو سے بلوچ اور بلوچی تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ۱۴۵۰-۱۵۵۰ق م میں سری کہلائے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ ۹۵۰ ق م میں بلوچ کہلائے۔ جبکہ سری ان کا جغرافیائی(۲) نام اور بلوچی ان کا اصطلاحی نام ہے، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ سوال کہ اس سری اور بلوچ قوم کے لوگ نسل اور نسب کے اعتبار سے قدیم تاریخی اقوام میں کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ اس پر ہم کسی دوسری صحبت میں تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ ہماری موجودہ بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ بلوچی ایک اصطلاحی نام ہے نسبی نام نہیں ہے۔

ایک نکتہ:

توراۃ کی مندرجہ بالا آیت کا سب سے پہلا جملہ ہم یوں ضبط تحریر میں لائے ہیں (وی وسر) اس کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ پشتو زبان کے مختلف لہجوں میں آج بھی یہ جملہ درج ذیل تین شکلوں میں پڑھا جاتا ہے۔(۱) (وی وسر (سر)) (۲) (وی ذسری) (۳) (وی و ذوسر (ذوسر)) اور ان تینوں جملوں کا ایک ہی مفہوم ہے جس کا اردو ترجمہ ہے: (کہا اس نے سری) لفظ سری، سر ... اس

۱۔ سابق بلوچستان میں بھی ایک جگہ کا نام "ساران" ہے جس کا تعلق ۸۵۹ ق م سے ہے۔

۲۔ توراۃ میں ان لوگوں کو سری کہہ کر مخاطب کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سری لوگ بنی اسرائیل نہیں تھے۔ کیونکہ انہی بنی اسرائیل کے لوگ سری استھان میں آباد نہیں ہوئے تھے۔

کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے کہ یہ پشتون قوم کا تکیہ کلام بن گیا ہے ۔ البتہ (مر ، مری) کی جگہ (وی و ذوسر ، ذوسر ، ذوسر) کا استعمال تاریخی اعتبار سے ان پشتون قبائل کا لہجہ ہے جو کہ نسلاً بنی اسرائیل سے ہیں، بلکہ قحطانی اور بنی اسماعیل ہیں ۔ اور بنی اسماعیل میں بھی ذیلی شاخوں کیداری ، کندہ سے تعلق رکھنے ہیں جن کی زندگی کا پچھلا دور جنوبی عرب میں گزرا تھا اور سبائی اقوام سے ان کا زیادہ میل جول رہا ہے لفظ (ذوسر . ذوسر) میں کلمہ دو مطلقاً سبائی لغت ہے(۱) ۔ جس کے لغوی معنی ہیں ''صاحب،، مالک ، اور اصطلاحاً بادشاہ کے مفہوم کے لیے بولا جاتا ہے ۔ (ذوسر عرب کے بادشاہ) ایک ایسا محاورہ ہے جیسا کہ پنجاب میں تعظیم کے لیے کلمہ (ساھو) استعمال کیا جاتا تھا ۔ یا افغانستان کے ادب اظہار احترام کے لیے ناموں کے ساتھ (شاغلے = سہزادہ) استعمال کرتے ہیں ۔ سر زمین عرب کی حکمرانی بنی کندہ میں رہی ہے اور موجودہ افغانوں میں کند اور ذوسد نسل ہی کے لوگ (ذوسر) کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۔ چنانچہ ان ہی اعتبارات کی وجہ سے ہم نے لکھا کہ (وی و سر) خالص پشتو جملہ ہے اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ پشتو اور عبرانی ایک ہی زبان کے دو مترادف نام ہیں ۔ جن کا قدیم ترین نام ''مغربی ارامی،، ہے ''مغربی ارامی ،، زبان کو عبرانی اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ عبر (ھود علیہ السلام) کی نسل کے لوگوں کی مخصوص زبان تھی اور اس زبان کو ''مغربی ارامی،، اس اعتبار سے کہا گیا تھا کہ یہ ''عادارم،، کی نسل کے ان لوگوں کی زبان تھی جو مغرب کی طرف ارام (سطح مرتفع) پر آباد تھے اور وہاں مورث اعلیٰ (عاد) کی ذیلی شاخ (ارم) کی نسل کے لوگوں کے ساتھ (عاد) کی دوسری ذیلی شاخوں کے لوگ مثلاً اربخشد کی نسل کی ذیلی شاخ شال شالاً، (صالح ع) کی نسل کی ذیلی شاخ (عبر ۔ ھود) کی نسل کے عبرانی اور ھوڈی لوگ بھی آباد تھے ۔ ان سب کی زبان ''مغربی ارامی،، کہلاتی تھی ۔ (شرق اردن اور شام مشرقی ارام اور شمالی ارام کے علاقے تھے) حضرت ابراھیم علیہ السلام نسلاً عبرانی اور ھوڈی تھے ۔ مغربی ارام کے رہنے والے تھے ۔ لہذا آپ کی زبان ''مغربی ارامی،، تھی(۲) ۔ صحیفہ ابراھیم ، توریت ، زبور اور انجیل (کا اپنا اصلی نسخہ جو انجیل مقدسہ کے نام سے موسوم تھا اور اب نایبد ہے) یہ سب ''مغربی ارامی،، زبان میں تھے(۳) ۔ اسی ''مغربی ارامی،، زبان کا اپنا عبرانی نام عبرانی زبان کی رو سے ''پشتو،، ہے ۔ عبرانی زبان میں پشن ، پشت کے معنی ہیں مغرب (۴) سنسکرت زبان کا لفظ پچھم اسی عبرانی لغت پس کا پراچی تلفظ ہے ۔ اس اعتبار سے لفظ پشتو کے لغوی معنی ہیں (مغربی پچھمی) وہ زبان جو (مغرب = پشن ۔ پچھم) کی طرف (ارام) یعنی سطح مرتفع کے علاقہ میں بولی جاتی تھی ۔ وہ اپنے سمت (مغرب) اور جغرافیائی محل وقوع (ارام) دونوں کے لحاظ سے (مغربی ارامی) کہلائی ''پشتو زبان،، کی رو سے لفظ (اوستا) اور لفظ (ارام) دونوں کے لغوی معنی ایک ہیں (سطح مرتفع) ، اس اعتبار سے (ارامی) اور (اوستا) دونوں مترادف الفاظ ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں یہی ''مغربی ارامی،، زبان ہے جو کہ اپنی سمت (مغرب) کے لحاظ سے (پشتو) کہلاتی ہے اور اپنے جغرافیائی محل وقوع کے

۱،۲۔ بحوالہ ارض القرآن از سید سلیمان ندوی ۔

۳۔ بحوالہ ''تاریخ صحف سماوی،، صفحہ ۱۱۰ طبع کراچی ۔

۴۔ تاریخ ایران از سر جان مالکم طبع ایران صفحہ ۷ ۔

لحاظ سے (اوستا) کہلاتی ہے۔ اس وضاحت کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ چونکہ پشتو اور اوستا مغربی ارامی زبان کے دو روپ ہیں اس لیے علم فقہ اللغت کی رو سے پشتو اور اوستا دونوں کی تصریف اور اشتقاقات ایک جیسے ہیں (۱)۔ کلدانیہ ارام ہی کا ایک حصہ ہے۔ وہاں ایک تاریخی زبان کلدانی بھی ہے۔ جس کی اہم شاخ مندیک ہے۔ اگرچہ مندیک پر ارامی اثرات کافی سے زیادہ ہیں۔ کلدانی اور ارامی کی تصریف اور اشتقاقات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پشتو اور اوستا (زند) میں۔ ارامی اور کلدانی دونوں سے ایک دوسری زبان نکلی ہے جسے پہلوی کہا گیا ہے۔ اس کے دو روپ ہیں، کلدانی پہلوی اور ارامی پہلوی۔ موجودہ فارسی زبان کے متعلق مسلم کیا گیا ہے کہ اس کی بنیاد پہلوی زبان پر ہے(۲)۔ دوسرے لفظوں میں پہلوی زبان "مغربی ارامی" کی کلدانی اور ارامی دونوں شکلوں کی وارث تھی اور اسی سے فارسی نے جنم لیا ہے۔ اس کے یہ بھی معنی لیے جاسکتے ہیں کہ موجودہ فارسی کے ماخذ دو ہیں پشتو اور اوستا اور یہ دونوں اس قوم کی زبانیں ہیں جو عادارم کی نسل کے اعتبار سے جاٹ اور ثمودی تھے۔ عادارم حشد کی نسل کے اعتبار سے سالا، سال تھے۔ عبرانی، ھودی تھے، براھمی اور سبانی تھے اور جغرافیائی اعتبار سے ارامی اور پشتون تھے۔ اسی تفصیل کے پیش نظر ہم نے کہا کہ عبرانی اور پشتو دونوں ایک ہی زبان کے دو مترادف نام ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ پشتو زبان میں بھی لفظ بلوچ کے جو معنی ہیں وہ وہی معنی ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفہ "غزل الغزلات" اور "نشید الانشاد" میں مراد لیے گئے ہیں۔ اسی کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تورات اور غزل الغزلات کے لغات اور الفاظ کے وہی لغوی معنی صحیح قرار دینے چاہئیں جو پشتو زبان کے الفاظ کے لغوی معنی کے مطابق ہوں۔

تاریخی شہادت:

سطور مندرجہ بالا میں ہم نے لفظ بلوچ کا مادہ اور ریشہ لفظ بلج قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ عبرانی اور پشتو زبانوں کی رو سے اس لفظ کے لغوی معنی ہیں گھیرنا، پکڑنا، روکنا، مزاحم ہونا، ہاتھ ڈالنا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ خود بلوچ اور جاٹ قبائل لفظ بلج کن معنوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن اور اس سے ملحقہ علاقوں میں جہاں پشتون قوم کے قبائل میں سے سوری، سکون، لوھن، باہڑ، بہی، نتور، هور، پتخ، خیسور، اوسرانہ، گنڈا پور، لودھی، سروانی، کنڈی، ازمرہ، وزیری، مسود، بیٹنی، شیتک، منداں، مروت اور ان کے ساتھ دھیران جاٹ اور بلوچ اور پھر بلوچ قوم میں سے خصوصیت کے ساتھ کراچی، ھوت، قیصرانی، حسکانی او لشکرانی وغیرہ کے لوگ یہ تمام قبائل اور قومیں ایک ساتھ آباد تھیں وہاں ان سب لوگوں کے رسم، رواج بھی اور الفاظ و لغات بھی ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ ۱۸۷۸ء تک مندرجہ بالا قبائل و قوموں خصوصاً جاٹ اور بلوچ لوگوں میں لفظ بلوچ کے یہی لغوی معنی متعارف اور مستعمل تھے جو

۲،۱۔ تفصیل کے لیے دنشو ھارا و بھار از موسیو ڈارمسٹیٹر فرانسیسی طبع سنہ ۱۸۸۰ء۔

اوپر درج کیے گئے ہیں۔ ذیل میں جاٹ اور بلوچ لوگوں کے ایک دو ضرب المثل کہاوتیں درج کی جاتی ہیں جن میں لفظ بلچ مندرجہ بالا لغوی مفہوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان کہاوتوں کے تاریخی پس منظر بھی درج کیے جاتے ہیں جو کہ خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

الف :

''تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان،، میں نواب محمد خان سدوزائی ملتانی (متوفی ۱۲۳۲ھ) مورث اعلیٰ خاندان نوابان ڈیرہ اسماعیل خان کے عہد حکومت کے انتظامی قواعد کی تفصیل کے ضمن میں لکھا ہے(۱)۔

''ہر ایک موضع کے انتظامی افسر کا نام کراؤں تھا۔اور ہی دس کراوں پر ایک کراول ان کا افسر تھا۔ کراوی باہر گشت کرکے فصل کی نگرانی کرتے تھے۔باہمی معاملات کے واسطے جو رعایا اور عامل (کراؤں) کے درمیان ہوتے تھے۔اس موضع کے ایک دانا اور نیک چلن آدمی کو جس پر رعایا اور کاردار دونوں کا اعتماد ہوتا تھا ، مہر ملک مقرر کر لیتے تھے۔مہر رعایا کی عرضداشتیں کراول تک پہنچاتا تھا۔اور ہر بات میں رعایا کا خیر خواہ بنا رہتا تھا۔رعایا کے مفاد کے تحفظ کے لیے ہمیشہ کاردار سے جھگڑتا رہتا تھا۔جو حکم عامل کا ہوتا تھا سب رعایا کو اس سے مطلع کرتا اور تعمیل کراتا تھا۔غرض یہ کہ رعایا اور قوم کے تمام معاملات مہر (ملک) کی معرفت طے ہوتے تھے۔مہر رعایا کی طرف سے بمنزلہ مختار کے ہوتا تھا۔اگر مہر پر کسی معاملہ میں عامل (کاردار) کی طرف سے کوئی جرمانہ (چٹی) عائد ہوجاتا تھا تو اس چٹی کی ادائیگی رعایا کے ذمہ ہوتی تھی۔چنانچہ اس کے پیش نظر یہ کہاوت چلی آتی ہے : چٹی پئی مہریوں ، مہر بلچے شہرنو

اس کہاوت سے ظاہر ہے کہ جاٹ اور بلوچ قبائل کی اس ضرب المثل میں بھی لفظ بلچ اسی معنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔جس کے لیے پشتو اور عبرانی زبانیں بولنے والوں نے استعمال کیا ہے

ب

لفظ بلچ کے مندرجہ بالا مفہوم کے لیے استعمال کے سلسلہ میں ''تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان،، کا درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ کرنے کا ہے(۲)۔

صفحہ نمبر ۵۹ ''ذکر رسوم شادیانہ تولد طفل،،۔

''جاٹ اور بلوچوں میں دائی کو لڑکے کا باپ اپنے کاندھے کی چادر یا نقد ایک روپیہ اور دیگر محا اور چچیرے بھائیوں سے چار آنہ ، آٹھ آنہ غایت درجہ ایک روپیہ تک جو بھی وہ دیدیں مبارکباد

۱۔ تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان تالیف رائے بہادر منشی چرنجیت لعل صفحہ نمبر ۲۰ طبع لاہور ۱۸۷۸ء (پشاور میوزیم لائبریری)۔

۲۔ تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان از رائے بہادر منشی چرنجیت لعل صفحہ ۹۵ طبع لاہور ۱۸۷۸ء۔

کا ملتا ہے ..... جب بچہ سات دن کا ہوتا ہے تو اس کے سکم پر چار پانچ جگہ تھوڑا تھوڑا نشتر سے ٹکہ دے کر دو دفعہ خون نکلوانے ہیں۔ اس عمل کا نام بلچی ہے، کہتے ہیں کہ اس خون کے نکلنے سے لڑکا تندرست رہتا ہے۔ نائی (حجام) کو "ناجی،، کی بابت نیم پاؤ قند سیاہ اور سیر بھر آٹا دیتے ہیں،،۔

اس رسم کے مخصوص اصطلاحی نام سے بھی ظاہر ہے کہ لفظ بلچ مندرجہ بالا معنی ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ان دونوں تاریخی شہادتوں کے پیش نظر جو رائے ہم نے شروع میں ظاہر کی ہے کہ بلوچی ایک اصطلاحی نام ہے، نسبی نام نہیں ہے، اس سے ہماری اس رائے کی تائید ہوجاتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ جاٹ اور بلوچ لوگوں نے بھی لفظ بلچ کو اپنی کہاوت میں (پھبل) یعنی حالت فاعلی کے مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے۔ بلوچ وہ جو بلچی کرنے والا ہے۔ اور مخصوص رسم کے اصطلاحی نام کی صورت میں (پھل) یعنی حالت مفعولی کے مفہوم کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بلوچ وہ جو بلچی کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ واقعات اور حقائق کی روشنی میں ہمارے اس تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کو دلچسپی سے ملاحظہ کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں مزید تاریخی شہادتیں اور دلائل ہم نے اپنے دوسرے مقالہ بروھی میں پیش کی ہیں۔ امید ہے کہ "اردو نامہ،، کی کسی دوسری اشاعت میں ملاحظہ کی جاسکیں۔

مثنوی "نور علیٰ نور"

ایک نامکمل اور غیر مطبوعہ مثنوی

عظمیٰ مشرف علی

نواب مرزا سراج الدین احمد خان سائل دہلوی ، اپنے وقت کے ایک نامور مگر گمنام شاعر تھے ۔ نامور اس لیے کہ اپنے زمانے میں انہیں ہر وہ شخص جانتا تھا ، جس کا دلی سے یا اردو زبان سے کوئی تعلق تھا ۔ اور گمنام یوں کہ آج کی ادبی دنیا میں بہت ہی کم لوگ ان کی ادبی حیثیت سے واقف ہیں ۔

مثنوی "نورعلیٰ نور" سائل کی نامکمل مثنوی کا عنوان ہے ۔ موضوع اس داستان کا نور جہاں اور جہانگیر کی داستان عشق ہے ، اور نور الدین سلیم اور نور جہاں کے ناموں کی مناسبت ہی سے اس کا عنوان "نورعلیٰ نور" رکھا گیا ہے ۔ اگرچہ یہ داستان نامکمل رہ گئی ہے پھر بھی اس کے اشعار کی تعداد آٹھ ہزار چھ سو تیس ہے ۔

کہانی کی ابتدا شہنشاہ اکبر کی ، درگاہ حضرت سلیم چشتیؒ پر حاضری اور اولاد نرینہ کے لیے دعا مانگنے سے ہوتی ہے ۔ اسی زمانے میں ایران کا ایک باعزت خاندان ہجرت کرکے وارد ہندوستان ہوتا ہے اور شاہ ایران کی سفارش سے کنبہ کا سرپرست مرزا غیاث بیگ دربار اکبری میں بار پاکر فیض یاب ہوتا ہے ۔ غیاث مرزا کی دختر کہ جس کا نام مہر النسا ہے اپنی والدہ عصمت آرا کے ہمراہ محل میں بانوئے شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور بادشاہ بیگم کو اس سے اس درجہ انس ہوجاتا ہے کہ وہ بچی کو بیشتر اپنے ہی پاس رکھتی ہے ۔ محل ہی میں سلیم کی ملاقات مہر سے ہوتی ہے اور بات بڑھ جاتی ہے ، ابوالفضل وزیر جو بادشاہ کا بہت منہ چڑھا ہے اور تمام احکامات حکومت میں دخل رکھتا ہے ، اس کی بیوی کا بھی محل میں آنا جانا ہے ۔ وہ سلیم اور مہر کے میل ملاقات اور بانوئے شاہ کی مہر پر عنایات کا ذکر اپنے شوہر سے کرتی ہے ۔ تو وزیر باتدبیر کو یہ خطرہ لاحق ہوجاتا ہے کہ اگر یہ میل جول بڑھ گیا اور مہر النسا اکبر کی بہو بن گئی تو غیاث مرزا کا رتبہ دربار میں مجھ سے بڑھ جائے گا ۔ بادشاہ کے سمدھی کی حیثیت سے اس کا وقار زیادہ ہو جائے گا ۔ اب حکومت کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے ، حالات بدلے تو میرا اقتدار خطرہ میں پڑ جائے گا ۔ غرض ان اندیشوں کو مدنظر رکھ کر ابوالفضل بداندیش نے مہر اور سلیم میں جدائی ڈالنے کی فکر کی اور ایسا جال مکر و فریب کا پھیلایا کہ اکبر اور غیاث مرزا جیسے ذی فہم کو بھی پھانس لیا ۔ اپنی چالبازیوں سے کام لیکر شہزادہ سلیم کی شادی راجا مان سنگھ کی بیٹی مان بائی سے اور مہر النسا کی شادی بنگال کے صوبہ دار علی قلی خان سے کروادی ، مہر کے بیاہ کو سلیم سے پوشیدہ رکھا گیا ۔ جب شہزادے کو اس شادی کا علم ہوا تو اسے بہت ناگوار گزرا ، اور وہ باپ سے ناراض ہوکر بغیر کسی اطلاع کے پہلے اجمیر گیا اور اس کے بعد اس نے الہ آباد کو اپنا مسکن بنایا ۔

یہاں دارالحکومت میں بادشاہ بیگم کو ابوالفضل کی صورت سے نفرت ہوگئی ، بیٹے کی محبت بری چیز ہے جس نے اپنی جانبازوں سے آنکھوں کا نور جدا کروا دیا وہ کیسے بھلا معلوم ہوتا ، دربار میں تمام اراکین سلطنت ناخوش تھے ، سب کو سلیم کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس تھا ، یہاں تک کہ ابوالفضل کے بھائی ابوالفتح اور فیضی بھی کچھ خوش نہ تھے ، ہر شخص کو احساس تھا کہ ابوالفضل نے محض اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے یہ حرکت کی ہے ۔ ابوالفضل نے جب سارے زمانے کو خلاف دیکھا تو اکبر سے اجازت لے کر حیدر آباد دکن روانہ ہوگیا ، تاکہ اس کی غیر حاضری میں معاملہ رفع دفع ہوجائے اور بات دب جائے ۔

ادھر ابوالفضل ابھی تدبیروں میں مصروف تھا کہ اکبر اور سلیم میں نفاق بڑھے اور ادھر سلیم کے جاں نثار ساتھی جن میں راجپوت اور مغل سرداروں کے بیٹے اور سردار شامل تھے اور اس فکر میں تھے کہ کس طرح ابوالفضل کو اس حرکت نازیبا کا مزہ چکھائیں اور شہزادے کی مخالفت کرنے کی سزا دیں ، غرض راجا ریاب سنگھ ، راجا سہاب سنگھ اور دیگر احباب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ جب ابوالفضل دکن سے واپس لوٹے تو راستے میں اس کا کام تمام کر دیا جائے ، یہاں یہ صلاح مشورے تھے ۔ وہاں اکبر نے ابوالفضل کو واپس طلب کر لیا ۔ ایک وجہ اس طلبی کی امور سلطنت میں دشواری اور دوسری وجہ فیضی کی شدید علالت تھی ، شاہ کا فرمان دیکھ کر ابوالفضل فورا روانہ ہوجاتا ہے ۔ شہزادے کے ساتھی اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں کہ وہ زندگی سے تنگ آجاتا ہے . . . . یہاں پہنچ کر مثنوی نا تمام رہ جاتی ہے ۔

یہ ادھوری مثنوی آٹھ ہزار چھ سو تیس (۸۶۳۰) اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس کے ایک سو پندرہ ابواب ہیں ۔ ابواب کا تعین واقعات کی مناسبت سے کیا گیا ہے ۔ اگرچہ اس مثنوی کی بنیاد سلیم اور مہر النسا کی محبت کی داستان پر رکھی گئی ہے ، مگر اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کے دربار کی سیاسی چالوں اور ان کے توڑ میں شہزادے کے مصاحبوں کی کوششوں کی بڑی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔

کہانی میں شروع سے آخر تک ایک شاہانہ فضا قائم رہتی ہے ، چونکہ قصہ ایک ایسے بادشاہ کے عہد کا ہے ، بلکہ اس کی ذات سے متعلق ہے ، جو برصغیر ہندو پاک کا عظیم ترین بادشاہ تھا، اس وجہ سے افراد قصہ بھی سب کے سب ذی فہم و صاحب اقتدار ہیں ۔ اکبر کے درباری ، اس کی فوج کے سالار ، محل کے افراد سب ہی آداب محفل سے آشنا ، بات چیت میں باسلیقہ اور علم و فن میں یکتا ہیں ۔ اسی کی مناسبت سے مثنوی میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال بھی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ بیشتر الفاظ فارسی کے ہیں ۔ زبان وہی استعمال کی ہے جو رؤسا اور امرا کے طبقے کی مخصوص زبان ہے ۔ البتہ محل میں عورتوں کی بات چیت میں جہاں خواتین کو کسی مقام پر جذبات سے مغلوب دکھایا گیا ہے ، وہاں زبان بھی ویسی ہی برتی ہے کہ قاری کو یہ احساس ہو تا ہے کہ یہ عورت اگرچہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کی بیوی ، بہن یا کوئی اور عزیز

ہے مگر بالآخر عورت ہے ، جب اس پر غم و الم کی شدید کیفیت طاری ہوتی ہے ، جب کوئی اس کا دل دکھاتا ہے تو اس کے منہ سے بے ساختہ ایسے جملے نکلتے ہیں جن کی شدت میں محل شاہی کے آداب و احترام لرزاں نظر آتے ہیں ۔ مگر یہاں بھی بادشاہ کی بہن اور بیوی کی زبان میں اور اکبر کی دائی اماں اور مانی ماں کی زبان میں واضح فرق ملتا ہے ۔ مثلاً جب بادشاہ بیگم کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ سلیم کی ناراضگی کا سبب دراصل ابوالفضل کا پیدا کردہ ہے ، تو وہ اعلان کردیتی ہیں کہ اب تمام عمر ابوالفضل کی صورت نہ دیکھیں گی ، اور نہ اس مقام پر قیام کریں گی جو ابوالفضل کا مسکن ہوگا ۔ مگر اس کے برعکس جب مانی اماں کو ابوالفضل کی زیادتیوں کا علم ہوتا ہے تو ان کی ذات میں وہ ضبط و تحمل اور وقار برقرار نہیں رہتا ۔ جو بانوے شاہ کی صحبت میں رہ کر آگیا تھا اور یہ خبر ملتی ہے کہ بادشاہ بیگم ابوالفضل کی وجہ سے محل چھوڑ کر سیکری جارہی ہیں ، وہ بے اختیار کہہ اٹھتی ہیں

> یہ محل ہوجائے خالی ، نوج ہو	موت آئے ناگہانی شیخ کو
> پڑ گئے آیا ہی یہ جو اس کو نصیب	آنکھ نظارہ یہ دیکھے یہ عجیب

زبان کی یہ تلخی اور لہجے کی یہ تیزی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسی سے دو مختلف نمونے کرداروں کا فرق معلوم ہوتا ہے ، بادشاہ بیگم کے محل کی بانہایت ثقہ اور مستعمل بات جیت میں یہ دو جملے یکبارگی ایک ہل چل پیدا کر دیتے ہیں ۔

زبان کے بارے میں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کہانی میں جہاں ابوالفضل کو مصروف گفتگو دکھایا ہے ، وہاں اس کے علمی اور ادبی مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعر نے فارسی زبان کا زیادہ استعمال کیا ہے ۔ اس کے رقعے اور خطوط فارسی ہی میں ہیں ۔ یوں قاری ابوالفضل کے علم و فن کا بھی قائل ہوجاتا ہے ۔ شہنشاہ اکبر کی بات چیت میں اختصار ملحوظ رکھا ہے ، اس کا ہر جملہ جچا تلا اور ایک قطعی انداز کا حامل ہوتا ہے ۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے ، مثنوی میں شاعر کی توجہ اسرار و رموز سلطنت کی طرف زیادہ ہے ۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ (۸۶۳۰) اشعار میں سے بمشکل تمام ساٹھ ستر اشعار ایسے ہونگے جن میں مہر و سلیم کے تعلقات کا ذکر ہے ، اور ایسے اشعار تو شاید بیس بائیس سے زیادہ نہ ہوں گے جن میں دونوں کو آمنے سامنے مصروف گفتگو دکھایا گیا ہو ، باقی تمام اشعار افواج کی درجہ بندی ، علاقوں کے انتظام ، راجوں ، مہاراجوں ، نوابوں اور جاگیرداروں کے تعلقات باہمی اور سیاسی اتھل پتھل کے ساتھ ساتھ شاہ اور درباریوں کے تعلقات سے متعلق ہیں ۔ شاعر کو خود ان معاملات میں گہری دلچسپی معلوم ہوتی ہے ، کیونکہ جب وہ کسی ایسے منظر کو پیش کرتا ہے تو نسبۃً زیادہ تفصیل سے کام لیتا ہے ۔ مثلاً جب شہزادے کے رفیق مالوے کی طرف سے ابوالفضل کا راستہ روکتے ہیں تو اس کام کے لیے جو پلان انہوں نے بنایا ہے اس کا تذکرہ شاعر نے بہت عمدگی اور

تفصیل سے کیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو، یہاں پورن سنگھ راجکمار شہزادہ اپنے چچا کو تمام تفصیل بتا رہا ہے :

عرض اس نے کر دیا سب انتظام		جو معین جانے تھی جس جس کے نام
اس کا نقشہ کھینچ کر واضح کیا		یہ مثلث ہے حدود راہ کا
"جھیرا" یہ ہے اس جگہ سیلاب ہے		سر زمیں یہ پر عیون و آب ہے
اس کے آگے "آرنا" ہے سری جا		قلب راہیں ہیں یہاں سے انتہا
یہ محاذی زاویہ ہے سنگلاخ		اس سے جا ملتی ہے ہر رستے کی شاخ
یہ مقام راجہ والا جاہ ہے		پر خطر اس زاویہ تک راہ ہے
اس مثلث بیچ ہیرے ہے بن تمام		گونڈ بھیلوں کا یہاں ہے انتظام
بس ان میں کھونٹے سردار ہیں		جو نہایت منتظم ہشیار ہیں
ہے صوبی حد یہ ان کا بندوبست		چھاؤنی پر دس کی رہتی ہے نشست
قلب میں اس بن کے ہے گویی نگر		ہے یہاں ان کے گرو "راوت" کا گھر
اولس ہے زاویہ سہتاب کا		دوسرا ہے ساسنا سہراب کا
سر جو سوسوم ہے پرتاب سے		ہے جو ماہر جنگ کے ہر باب سے
بس کمک کے واسطے مامور ہوں		جتنا اس سے اسنا اس سے دور ہوں

اسی طرح دوسرے اہم مقامات وہ ہیں جہاں شاعر نے شہزادے کو مصروف شکار دکھایا ہے۔ یہاں بھی ببر سے لیکر مست ہاتھی اور ارنے بھینسے تک کا شکار کھیلا ہے۔ اور ہر شکار کی مفصل تفصیل دی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف خود ہر قسم کے شکار اور شکاری چالوں سے بخوبی واقف ہے، مثلاً جہاں ہرنوں کے شکار کا ذکر ہے وہاں ہرنوں کو پھانسنے کے مختلف طریقے یوں بیان کیے ہیں :

ہو گیا جب صبح صادق کا عمل		دور بیں لے پور ساہ بیٹھا سنبھل
دار ہرنوں کی نظر اک سمت آئی		جو قراول ساتھ تھے ان کو بتائی
گھات میں اپنی چلے یہ سب کے سب		یاد تھے ان کو گرفتاری کے ڈھب
کجریاں ڈالیں زمیں پر خار دار		تانت کے ٹکڑوں سے بستہ بے شمار
پھر دے کر لائے ہرنوں کو وہاں		جس جگہ پھیلا گئے تھے کجریاں
ان پہ جو منہہ ڈال دیتا تھا ہرن		خار سے تھا دوختہ کام و دہن
تانت کا ٹکڑا لٹکتا رہ گیا		تھا سرے میں جس کے اک تنکا بندھا
گھر سے اپنے رودہ جو کرتا جدا		گھر میں پھنس جاتا تھا تنکے کا سرا
ہوگئے یوں بیسوں آہو اسیر		بیچ کے جو نکلا ہوا آماج تیر
ایک دو صحرا میں جو آئے نظر		لی پلنگان شکاری نے خبر
تیر خوردہ ان میں جو کرتے تھے رم		دوڑ میں کتوں سے نکلا ان کا دم
جس پہ شہزادے نے دوڑایا سمند		اس کی گردن میں پڑی دیکھی کمند

اسی طرح شیر کے شکار، ہاتھی کے شکار، نیل گائے، جنگلی گائے اور ارنے بھینسے کے شکار کو بھی بڑی تفصیل و مہارت سے رقم کیا ہے ۔ ان سب کی مثالوں سے طول کلام کا اندیشہ ہے اس لیے محض ہرن کے شکار کی مثال پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

اس مثنوی کے تمام کردار کم و بیش ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں یعنی طبقۂ خواص سے . . . . اکبر بادشاہ سے لیکر اس کے محل کے ادنیٰ خادم تک ایک خاص تہذیب کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ لونڈیاں باندیاں بھی ادب آداب ملحوظ رکھتی ہیں محل کے اندر ایک پر وقار اور سنجیدہ ماحول ہے جو لکھنو کے محلاتی ماحول کے بالکل برعکس ہے ۔ یہ اکبر بادشاہ کا محل ہے ۔ یہاں کی کنیزیں باوقار شخصیت کی مالک ہیں ۔ یہ واجد علی شاہ کا محل نہیں کہ کھوکھلے قہقہوں اور عیش و طرب کے نغموں سے محل کے در و بام گونج رہے ہیں ۔ اکبر کے محل میں اگر سلیم اور مہر النسا کی ملاقات ہوتی بھی ہے تو اس طرح جیسے نہیں ہوتی ۔ سلیم شہزادہ ہے ، ولی عہد ہندوستان ہے ، اسے اپنے مرتبہ کا احساس ہے ۔ ایک ذی عقل و شعور شہزادے کی محبت میں اور ایک عام انسان کی محبت میں فرق ہوتا ہے ۔ سلیم نے محبت کی ہے مگر بچپن سے محتاط رہنے کی جو تربیت اسے ملی ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہ ہو جس سے اس کی ذات پر حرف آئے اور مہر کی بدنامی ہو، وہ فطرۃً دور اندیش ہے ، بچپن میں مہرالنساؔ کو اپنے کھلونے دیتا ہے مگر خود نہیں بلکہ ماں کی وساطت سے دیتا ہے اور وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ۔

مہر کو دیجیے یہ اپنے نام سے	خوش وہ ہوگی آپ کے انعام سے
میں اگر دوں گا تو وہ شرمائے گی	ایک منہ سے بات سو سو جائے گی

شہزادے کے مزاج کی خوبی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی جاتی ہے اور سلیم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالفضل کی کارستانی ہے ، تو باوجود شدید غم و غصہ کے اس کا شاہانہ مزاج اسے ضبط و صبر کی تلقین کرتا ہے اور وہ خاموشی سے مصلحت وقت کو پیش نظر رکھ کر دارالخلافہ سے ٹل جاتا ہے ۔ وہ نیک نیت اور نیک نفس ہے ۔ اسے اس شخص سے عناد نہیں جو مہر کو بیاہ کر لے جاتا ہے ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اچھی چیز سب کو پیاری ہوتی ہے اگر علی قلی خاں کو مہر النسا مل رہی ہے تو وہ کیوں انکار کرتا ، یہی بات وہ اپنے دوستوں سے یوں کہتا ہے :

مہر و مرزا کی ہے اس میں کیا خطا	شیخ نے فتنہ کیا ہے یہ بپا
اک خزانہ حسن کا جس کو ملے	لینے والا کیوں نہ اس نعمت کو لے
اس میں کچھ اس کی نہیں تھی جدوکد	وہ تو اس تحریک کو کرتا تھا رد
مطلقاً اس سے نہیں مجھ کو ملال	معصیت ہے یہ رقیبانہ خیال
خارج از مبحث ہے یہ تقریب سب	وہ نہیں آزار خاطر کا سبب

اگرچہ شہزادہ اصل قصور وار ابوالفضل کو ٹھہراتا ہے، مگر اس کی نیک نیتی کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے :

جس سے پہنچا ہے مجھے رنج و گزند — اس کی بابت بھی ہیں مرے ہونٹ بند

شہزادے کی نیک سیرتی کی ایک اور مثال وہ ہے جب اسے ابوالفضل کی مزید سازش کا علم ہوتا ہے، جس کے تحت وہ سلیم کی جگہ سلیم کے بیٹے خسرو کو ولی عہد بنانے کا منصوبہ بناتا ہے، تب بھی سلیم خاموش رہتا ہے اور یہ خاموشی اس کی مصلحت اندیش طبیعت کا خاصہ ہے ۔

سلیم کے بعد دوسرا اہم کردار ابوالفضل کا ہے، وہی اس قصہ کا اہم ترین کردار ہے، ہر مقام پر قصہ اسی کی سازش اور چالوں کی مدد سے آگے بڑھتا ہے ۔ وہ فطرةً چالاک اور چالباز ہے، یہاں تک کہ جان کے خوف سے حیدر آباد دکن تو چلا جاتا ہے مگر اس کی شر پسند طبیعت وہاں بھی اسے بےچین رکھتی ہے اور وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا، بلکہ باپ کو بیٹے کے خلاف اکساتا ہے اور سلیم کو تخت و تاج سے محروم کرنے کے منصوبے بناتا ہے ۔ اکبر کو اس امر کے لیے یوں تیار کرتا ہے :

گر نبیرہ دے خداوند نوال — لال کا ہو جائے گا پھر کم خیال
اس کے نانا کو بنا کر پاسدار — جانشیں اپنا اسے دیجیے قرار
دوست جن کو جانتا ہے اب سلیم — ناموافق ہونگے وہ بے خوف و بیم
آنکھ کا تارا اسے جانیں گے سب — شاہزادہ خود بخود جائے گا دب
نیاز (کذا) بن جائے گا اس کا عجب و ناز — سرکشی سے خود کرے گا احتراز
تیور اپنے اس سے رکھیے سہ کڑے — کام دیں گے یہ کڑے تیور بڑے
حق مساوی باپ بیٹے کا نہیں — بس یوں ہی حضرت رہیں جس ر جس
آپ کی آزردگی کا مدعا — اس کے حق میں ہوگی اخلاقی سزا

ابوالفضل کی عیاری کی ایک اور مثال وہ ہے جہاں وہ علی قلی خان کی والدہ کو بلاتا ہے ۔ اس موقع پر شاعر نے اسی کے منہ سے اس کی عیاری کا ثبوت مہیا کیا ہے، ابوالفضل اپنی بیوی سے کہتا ہے :

کہہ رکھا تھا اہلیہ سے شیخ نے — پہلے اس سے عندیہ نسبت کا لے
جب توجہ اس کی پائے اس طرف — پھر لگائے اس کے چونڈے پر کلف
کرکے پردہ گھر میں بلوالے مجھے — تننے ہیں مکڑی کے سے جالے مجھے
پھانس لونگا اس کو میں مثل مگس — پھر مجال اس کی نہیں جائے اکس

تیسرا کردار اکبر بادشاہ کا ہے، ہند کا یہ والی بہت ہٹ دھرم اور سخت گیر طبیعت رکھتا ہے، ایک مرتبہ جو بات منہ سے نکل گئی پتھر کی لکیر ہوگئی، بڑے بڑے سلاطین ایسے ہی مزاج ہوا کرتے تھے ۔ اکبر کے کردار میں یہ صفت ہر جگہ واضح ہے ۔ اگرچہ ...

سے اپنی طبیعت بھی ملول ہے ، اور بادشاہ بیگم کا حال بھی ناگفتہ بہ ہے ، مگر شاہی وقار یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ :

وہ نہ باز آئیے گا اپنی بات سے — آبرو کو کون کھوئے ہات سے
میری جانب سے طلب بہتر نہیں — مجھ کو اس کے آنے کا باور نہیں
سانپ سال سے دائی اماں سے کہو — سادو سے تحریک استرضا کرو
جس کو چاہیں بھیجیں وہ نزد سلیم — تم لڑاؤ کوئی حکمت ہو حکیم
میں نے تو چپاتی پہ پتھر دھر لیا — یہ بذات خود تہیہ کر لیا
آئیے گا جب سامنے میرے سلیم — کچھ سزا دوں گا میں باللہ لعظیم

ایک مقام پر ابوالفضل اکبر کو یہ احساس دلاتا ہے ، کہ تمام درباری اور محل اس سے کشیدہ اور ناراض ہیں اور اس کی عزت و آبرو خطرے میں ہے ۔ وہاں اکبر اپنے رفیق کی بات سنکر ایک مختصر مگر با معنی جملہ کہتا ہے :

سن کے شاہنشاہ نے پاسخ دیا — دیکھتا ہوں رنگ میں ایک ایک کا

یہ بات مفصل بھی کہی جاسکتی تھی، مگر اکبر جیسے کردار کے لیے اختصار زیادہ بہتر، مناسب اور پر اثر ہے ۔

ایک اور کردار اکبر کے دودھ شریک بھائی کا ہے ، دودھ کی شرکت بہت بڑی عظمت کی حامل ہوتی ہے ، اکبر کا دودھ شریک اتنا ھی رعب و دبدبہ رکھتا ہے ، جتنا کہ اکبر کا ماں جایا رکھ سکتا ہے ۔ اسی مناسبت سے اس کے کردار کی تخلیق میں شاعر نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہ کردار کسی سے دب کر بات نہ کرے ، یہاں تک کہ اکبر کے روبرو بھی صاف صاف بات کرتا ہے ۔ اکبر کے درباریوں میں سب سے زیادہ بے باک دودھ شریک بھائی ہے ، جہاں اسے اکبر کی رائے سے اختلاف ہوتا ہے ، وہ صاف کہہ دیتا ہے ، مثلاً جب سلیم اور اکبر کی ٹھنتی ہے ، تو وہ سلیم کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو تسلیم کرتا ہے کہ جب اکبر اسے سلیم کو لانے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے تو وہ اس انداز سے جواب دیتا ہے :

در جواب اس نے کہا اے شہر یار — گرچہ حضرت کا ہے مجھ پر اعتبار
ایسی خدمت سے مجھے رکھیے معاف — جو ہو طبع شاہزادہ کے خلاف
گر ہوا وہ خواب میں مامور غیب — تو سرے جانے سے نکلے گا یہ عیب
مجھ سے پوچھے گا وہ حال عقد سب — کیا جواب اس کا میں دے سکتا ہوں جب
کیجیے تجویز ایسا نامہ دار — ہو جو مثل شیخ زادہ ہوشیار
ہر سخن میں جس کے ہوں مکاریاں — اہل ایسی خدمتوں کا میں کہاں
جاں نثاری کے لیے حاضر ہوں میں — چھل فریبوں کی جگہ قاصر ہوں میں
جو نہ ہوگا میرے بل بوتے کا کام — دور سے کرلوں گا اس کو میں سلام
میں نہ دوں گا ، دو کو دھوکا تاحیات — آپ سے ، اس سے ، کروں گا صاف بات
آپ کی اولاد میرا نونہال — اس سے مکاری کروں میں کیا مجال

اس مثنوی میں زنانہ کردار کسی خاص خصوصیت کے حامل نہیں ہیں ، نہ ایسے ماحول کے کردار ہیں جہاں ادب ، آداب اور اخلاقیات کو بڑا دخل تھا ، یہ پردہ دار بیویاں تھیں ، محض گھریلو معاملات تک ان کی حدود کار تھی ، سلطنت کے کاموں میں ان کا کوئی دخل نہ تھا ، اور نہ ان کی رائے پر اکبر جیسا خود پرست اور خود شناس بادشاہ غور کرنے کو تیار تھا ۔

مہر النسا کا کردار بھی ایک ایسی مظلوم لڑکی کا کردار ہے جو اپنا راز دل کسی سے نہیں کہہ سکتی ، جیسے اس کی مرضی کے خلاف بیاہ دیا جاتا ہے ، اور وہ چپ چاپ والدین کی عزت رکھنے کی خاطر آگرے سے بنگال سدھار جاتی ہے ، وہ ولی عہد ہند کی منظور نظر ہوتے ہوئے بھی بے بس و مجبور ہے ۔

ان کرداروں کے علاوہ سائل کی مثنوی میں ایک تیسری قسم کے کردار بھی ہیں ، یہ ان بھیلوں کے کردار ہیں جو مالوے کے پہاڑی علاقے کے بسنے والے ہیں اور راجا پرتاپ سنگھ کے ماتحت ہیں ۔ یہ لوگ کسی سے بھی نہیں ڈرتے ، ابوالفضل کو بھی صاف صاف جواب دیتے ہیں ، یہ بے خوف لوگ موت کو بھی اک کھیل سمجھتے ہیں ۔ مثال کے طور پر وہ مقام جہاں ابوالفضل مالوے کے پہاڑی راستے میں مقیم ہے اور چاہتا ہے کہ وہاں کے کھونٹیئے اسے کسی محفوظ راستے سے شمالی ہند پہنچنے میں مدد دیں ، اس کام کے لیے وہ مقامی باشندوں کی مدد کا خواہاں ہوتا ہے ، کہ وہ اس کا پیغام کھونٹیئے تک پہنچا دیں ، اور کھونٹیئے کا جواب اسے لا دیں ، کھونٹیئے کی طرف سے جو جواب آتا ہے ، وہ مقامی لوگوں کے کردار کی سچی تصویر ہے ۔

عرض کی یہ شیخ کو کر کے سلام کھونٹیئے نے سن کے حضرت کا پیام
یہ دیا ہے صاف تر اس نے جواب اپنا رستہ آپ کر لیں انتخاب
بند رستہ آپ پر کوئی نہیں لیکن اس کا آپ کر رکھیں یقیں
ہم سے رکھیے گا نہ امید مدد حق میں اپنے نیک ہو یا ہو وہ بد
ہم نہ دیں گے آپ کو اگوا کوئی بے اجازت راجہ والا جاہ کی

کھونٹیئے کا جواب سن کر ابوالفضل جب یہ کہتا ہے کہ پہاڑیوں کے رہنے والے امور سلطنت کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے ، تو دونوں بھیل صاف کہتے ہیں ، کہ تم کو اپنی فہم و فراست پہ بہت ناز ہے ، مگر شہزادے کے ساتھی اتنے جری اور بہادر ہیں کہ اگر وہ تمہاری دشمنی پر تل گئے تو :

پھر نہ آنے کی نظر حضرت کی خیر وہ بری ساعت ہے جب بڑھتے ہیں بیر
بیر میں بٹتے نہیں ہیں پھول پان آبرو پر بنتی ہے ، جاتی ہے جان
آپ کو کرنا ہے اب کیا انتظار دشمنی تو ہو چکی ہے استوار
اب تو ہونے کو ہیں تیغیں بے نیام اب تو پوچھا جائے گا حضرت کا نام

اب سو بھنے کو ہے دریا حون کا | اب تو ہو رجپوت ہو گا چون کا
آھن و فولاد کا بن جائے گا | سامنے تلوار لے کر آئے گا
بیسیوں کی جان بر بن جائے گی | سینکڑوں کی سوت ناحق آئے گی
کھونٹیئے کی یاد کرکے موعظت | آپ چلتے ہوں گے سوئے آخرت
آخرت میں حال کیا ہے آپ کا | اس سے واقف ہو گی ذات کبریا

یہ مالوے کے غیر ترقی یافتہ علاقے کے لوگوں کی صاف گوئی اور بہادری کی مثال ہے کہ وہ لوگ بادشاہ وقت کے خاص منہ چڑھے مصاحب کے سامنے دب کر بات کرنا اپنی بہادری کی شان کے خلاف تصور کرتے تھے۔

اس مثنوی میں منظر نگاری پر شاعر نے کوئی خاص توجہ نہیں دی ، مناظر کا بیان اس انداز میں کیا ہے کہ وہ بے جان اور بے اثر سے ہمارے سامنے آتے ہیں اور کہانی کے تاثر میں کوئی اضافہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں ، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی تمام تر توجہ زبان اور پلاٹ کی ترتیب پر تھی ، اسی وجہ سے منظر نگاری کے علاوہ جذبات نگاری نیز محاکات نگاری کی بھی کوئی عمدہ مثال پیش نہیں کرسکے۔

چونکہ یہ مثنوی نامکمل ہے اس لیے اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا نامناسب ہے۔

اردو کی پہلی کتاب

(حصہ اول تا چہارم)

مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخی تصنیف

پہلی ، دوسری ، تیسری اور چوتھی چاروں حصص پر مشتمل یہ وہی کتاب ہے جس کی ایک زمانے میں تمام ابتدائی مدارس پر حکومت تھی۔ اس سلسلے کے مطالعے سے اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے اپنے دور میں بڑے بڑے ادیب ، شاعر ، مورخ ، عالم اور محقق بن کر ابھرے آج بھی اس کتاب کی افادیت اتنی ہی مسلم ہے۔ بورڈ کی ایما پر جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے بڑی تحقیق اور کاوش سے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے جو قابل قدر ہے۔

ترقی اردو بورڈ اردو منزل جمشید روڈ کراچی - ۵ سے طلب فرمائیں۔

قیمت (ہر چہار حصہ ، یک جلد) ۹ روپے

زبان اردو

ایران ، پاکستان اور ترکی کے علم و دانش کا مشترک سرمایہ

آقائی علی اکبر جعفری ایرانی

(فارسی سے ترجمہ)

سات دریاؤں والی پرانی سرزمین جسے رگ وید میں ''سپت سندھو'' کے نام سے اور اوستا میں ''ہپت ھندو'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے ، پانچ ہزار سال پہلے ہڑپا کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی ، آج بھی سرزمین مغربی پاکستان ہے ۔ کوئی زبان ، اردو سے بہتر پاکستانیوں ، ایرانیوں اور ترکوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ معاونت اور باہمی ربط و ضبط پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں ہوسکتی اردو زبان پاکستان کی عوامی اور مروجہ زبان ہے اور برصغیر پاک و ہند کے تس کروڑ انسانوں اور ایشیا و افریقہ کے بہت سے ساحلی علاقوں میں رائج ہے ۔

یہ زبان اس قدر لچک دار ہے کہ زمانۂ دراز سے بلکہ شہنشاہان مغول کے زوال سے پہلے نہ صرف اس سر زمین کے لوگوں نے اس کو اپنی مادری زبان کی طرح قبول کیا تھا ، بلکہ ترکوں ، ایرانیوں اور بعد میں آنے والے شاہان مغول نے دل و جان سے اپنی زبان کو ترک کرکے اس زبان کو جو ان کی باہمی معاونت کا ثمرہ تھی اس کے بہترین تراش و خراش کی وجہ سے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا تھا ۔ بہر حال اردو گزشتہ زمانے میں بھی اور اب بھی ان کی مشترکہ ثقافت اور تہذیب کا نتیجہ ہے ، یا ہم اسے اس سے بہتر طریقہ پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ زبان ہماری مشترک ثقافت و تہذیب کا ماحصل ہے ۔

اردو ، جیسا کہ اس کا ترکی نام ظاہر کرتا ہے کہ وہ شاہان مغول کے لشکر یا اس سے بہتر طریقہ پر کہا جائے کہ برصغیر پاک و ہند کے تیموریوں کے لشکر کا نام تھا ۔ وسیع ترین شاہی لشکر کی چھاؤنی ، سر زمین ترک اور سطح مرتفع ایران اور برصغیر پاک و ہند اور خاندان شاہی ، درباریوں ، سپاہیوں ، خدمت گاروں ، حرم شاہی اور مختلف طبقات کے میل جول کے لیے شائستہ ترین مقام تھی ، یہ بات بہ آسانی معلوم کی جاسکتی ہے کہ یہاں (چھاؤنی میں) مختلف زبانوں میں بات چیت کی جاتی تھی ، ان لوگوں کے باہمی اختلاط و آمیزش ، مستحکم رشتے ، جوش خروش کی وجہ سے ایک نئی ملت اور نئی زبان ، جس میں ترکی زبان کی تیزی و روانی اور جاذبیت ، اور فارسی کی شیرینی اور اسلوب پائے جاتے تھے ، اور جس میں مقامی لہجہ کی صورت اور روح بھی برقرار تھی ظہور پذیر ہوئی ، جس قدر زمانہ گزرتا گیا ، یہ زبان عمیق تر ، شیریں تر اور عمدہ تر ہوتی گئی ۔

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو اس قدر نئی زبان نہیں ہے کہ ہم اسے تیموریوں کے لشکر کی بنائی ہوئی زبان کہیں ، اس میں شک نہیں کہ اس زبان کی تشکیل تیموریوں کے لشکر میں ہوئی۔ اسی وجہ سے ہم نے اس کو کہ بہ لشکر میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے نشو و نما پائی ، اردو نام دیا ہے۔ لیکن اس زبان کی پیدائش کے آغاز کا سلسلہ ۷۱۲ ب م تک پہنچتا ہے ، جب کہ ۹۲ سال ہجرت نبوی سے گزر چکے تھے ، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں نے سندھ کو فتح کیا تھا اور فاتح و مفتوح کو افہام و تفہیم کے لیے ایک نئی زبان ، عرب و ایران و ہند کی زبانوں کے اختلاط سے تخلیق کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔

لیکن اس زبان نے صحیح شکل و صورت محمود غزنوی کے حملوں کے وقت ۱۰۰۱ م میں اختیار کی ، اور اس زبان کی راہیں لوگوں پر سطح مرتفع کے رہنے والے ایرانیوں نے کھولیں کہ وہ مختلف زبانوں اور لہجوں ایرانی اور ترکی میں گفتگو کرتے تھے اور زبان فارسی ان کے درمیان قابل شمار حد تک وسیلۂ ارتباط تھی۔

ایک دلکش نکتہ جسے مجھے یہاں بیان کر دینا چاہیے ، وہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ترک فرمانرواؤں کے خاندانوں اور ترکی ادیبوں نے فارسی کے رواج دینے اور اس کے پھیلانے میں بڑی کوشش کی ہے ، چنانچہ نہ صرف محمود ترکوں میں سے تھا بلکہ عظیم ترین شعرا جیسے کہ امیر خسرو اور غالب بھی انھی میں سے تھے۔ یہ تینوں اپنی ان شاندار خدمات کی وجہ سے جو انھوں نے فارسی ادب کی انجام دی ہیں نام آور اور مشہور ہیں ، اگر چہ ان تینوں میں سے پہلا شخص اردو سے دور کا رشتہ رکھتا ہے ، لیکن دوسرے شخص (امیر خسرو) کو اردو کا موسس ، اور تیسرے شخص (غالب) کو اردو کا پھیلانے والا مانا گیا ہے۔ پاکستانیوں اور ترکوں نے بھی فارسی کی گراں قدر خدمات کی ہیں۔ اسی طرح ایرانیوں نے بھی ترکی اور اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان تینوں کے درمیان ایک عجیب ہم آہنگی ہے ، جو خود ان کی برادرانہ معاونت سے پیدا ہوئی ہے ، اور جس نے ایک مشترک تہذیب و تمدن کے پیدا کرنے اور جنم دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مغرب سے پے در پے ہجوم کر کے آنے والی موجوں نے نہ صرف اس زبان کو تیز تر کر دیا ، بلکہ اردو کی فرمانروائی کے کنارے کو دریائے گنگا تک پہنچا دیا ، یہاں تک کہ چودھویں صدی میلادی میں دکن میں ایک گروہ اردو زبان کا پھیلانے والا پیدا ہوا اور دکن نے اس کے بعد اس زبان کے پھیلانے اور اس کے آگے بڑھانے میں ایک موثر کردار ادا کیا ہے ، اس زبان کے ادبیات کو بار آور کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ، اسے قدیم زمانے میں "ریختہ" کہتے تھے ، جس کا آغاز بارھویں صدی میں ہوا ، اس زمانے میں فارسی کے عظیم المرتبت شاعر مسعود سعد سلمان نے اردو میں شعر کہے ، اس کے دو صدی کے بعد امیر خسرو دہلوی نے ایک نئی آب و تاب فارسی اور اردو کو بخشی۔ اس مبارک آغاز کے بعد بہت جلد نوبت یہاں تک پہنچی کہ سترھویں اور انیسویں صدی کے درمیان بعض عظیم الشان شاعر جیسا کہ میر ، سودا ، مصحفی ، انشا اور انیس اور دوسرے غیر معمولی شاعر پیدا ہوئے۔

اگرچہ اس سے پہلے چودھویں صدی میں نثر میں زبان اردو کے نوشتے ھفت اسرار کے نام سے موجود ھیں ، جو حضرت خواجہ بندہ نواز دکنی کے ھاتھ کے لکھے ھوئے ھیں ، لیکن سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے جو مسلمانان ھند کے جلیل القدر رھنماؤں میں سے وہ شخص تھے جنھوں نے اردو کو اس قدر طاقتور بنایا کہ وہ اس ترقی یافتہ دنیا کے تقاضوں کے مطابق تیزی سے آگے بڑھ سکے ، اردو نے اسی طرح اپنے خصائص شعری کو بھی محفوظ رکھتے ھوئے ایک نئی دنیا میں قدم رکھا ھے جو حقائق سے مملو ھے۔ حالی ، آزاد ، شاعر اور فلسفی بزرگ علامہ اقبال لاھوری (کذا) اسی دور سے تعلق رکھتے ھیں ۔ مولوی عبد الحق ، سید سلیمان ندوی ان لوگوں میں سے ھیں ، جنھوں نے کوشش کی ھے کہ اردو کو اسی نہج پر پھیلائیں ، جس نہج اور اسلوب پر سر سید احمد خان چاھتے تھے کہ زبان کو اس ڈگر پر ڈالکر ایک عمدہ زبان بنائیں ۔ ۱۹۴۸ء میں آزادی پاکستان کی بنیاد اس پر رکھی گئی کہ اردو اس نئی مملکت کی سرکاری زبان ھوگی ، اس نکتہ نے اس زبان کو نئی طاقت اور نئی توانائی بخشی ، اور کار کردگی کی نئی صلاحیتیں عطا کیں ۔

پاکستانی دانشور خواہ وہ قدیم مکتبہ خیال کے ھوں یا جدید کے یا وہ نو مشق ھوں انھوں نے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی ھے ۔ وہ سب کے سب تیزی سے اس زبان کو آگے بڑھانے کی فکر میں ھیں ، اور اس کوشش میں لگے ھوئے ھیں کہ وہ اس زبان کو جلد از جلد ایسی زبان بنا دیں جو ایک سرکاری زبان کے تقاضوں کو زیادہ سے زیادہ پورا کرسکے ، تاکہ اس کا بلند و شائستہ مقام فوراً اسے حاصل ھوسکے اور اس میں روانی و تیزی آجائے ۔

اس جگہ مجھے اس کا اعتراف کر لینا چاھیے کہ میں نے اس زبان کی تاریخ کا سرسری اور غیر مرتب جائزہ لیا ھے ، اور بہت سے لطیف نکتے نظر انداز کر دیئے ھیں ، اور بہت سی دلچسپ باتیں اور نقوش جو اس زبان کی نشو و نما میں ترکوں ، ایرانیوں اور برصغیر پاک و ھند کے لوگوں خصوصاً پاکستانیوں نے چھوڑے ھیں ، میں نے انھیں ترک کردیا ھے ۔ اس مختصر مضمون میں جب بھی میں اس زبان کی لغت ، اس کے اصول ، معانی و بیان ، اس کے لہجے اور الف بے تے ، اس کے اسلوب اس کے شعری اور نثری نوشتوں پر نظر ڈالتا ھوں تو مجھے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ وہ فارسی الفاظ سے بھر پور ھے ، اس کے مطالعہ سے پہلی نظر میں اندازہ ھوتا ھے کہ یہ زبان اس تہذیب و ثقافت کے سرچشموں سے وابستہ ھے جن سے فارسی زبان سیراب ھوکر کمال کو پہنچی ھے ، ان دونوں زبانوں میں سے ایک کمال کو پہنچ چکی ھے ، اور دوسری کمال کے راستے پر تیزی سے گامزن ھے ، شعری ادب میں یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے اس درجہ قریب ھیں کہ بسا اوقات یہ امتیاز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ شعر فارسی کا ھے یا اردو کا ، ھمارے اس دعوے کی تصدیق کے لیے اقبال ، حفیظ ، جوش اور دوسرے اردو شعرا کا کلام اس پر بہترین گواہ ھے ۔ اس دعوے پر مزید بہترین دلیل پاکستان کا قومی نغمہ ھے کہ جسے فارسی بھی کہا جاسکتا ھے اور اردو بھی ، اور فی الواقع وہ فارسی بھی ھے اور اردو بھی اور اس کے بالعکس بھی ۔

اس کے علاوہ اردو کے جاننے کی وجہ سے ہمیں فارسی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے ، جب ہم زبان کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نے اپنے بہت سے الفاظ و اصطلاحات کو متروک کر دیا ہے ، اور وہ چند صدیوں قبل ہم ان کے مفہوم کو فراموش کرچکے ہیں ، اس موقع پر اردو ہماری مدد کرتی ہے ، اس لیے کہ اردو ان الفاظ کے پرانے مفہوم کو محفوظ کیے ہوئے ہے ۔ اردو نہ صرف پرانی فارسی کے متون کے سمجھنے میں مفید ہے بلکہ پہلوی اور پازند کے سمجھنے میں بھی نہایت کار آمد ہے ۔ اسی طرح اردو نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فارسی الفاظ سے بہترین اصطلاحات وضع کی ہیں ، جنہیں آج فارسی کو اردو سے قرض لینا چاہیے اور رواج دینا چاہیے ۔ اس سے بڑھ کر مسرت اور خوشی کی بات کون سی ہوسکتی ہے کہ اردو کے اس نئے درخت نے فارسی کے پرانے درخت سے جو کچھ لیا ہے اس میں بہترین اضافے کیے ہیں ، اسی طرح فارسی بھی اردو کے لیے ایک ایسا سرچشمہ ہے کہ وہ اس سے جو چاہے قرض لے کر بے نیاز ہوجائے ۔ اگر ایران کے دانشور آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھائیں تو اس قسم کے باہمی لین دین سے دونوں زبانوں میں ایک گراں بہا اضافہ کرسکتے ہیں ، اور اپنے کلام سے زبان کو زیبا تر اور پسندیدہ تر بنا سکتے ہیں ۔

یہ ہے ماحصل ہماری اس مشترک ثقافت اور تہذیب کا ، جو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے ہاتھوں اس قدر گراں قدر ہوکر پھیلی ہے ۔

ہماری علمی اور ثقافتی میراث کا یہ ماحصل (جیسا کہ بتایا گیا ہے) پاکستان کے شگفتہ لوگوں کی شگفتہ و شاداب زبان ہے ، بلکہ پاکستان کی سرکاری زبان ہے ، اور اس منزل میں ہے کہ جو آہستہ آہستہ مستقبل قریب میں انگریزی کی جگہ لے رہی ہے ۔ اردو کا مستقبل تابناک ہے اور یہ تابناک مستقبل اس کے شایان شان ہے ۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے پاکستانی بھائیوں کو اچھی طرح پہچاننے اور ان سے زیادہ نزدیک ہونے کے لیے اپنی اس مشترکہ میراث کو پھیلائیں اور رواج دیں ، اور اردو کو ترکی اور ایران کی یونیورسٹیوں میں اس کا مناسب مقام ملنے کی جد و جہد کریں ۔

تہران یونیورسٹی میں اگرچہ اردو کی تعلیم دی جارہی ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں اور لسانیات کے کالجوں میں بھی اردو کی تعلیم دی جائے گی ۔

اردو ، ترک ، پاکستان اور ایران کی گزشتہ معاونت اور تعلقات کی بہترین یادگار ہے ، اور ہماری تمنا اور خواہش ہے کہ گزشتہ زمانے کی باہمی معاونت کا یہ شاہکار موجودہ زمانے میں بھی زیادہ سے زیادہ ترقی کرے ، تاکہ بہترین ثمرات ظہور پذیر ہوں ۔

دیوان ولی کا ایک نادر قلمی نسخہ

محمد اکرام حقانی

یوں تو دیوان ولی کے قلمی نسخے پاک و ہند کے تقریباً ہر کتب خانے میں موجود ہیں لیکن جس قلمی نسخہ کا ہم اس مختصر سے مقالہ میں تعارف کرا رہے ہیں وہ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر تمام دیگر قلمی نسخوں کے مقابلہ میں اپنی ایک علیحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ دیوان ولی کا یہ قلمی نسخہ طرز املا، رسم الخط اور سن کتابت کی قدامت کی وجہ سے اہم نہیں بلکہ یہ نسخہ ان معلومات کی وجہ سے قابل قدر ہے جو اس کے حاشیہ نگار نے ولی کے احباب، تلامذہ یا دیگر اشخاص (خصوصاً جن کا ذکر کلام ولی میں موجود ہے) کے سوانح کے متعلق دیوان کے حواشی پر درج کی ہیں۔ حاشیہ نگار اصل کاتب کے علاوہ کوئی اور شخص ہے۔ ان معلومات کے علاوہ حاشیہ نگار نے ولی کے اشعار کی اصلاح بھی کی ہے اور ولی کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی حواشی پر درج کیا ہے۔ ایسی خصوصیات کے پیش نظر اس نسخہ کو دیوان ولی کا ایک نادر قلمی نسخہ کہا جاسکتا ہے۔

دیوان ولی کا یہ قلمی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور کی ملکیت (۱) ہے۔ دیوان میں غزلیات شروع ہونے سے قبل اصل کاتب نے مندرجہ ذیل عبارت سرخ قلم سے لکھی ہے :-

''دیوان بلاغت عنوان فصاحت نواماں محمد ولی الدین از اولاد شاہ وجیہہ الدین گجراتی رحمۃ اللہ علیہ،،

اس مخطوطہ میں پہلی دفعہ ولی کا نام احلاف کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس سے قبل جتنے بھی نسخوں میں ولی کا نام موجود ہے ان میں اس کا نام محمد ولی یا ولی محمد درج ہے لیکن اس مخطوطہ میں ولی کا نام پہلی مرتبہ ''محمد ولی الدین،، لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ پہلا مخطوطہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ولی شاہ وجیہہ الدین گجراتی کی اولاد میں سے تھا۔ (۲)

مخطوطہ کا سن کتابت ۲۶ شعبان ۱۱۶۱ھ ہے (۳)۔ جیسا کہ ترقیمہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تفصیلی فہرست مخطوطات متفرقہ، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور مرتبہ منظور احسن عباسی ۱۹۶۳ء۔

۲۔ رسالہ ''اردو، (کراچی) بابت جولائی ۱۹۶۶ء۔ راقم کا مقالہ بعنوان ''دیوان ولی کے قلمی نسخے،، صفحہ ۱۰۳۔

۳۔ راقم نے غلطی سے ۱۱۶۹ھ لکھ دیا تھا۔ ایضاً صفحہ ۱۰۳

" تمت تمام شد نسخہ دیوان ولی واقعہ بتاریخ بیست ششم شہر شعبان‌المعظم ۱۱۹۱ ہجری و فصلی ۱۱۵۵ بعمل سلطنت احمد شاہ بادشاہ خلد اللہ (ملکہ) و ظلہ و شانہ . . . . جلوس ولا و مالک این کتاب شیخ فتح محمد عامل صلع بھوانی پور و کاتب الحروف فقیر حقیر شیخ بلاقی باعث پاس خاطر شیخ صاحب بہ مقام بھوانی پور تحریر یافت"۔

اب ہم وہ معلومات یا تفصیلات پیش کرتے ہیں جو حاشیہ نگار نے ولی کے احباب، تلامذہ وغیرہ کے متعلق تحریر کی ہیں ۔ حاشیہ نگار نے یہ تفصیلات ان اشعار پر اشارہ دے کر حاشیہ پر لکھی ہیں جن میں ولی کے کسی دوست، شاگرد یا کسی دوسرے شخص کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اشعار مع تفصیلات ملاحظہ فرمایئے :

ہوا مجھ دل کی جنت سوں سوھر تک آد جوں طوبیٰ ، لٹک چلنا جو دیکھا ہسکہ میں سید معالی کا

سید معالی ان کے دوست تھے ۔ (ورق ۳ الف)

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا جیں میں ہے سور جس کے ابروئے پر جبین کا

شمس الدین بھی کوئی آپ کے منظور نظر ہوں گے (۸ الف)

پرت کی جو کنٹھا پہنے اس گھر بار کرنا کیا ؟ ہوئی جوگن جو کوئی پیو کی اس سنسار کرنا کیا

یہ غزل ابتدائے سخن گوئی موزوں ہوئی ہے (۱۰ ب)

بے رحم نہ ہو غصہ نہ کر بات مسری سن ؟ ڈرتا نہیں یک بات سوں ، سو بات سنا جا

کسی عورت سندر نامی کو شاید آپ محبت کی نظروں سے دیکھتے ہوں گے چنانچہ اس کا نام اس شعر کے دو مصرعوں میں نکالا ۔ ایک میں "سن" دوسرے میں "در"، مگر دوسری غزل کے مقطع میں صاف نام ظاہر کر دیا ہے ۔ (۱۷ ب)

مقطع مندرجہ ذیل ہے ۔

مجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم ۔ مشتاق ہے درس ہے تک درس دیکھا جا

آزاد سوں سنا ہوں یو مصرع مناسب جس سیں وہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

میر فقیر اللہ آزاد تخلص باشندہ حیدر آباد دکن کے مصرع کو تضمین کیا ہے (۲۰ ب)

ہر گز نہ دیوے رسم وفا ھاتھ سوں ولی ہ یک بات اس غزل کی وو پران لال (کذا)

پران لال احمد آباد میں ایک مہاجن زادہ تھا کہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر عاشق مزاج لوگ شان خدا کو یاد کرتے تھے ۔ ایک دیوان کے حاشیہ پر اس کا حال لکھا ہوا ہے کہ اس کی سواری کی شان و تجمل نے حسن سبزہ رنگ کو اور چار چاند لگا دیے تھے اور شعرا نے بھی اپنے

کلام میں ایسے سراھا ہے (۹۰ الف)

شمع بزم وفا ہے انبرب لعل		سرو باغ ادا ہے انبرب لعل

انبرب لعل ایک ہندو بچہ حسن و جمال میں بے نظیر تھا۔ اس کی تعریف میں یہ غزل کہی ہے (۹۰ الف)

ہے آج ہوش قداں میں جمال گوبند لال		استاد حال سرو ہے چال گوبند لال

گوبند لال ہندو بچہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کی تعریف میں یہ غزل موزوں کی ہے (۹۰ ب)

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں	۲	حسن کی دہلی ہے صوبہ محمد یار خاں (کذا)

محمد یار خاں محمد شاہ کے وقت میں دہلی کے صوبہ دار تھے۔ یہ ساری غزل ان کے حسن کی تعریف میں ہے جو ان سے ھمیشہ سلوک ہوتے تھے (۹۳ ب)

اشرف کا یو مصراع ولی مجھ کوں ہے دلچسپ	ے	الف ہے دل و جاں کوں میرے سیم نگر سوں

اشرف دکنی اچھے شاعروں میں تھے۔ ان کا مصرع تضمین کیا ہے (۸۹ ب)

سنسار بیچ سخن سوں ولی کامیاب ہے	۸	تو فیض پہونچا مجھ نفس سعد اللہ شاہ سوں

شیخ سعد اللہ گلشن فارسی کے عمدہ شعرا میں ولی کے استاد تھے۔ اس کا اشارہ کیا ہے (۹۹ ب)

پری سن کر اچھل جیو مصرع برق	۹	اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

شیخ ناصر علی سرھندی رتبہ کے شاعر تھے۔ ان کا دیوان مشہور ہے۔ ولی نے ان پر چوٹ کی تھی جس کا جواب نہ پایا تھا:

ز اعجاز سخن کر اڈچلے سن	۱۰	نہ پہنچے گا ولی ہرگز علی کوں

مگر یہ شعر عزیز اللہ دکنی کے دیوان میں بھی درج ہے (۵۲ الف)

تیرے اشعار ایسے نئیں فراقی		کہ جن پر رشک آوے گا ولی کوں

فراقی دکنی بھی وہاں کے اچھے شاعروں میں تھے۔ ان کا مصرع تضمین کیا ہے۔ انہوں نے اسے یوں لکھا ہے:

تیرے اشعار ھیں ایسے فراقی		کہ جن پر رشک آوے گا ولی کوں (۹۲ الف)

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے	۱۱	جو مجھ زباں پہ نام محمد مراد ہے

محمد مراد کوئی شخص آپ کے دوستوں میں تھے۔ ان کی تعریف میں فرماتے ھیں (۹۹ ب)

ہر طرف ہنگامہ اجلاف ہے		مت کسی سوں مل اگر اشراف ہے

محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں شریفوں کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری، ہر طرف ہنگامہ اجلاف، کساد بازاری اشراف پر فرما تے ھیں (۹۷ ب)

تیرا قد دیکھ اے سید معالی		سخن فہماں کی ہوئی ہے لکر عالی

سید ابوالمعالی وہ شخص ھیں جن کے ساتھ احمد آباد گجرات ، برھان پور ، اورنگ آباد ، سورت ، بمبئی ، حیدر آباد وغیرہ کی خوب خوب سیر کی تھی اور چند ایام ھر ایک جگہ مقام کر کے آخرش برھان پور مذکور سے شیخ سعد اللہ گلشن کے ساتھ محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں شاہ جہاں آباد پہنچے تھے۔ انھی سے تحصیل علم کی تکمیل کی اور انھی سے اصلاح لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ صاحب دھلی میں تکمیل علوم میں فارغ التحصیل ھو کے اپنے وطن شریف کو روانہ ھوئے تھے۔ ولی پہلے سفر سے پہلے ان سے پڑھا کرتے تھے اور اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ اب جو استاد نے دھلی اور اھل دھلی کی تعریف کی ، حضرت کو دھلی دیکھنے کا کمال اشتیاق ھو گیا۔ آخر ایک چھوٹے سے قافلہ کے ساتھ جس میں اکثر شاہ گلشن کے شاگرد اور بیشتر وھاں کے ساکنین تھے سنہ ۳ جلوس محمد شاھی میں وارد دھلی ھوئے۔ جس طرح ولی نے اپنے کلام میں ان کی تعریف کی ھے ، اسی طور شاہ ابوالمعالی نے ان کو اپنے کلام میں سراھا ھے اور جابجا نیک نامی اور تعریف کے ساتھ یاد کیا ھے۔ ان لوگوں کی ملاقاتیں اپنایت اور رشتہ داری کے برابر ھوتی تھیں۔ یہ بات نہ تھی جو آج کل کے ارباب زمانہ میں ھم دیکھتے ھیں۔ یہ سب اصحاب جب سے دکن سے آئے ، ایک جگہ رھے اور جو کچھ خدا نے دیا ، سب نے مل جل کر گزارہ کیا اور جب موت کا پیغام آیا ، ناچار ھوگئے۔ اور ایک دوسرے سے علحدہ ھوئے ، مگر پھر بھی وصیت بموجب شاہ گل کی مسجد میں ، جہاں قیام پذیر تھے دفن ھوئے (۹۲ الف)

اب ھم ولی کا وہ غیر مطبوعہ کلام درج کرتے ھیں جو حاشیہ نگار نے لکھا ھے۔ غزل نمبر ۴۰ (۱) کا ایک غیر مطبوعہ شعر

سو کناری مکھ پہ تیرے اے زلیخا وش نہیں ــــ سورہ یوسف کو لکھا (۲) گرد (۳) تحریر طلا (۹۱ ب)

ورق ۹۲ ب کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ غزل (عنوان کے ساتھ) درج ھے :

غزل سر دیوان دیگر محمد ولی

لا مکاں پر بنا احمد جو بنا بنھلایا ــــ تب ملائک نے ووھیں صلوا علیکم گایا
حور و غلماں نے ترانے سے وہ نغمے بولے ــــ قاب قوسین کا نوشہ ہو ھے سب کو بھایا
تھے براتی وھاں آدم سے لگا تا احمد ــــ اور جبریل امیں گوندھ کے سہرا لایا
حق نے لولاک لما . . . محمد کے کہا ــــ اس سوا کون ہے مرسل نے یہ رتبہ پایا
مغفرت تیری ولی سہل بلاریب ھے کیوں ــــ نام احمد کا جو لب پر ترے ھر دم آیا (۴)

۱۔ غزلیات کے نمام نمبر کلیات ولی (بار سوم) مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ھاشمی ۱۹۵۴ء پر مشتمل ھیں۔

۲۔ دوں کیا (مجموعہ نغز حصہ دوم صفحہ ۳۰۰)۔

۳۔ دوں بھی کرو (کلیات ولی قلمی۔ مخزونہ پنجاب پبلک لائبریری لاھور۔ ورق ۳۶ ب)۔

۴۔ اس غزل کا صرف مطلع کلیات ولی (بار سوم) میں بھی درج ھے (دیکھیے ضمیمہ اول صفحہ ۲۱)۔

غزل نمبر ۴۴ کا ایک شعر :

جس کے وہ جھانپی یہ سرے . . .   ہوں ابھی کی جیبری کوں سر کر (۴۳ الف)

غزل نمبر ۴۴ مطبوعہ مقطع نقل کرنے کے بعد مندرجہ ذیل عبارت اور شعر بھی لکھا ہے

"ایک دیوان میں اس غزل کا یہ مقطع ہے

قلم سوں شاخ گل کی دیوں ہیں اصلاح جب نقش   ولی کا شعر پھر (؟) ہووے ہے گلدستہ معانی کا"

(۴ الف)

تین متبادل غزلیات:-

دل لگا یار سوں پھر اس کا چھڑانا مشکل   عشق کا زخم لگا اس کا سلانا مشکل
حسن ہے دام بلا زلف ہیں دو کالے ناگ   جس کے تیں ناگ ڈسا اس کا جلانا مشکل
آتش عشق نے بھنوں کا کیا خانہ خراب   آگ دریا کو لگے اس کا بجھانا مشکل
یاد کرنے کوں لیا ہاتھ میں من کا منکا   دل اوپر بوجھ پڑے لگا اٹھانا مشکل (کذا)
طفل نادان ہٹیلا مرا عم اسے سارے   مکتب عشق میں تعلیم دلانا مشکل
عمر جو یاد میں گزرے سو غنیمت بوجھو   سو گیا عشق میں پھر اس کا جگانا مشکل
راز مخفی ولی ظاہر نہ کسو سے کرنا   ہاتھ سوں بات گئی اس کا پھر آنا مشکل (۴۷ ب)

۲
میں تو دل کوں بوڑا اس بت عیار کے ہاتھ   کونی آتا ہے بھلا ایسے ستم گار کے ہاتھ
دام میں آن کے صیاد سے بلبل نے کہا   بکتا مجھ کو کسی آئینہ رخسار کے ہاتھ
بوسے ان ہاتھوں کے لیتا ہوں میں ہر دم ہر آن   کیونکہ مدت سے رچے ہاتھوں میں دلدار کے ہاتھ
جلد پھر اس کوں ملادے تا مجھے دور رکھیے   ایسی ہے بات مری حضرت غفار کے ہاتھ
حشر کا خوف ولی کو سو نہیں ہے واللہ   ہے شفاعت نہ وہاں احمد مختار کے ہاتھ

(۹۵ ب)

۳
سرو رعناں کو دیکھ کے سب گل پگھل گئے   گل لالہ داغ کھا کے چمن سوں نکل گئے
پلکیں ہیں تری تیر بھوویں جوں کمان ہیں   چنچل نین کوں دیکھ کے کنجن بچل گئے
زلفیں تری کوں دیکھ کے باسک گئے پتال   نازک کمر کی دھاک میں چیتے چکل گئے
کیا تاب ہے ہرن کی جو دیکھے تری طرف   سیراں تری نگاہ کی دہشت سوں ٹل گئے
تعریف تجھ بدن کی کہاں لگ کرے ولی   چندا چکور ہوکے ترے مکھ پہ بل گئے

(۹۲ الف)

غزل ۵۴ کا غیر مطبوعہ شعر :

زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے   یہ زخم ترا خنجرو بھالاں سے کہوں گا (۱۰۱ الف)

مذکورہ غزل کا مقطع اس طرح ہے ۔

بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سوں ہرگز   جلتا ہوں ترے درد میں درماں سے کہوں گا

(ایضاً)

حاشیہ نگار نے بعض جگہوں پر کلام ولی کی اصلاح بھی کی ہے اور وہ اصلاح کلیات ولی (مطبوعہ ۱۹۵۴ء) کے بالکل مطابق ہے ۔

غزل	شعر	مصرعہ (۱)	مطبوعہ (۲)	مخطوطہ	اصلاح
۴۳	۶		بری رخ کوں اٹھانا نیند سوں برجا نہیں عاشق عجب کچھ لطف رکہتا ہے زمانہ سم خوابی کا (۳)	بری روکوں اٹھانا نیند سوں برجا ہے اے عاشق نپٹ نت لطف رکھتا ہے شفق رنگ گلابی کا	پریروکوں اٹھانا نیند سوں برجا ہے اے عاشق عجب یہ لطف رکھتا ہے زمانا نیم خوابی کا (۳) (۲ الف)
ایضاً	مقطع		ولی سوں بے حسابی بات کرنا بے حسابی ہے نہیں وہ آشنا اے یار ہرگز بے حسابی کا	مصرع ثانی میں 'اے' کی بجائے 'ہے' درج ہے	مطبوعہ اور مخطوطہ میں تین بار 'بے حسابی' استعمال ہوا ہے جس کو حاشیہ نگار نے 'بے حجابی' میں تبدیل کر دیا ہے اور ساتھ ہی حاشیہ پر مندرجہ ذیل عبارت اور شعر بھی لکھا ہے "ایک دیوان میں اس غزل کا یہ مقطع ہے قلم سوں شاخ گل کی دیوس ہیں اصلاح جب گلشن ولی کا سعر بھر(؟) ہوئے ہے گلدستہ معانی کا"
۵۲	مقطع	۱		لیا ہے حسن سوں سوجھ نے طریق خود نمائی کا	طریقہ (۳ب ـ مطبوعہ میں بھی یہی لفظ درج ہے) ـ
۷۲	۳	۲	حسن سوں لیا ہے درس بری مکھ کتاب کا	حسن سوں لیا ہے درس بری مکھ کتاب کا	حسن سوں لیا ہے درس پیری مکھ کی کتاب کا (۳ الف)
ایضاً	۹	۱	تجھ سوق سوں مدام لبالب ہے جام نین	تجھ سوق سوں مدام لبالب ہے جام سے	تجھ چشم سوں مدام لبالب ہے جام سے
ایضاً	ایضاً	۲	سینہ میں	سینہ میں	سینہ میں

۱ـ غزل، شعر اور مصرعہ کے نمبر کلیات ولی (مرتبہ ـ ۱۹۴۵ء) کے مطابق ہیں ـ ۲ـ کلیات ولی (۱۹۴۵ء) ـ

۳ـ مطبوعہ کے حاشیہ پر اس شعر کی متبادل دو صورتیں بھی دی ہیں :

پری رو کوں اٹھانا نیند سوں برجا ہے اے عاشق عجب کچھ لطف رکھتا ہے نگہ چشم ستانی کا

بری رخ کوں اٹھانا نیند سوں برجا ہے اے عاشق عجب کچھ لطف رکھتا ہے زمانہ نیم خوابی کا

۴ـ حاشیہ نگار نے یہ شعر مطبوعہ دیوان کے شعر نمبر ... کا ذکر ہے ـ ... اس غزل کے شعر نمبر ... شعر لکھنا چاہیے تھا ـ

غزل	شعر	مصرعه	مطبوعه	مخطوطه	اصلاح
۳۱	مقطع	۲	جیوں کر	حیوں کر	حیوں کے بمعنی جیسے که (۹ ب)
۴۱	۳	۱	رنگ وقار	رنگ حنا	رنگ ضیا (۸ الف)
ایضاً	ایضاً	۲	کیا عجب گرتجه سے لوے درس ت تمکین کا	کیا عجب گرتجھ سوں لیوے درس شب تمکین کا	کیا عجب که تجه سوں لے دروں سبق تمکین کا
ایضاً	۴	۱	عاسق جانباز	عاشقان جانباز	عاشق جانباز
۵۴	۶	۲	تیری انکهیاں کے دیکهے عالم خراب هونےگا	تیری انکهیاں کے دیکهیں عالم خراب هوگا	تجه انکهڑیاں کے دیکهے عالم خراب هوگا (۱۱ ب)
۲۱	مطلع	۱	دیکها هے جن نے تیرے رخسار کا تماسا	دیکها جنے تیر رخسار کا تماشا	دیکها هے جن نے تیرے رخسار کا تماشا (۱۱ ب)
۲۳	۲	۲	سب تی بی هوا هے	سب تن هوا هے	سب تن تین هوا هے (۱۲ ب)
۴۷	۲	۲	تحه خال کا خیال	تجه خال خیال	تجه خال کا خیال (۱۳ الف)
ایضاً	۳	۲	وه نقش پاک زینت روئے زمیں هوا	وه نقش پاک زینت روئے زمیں هوا	وه نقش پا جو زینت روئے زمیں هوا
۵	۴	۱	نزک	نرک	نزدیک (۱۹ الف) نیز حاشیه پر اس غزل کی ردیف 'دستا' کے معنی بهی لکهے هیں 'دستا' بمعنی دکهائی دیتا جیسے پنجابی میں دسدا کهتے هیں چنانچه گانے کی ایک ..... سانو کوئی نهیں دسدا نتها سیاں
۱	۱۵	۱	همسر	همسر	همره (۱۷ الف)
ایضاً	ایضاً	۲	درد کهتی هے	درد کهتا هے	درد کهتی هے
۱۰	مطلع	۲	مستاق درس کا هوں تک یک درس دکها جا	مستاق تیرے درس کا تک درس دیکها جا	مشتاق تیرے درس کا هوں تک درس دیکهاجا (۱۷ ب)
ایضاً	۳	۲	تک مکهه کوں دکها	ٹک مکهه دیکها	ٹک مکهه کو دیکها
۱۳	مطلع		ست غصے کے شعلے سوں جتے کوں جلاتی جا	مت غصے کے شعلے سوں جلے کوں جلا جا	مت غصے کے شعلے سوں جلے کوں تو جلاجا

غزل	شعر	مصرعه	مطبوعه	مخطوطه	اصلاح
			تک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا	تک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھا جا	تک مہر کے پانی سوں مری آگ بجھا جا (۸ الف)
۱۳	۳	۱	اندھاری	اندھاری	اندھیری
ایضاً	۷	۱	جل جل	جک حک	جگ جگ
۶۰	۲	۱	کیوں کرے آلودہ' زر جگ	کیونکر آلودہ' زر جگ	کیوں کرے آلودہ' زر جگ (۹ الف)
ایضاً	ایضاً	۲	علم	عالم	علم
۷۷	۷	۱	متفق	ستق	متفق (۲۱ الف)
۱۳۷	مقطع	۱	اگر گدزار مس بیٹھے وو سرو نازنین آکر	اگر گلزار میں بیٹھے سبھی وو سرو نازنن آکر	اگر گلزار میں بیٹھے وو سرو نازنیں آکر (۳۱ ب)
ایضاً	۲	۱	اس بت کا گرد بیشک	اس بت کا گذر اس کر (؟)	اس بت کا گذر بے شک
ایضاً	ایضاً	۲	هووس	هووے	هووس
ایضاً	م	۱	کرے سرازه سدی دل کی	اگر سیرازه بندی دل کی	کرے شیرازه بندی دل کی
ایضاً	ایضاً	۲	پریساں هو اگر دیکھے وه زلف عنبریں آکر	پریساں ہوئے اگر دیکھے وو زلف عنبریں آکر	پریساں هو جو دیکھے اوس کی زلف‌عنبریں آکر
ایضاً	۳	۱	عجب اس شوخ چنچل کی انکھیاں ھیں شوخ اور چنچل	عجب اس شوخ چنچل کی انکھیاں ہے کہ اے دل	عجب اس شوخ چنچل کی نگاھیں ھیں ھور چنچل
ایضاً	ایضاً	۲	ہوئے قربان جس اوپر	ہوئے قربان نجه جس اوپر	ہوئے قرباں جس اوپر
ایضاً	مقطع	۱	عجب نہیں حال مس اس کے	عجب نہیں دام میں اس کے	عجب کیا دام میں اس کے
ایضاً	ایضاً	۲	کہ اس کے دام مس لاکھاں پھسے ھیں اهل دیں آکر	کہ اس کے حال سوں لاکھاں پھنسے ھیں اهل فن آکر	کہ اس کے دام سوں لاکھوں پھنسے ھیں اهل دیں آکر
۱۳۳	۲	۱	یک ہہ تک آنا	تکتک وہ آنا	تک ہو وہ آنا (۳۳ الف)

غزل	شعر	مصرعہ	مطبوعہ	مخطوطہ	اصلاح
۱۲۸	۲	۲	دل زخمی طرف	دل زخمی طرف	دل زخمی کی طرف (۳۳ ب)
ایضاً	۵	۲	ستا ہے	ستا ہے	ستا ہے
۱۳۱	۳	۱	ہر نگہ کرتی ہے نظارے کی مسق	ہر نگہ کرتی ہیں نظارے کا مسق	ہر نگہ کرتی ہے نظارے کا مشق (۳۴ الف)
۱۳۵	مطلع			بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر	اِس شعر کو دو شعروں میں تقسیم کر دیا ہے اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر مت غافل (تغافل) کوں راہ دے اے شوخ جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر (۳۴ب مطبوعہ میں بھی یہی ہے)
ایضاً	۳	۲	آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر	اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر	آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر علاوہ ازیں اس غزل کا ایک شعر حاشیہ پر بھی لکھا ہے جو مطبوعہ دیوان میں شعر نمبر ۸ ہے رنگ عاشق غضب سوں اے ظالم کہیر بانی نہ کر خدا سوں ڈر
۱۵۳	۵	۱	تیرے قدم تلے	تیرے قدم تلے	تیرے قدم تلے
۱۹۶	مطلع	۲	نہیں یک گوش محرم نہ سنے آہ و فغان دل	نہیں یک گوش دل محرم سنے آہ و فغان دل	نہیں تک کوئی محرم تا سنے آہ و فغان دل (۴۰ ب)
ایضاً	۳	۲	سپہر دہان دل	سپہر بان دل	سپہر دہان دل
ایضاً	۴	۲	ہاتھ سوں دل کے عنان دل	ہاتھ دل کے عنان دل	ہاتھ سوں دل کے عنان دل

غزل	شعر	مصرعه	مطبوعه	مخطوطه	اصلاح
۱۹۶	مقطع	۱	اے ولی کیونکر ستے هر یک	اے ولی کیوں کر سکے هر یک	اے ولی کیونکر سنے هر یک
۲۱۹	مقطع		حاجت اپس کی کہہ ونواس سوں کہو ولی	حاجب اپس کی کہہ وسواس کر ولی	حاجت اپس کی کہنے میں وسواس کر ولی
			محتاج جس نرک هیں قدیم و جدید یہاں	محتاج جس نردیک قدیم هور حدید یہاں	محتاج جس نزدیک قدیم هور جدید یہاں (۳۵ ب)
۲۶۲	۲	۲		تیرے نین کا گر عکس پڑے گر شراب میں	تیرے نین کا عکس پڑے گر شراب میں (۵۵ الف۔ مطبوعه میں بھی یہی ہے)
۳۰۰	مطلع	۲	کہ	کہ	جوں (۶۳ الف)
ایضاً	۳	۲	خطاب	خطاب	سوال
ایضاً	۵	۱	عشق سوں اے آتسیر رو	عشق سوں آتشیں رو	عشق سوں اے آتشیں رو
۳۸۲	مقطع	۲	حو محد زبان په نام محمد مراد هے	جو مجه زبان کا نام محمد مراد هے	جو مجه زبان په نام محمد مراد هے (۷۰ ب)
۳۵۰	۲	۱	قلم نرگس کی	قلم نرگس کا	قلم نرگس کی (۸۹ ب)
۳۳۱	مقطع	.	ولی کوں کہے تو اگر یک سخن	ولی کوں اگر یوں کہے یک سخن	اگر تو ولی کے سخن کو سنے (۹۵ الف)
۳۲۵	۳	۱	زلف نئیں تجه مکھ پر اے دریائے حسن	زلف سہیں تجه مکھ پر اے دریائے حسن	مکھ کے اوپر زلف اے دریائے حسن (۱۰۰ ب)
ایضاً	مقطع	۲	گلشن	گلشن	غنچه

مخمس	بند	مصرع	مطبوعه	مخطوطه	اصلاح
۱۶	۶	۳	سہیں سوجی نگاه عاشقی سس	سہیں سوجی نگاه عاسقی سس	سہایت هے تناهی عاشقی میں (۱۰۳ الف)
ایضاً	۷	۲،۱	گدا هیں جو محبت کی گلی کے	گدا هے جو کی گلی سس	گدا هیں جو محبت کی گلی کے
			سدا وو هم سفر هیں بیجلی کے	وو دائم هم نفس هے سجی سس	وو دائم هم سفر هیں بیجلی کے

علاوہ ازیں حاشیہ نگار نے مثنوی نمبر ۱ کے مختلف عنوانات بھی لکھے ھیں مثلاً اس مثنوی کا پہلا عنوان "حمد باری تعالیٰ" لکھا ہے اور شعر ۱۵ کے بعد "نعت سرور کائنات" لکھا ہے۔ اور شعر ۲۵ کے بعد "منقبت چار یار" درج ہے۔ دوسری مثنوی کا عنوان "تعریف شہر سندر سورت" لکھا ہے اور اس مثنوی کو بھی مختلف عنوانات میں تقسیم کردیا ہے۔ شعر نمبر ۱۰ کے بعد 'تعریف قلعہ' کا عنوان ہے۔ شعر نمبر ۱۱ کے بعد "گھاٹ" لکھا ہے۔ شعر نمبر ۱۳ کے بعد "تعریف ناریساں" کا عنوان ہے۔

مخطوطہ کے اصل کاتب نے کسی صنف سخن کا عنوان نہیں لکھا۔ حاشیہ نگار نے اپنے قلم سے مختلف اصناف سخن کے نام لکھ دیے ھیں جس سے قاری کو پڑھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ مثلاً رباعیات ، سلام ، مرثیہ وغیرہ کے عنوانات ، لیکن حاشیہ نگار نے بعض عنوانات غلط بھی لکھ دیے ھیں مثلاً فردیات کے اوپر 'قطعات' کا عنوان لکھ دیا ہے جو بالکل غلط ہے۔

(نوٹ) اس مضمون میں ولی کے جو اشعار آئے ھیں ، ان کے بعض مصرعے کلیات ولی کے مطبوعہ مصرعوں سے مختلف ھیں۔ ایسے شعروں کے درمیان میں نمبر ڈال دیے گئے ھیں ، اسی ترتیب سے مطبوعہ مصرعے ذیل میں درج کیے جاتے ھیں :—

۱ ۔ (مصرع اول) ہوا مجھ دل کی جنت میں سو ہر یک آد جیوں طوبی۔

۲ ۔ (مصرع دوم) ہوئی جوگن جو گئی بی کی اسے سنسار کیا کرنا۔

۳ ۔ (مصرع دوم) ڈرنا نہیں تک بات کی سو بات سنا جا۔

۴ ۔ کلیات میں اس زمین کی کوئی غزل درج نہیں جس کی مدد سے وزن درست کیا جائے ، البتہ زیر نظر نظموں میں آگے چل کر (مطبوعہ : مخطوطہ اور اصلاح کے جدول میں) یہ مصرع اس طرح لکھا ہے جس کا وزن درست ہے : مشتاق نرے درس کا جگ درس دیکھا جا۔

۵ ۔ (مصرع دوم) یک بار اس غزل کوں سنے گر گوبند لال۔

۶ ۔ کلیات میں اس زمین کی کوئی غزل (وغیرہ) درج نہیں۔ دوسرا مصرع شاید یوں کہا ہو : حسن کی دھلی کا صوبہ ہے محمد یار خان

۷ ۔ (مصرع اول) اشرف کا ہو مصراع ولی مجکوں گماں ہے۔

۸ ۔ کلیات میں اس زمین کی غزل ہے مگر یہ شعر نہیں۔

۹ ۔ (مصرع اول) بڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق

۱۰ ۔ کلیات میں اس زمین کی غزل ہے مگر یہہ شعر نہیں۔

۱۱ ۔ (مصرع دوم) جیوں مجھ الخ۔

ادارہ

میر غلام مصطفیٰ، سخن اورنگ آبادی

سخاوت مرزا (بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی)

تعارف :

میر غلام مصطفیٰ نام ، المتخلص بہ سخن ، اورنگ آباد دکن کے مشہور شاعر تھے ۔ آپ کو اورنگ آباد کے مشہور شاعر اور مولف تذکرہ چمنستان شعرا سے تلمذ تھا ۔ سخن ۱۱۷۷ھ میں پیدا ہوئے ۔ قطعہ تاریخ ولادت جب سن شعور کو پہنچے اور فارغ التحصیل ہوئے تو خود ہی کہا تھا جو یہ ہے

تا قدم زد بجلوہ گاہ شہود — سخن نکتہ سنج و معنی یاب

سال میلاد خویشتن خود گفت — ''مطلع آفتاب عالم تاب''

۱۱۷۷ھ

چونکہ سخن نے اپنے بعض معاصرین کے تاریخی قطعات لکھے ہیں ۔ خصوصاً مولوی عبدالکریم شہید (وفات ۱۲۲۸ھ) ، مولوی قمرالدین اورنگ آبادی (وفات ۱۲۳۰ھ) اور ایک سادہ تاریخ سے ۱۲۸۹ھ جو کچھ مشتبہ ہے، مگر اس سے پتہ چلتا ہے کہ سخن نے طویل عمر پائی ۔ وسط تیرھویں صدی ہجری تک بقید حیات تھے ۔ اور چونکہ بانی تخت اورنگ آباد سے بزمانہ آصفجاہ ثانی ۱۱۷۳ھ ۱۲۱۸ : حیدر آباد منتقل ہوچکا تھا سخن بھی حیدر آباد چلے آئے اس زمانے میں بوجہ سرپرستی ارسطو جاہ حیدر آباد شعرا و علما کا مرکز تھا ۔ سخن کو اپنی جولانی طبع کا خوب موقع ملا ۔ ان کے استاد لچھمی نارائن شفیق بھی آخر زمانے میں حیدر آباد آگئے تھے ۔ ان کے دوسرے سرپرستوں میں نواب شاہ یار الملک اور راجہ چندو لال شاداں تھے ۔ شعرا معاصرین میں میر شمس الدین فیض حیدر آبادی ، مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند ، اور ذوالفقار علی خاں ، صفا بریلوی ، تلمیذ میر تقی میر ہیں جن سے شاعرانہ چشمک رہا کرتی تھی ۔ دہلی کی تباہی کے بعد ، لکھنؤ اور حیدر آباد علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز تھا ۔ سخن کو سرکار آصفیہ کی ملازمت سے بھی تعلق تھا چنانچہ ایک قصیدہ میں اضافہ تنخواہ کی استدعا کی ہے ۔ نیز ان کا تعلق چندو لال کے دربار سے بھی تھا ۔

سخن فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے ۔ ان کی نظر سے اساتذہ دہلی و لکھنو ، میر اور سودا کے دواوین گزرے تھے ۔ مولوی نصیرالدین ، نقش تلمیذ فیض حیدر آبادی نے

اپنے تذکرہ عروس الاذکار میں سخن کی اس طرح تعریف کی ہے :-

" کلامش از رطب و یبس برکران ، وصفش مرعوب و پسندیدہ ، طرزش دلکش و سنجیدہ ، از اشعار آبدارش اینانست ،،

نہ ایسا بیخود و بیہوش و دیوانہ سمجھ مجھ کو
ہکار خویشتن ہشیار و مستانہ سمجھ مجھ کو
اشک سے چشم تر نہیں جلتے
گرہ ساسی سے گھر نہیں جلتے

اپنی شاعری کے متعلق لکھے ہیں

سودا تو نہیں کہوں جو سودا جانو
تا سر کا ہم نظیر و ہمتا جانو
لیکن بخدا سخن کو اپنے یارو
شاگرد رشید میر و مرزا جانو

گویا سخن ، میر و مرزا کے پیرو تھے ۔ چنانچہ میر کی طرح میں ایک غزل کہی تھی جس کے بعض اشعار یہ ہیں

استاد نے جس دم نقطہ نقطہ درس وفا تکرار کیا
دیوانہ کیا صد عاقل کو مدھوشوں کو ہشیار کیا
صورت گرنے طرح کیا جب صورت اپنی صورت پر
اعجاز مسیحی لب کو بخشا آنکھوں کو بیمار کیا
معذور ہمیں اب رکھیئے گا آجائے جو منہ پر راز دروں
اک جام پلا کر ساقی نے سرشار مئے اسرار کیا

کچھ سبب اجتناب کا نہ کھلا
راز خشم و عتاب کا نہ کھلا
کس کی زلفوں نے دل کو پینچ دیا
پینچ اس پینچ و تاب کا نہ کھلا
آہ ! ساقی الضمیر آج تلک
دل خانہ خراب کا نہ کھلا

مہاراجہ چندو لال وزیر اعظم حیدر آباد کی تعریف میں غالباً بتقریب جشن ہولی ایک بڑی رنگین غزل کہی ہے جو ہندو مسلم اتحاد اور رواداری کا بہترین نمونہ ہے

نہ تنہا جوش گل سے گلشن و گلزار رنگیں ہے
فضائے دشت رنگیں ، دامن کہسار رنگیں ہے
ہوئی ہے رنگ کی اس رنگ طغیانی زمانہ میں
کہ سقف و بام سے لے تا در و دیوار رنگیں ہے
عجب راحت فزا ہے دور چندو لال راجہ کا
کہ گھر گھر عیش ہے اور کوچہ و بازار رنگیں ہے
خم و خمخانہ رنگیں، شیشہ رنگیں، بادہ کش رنگیں
مئے گلرنگ رنگیں، ساغر سرشار رنگیں ہے
سخن کے شعر رنگیں کا اثر یہ ہے کہ مطرب کا
دھاں رنگیں، زباں رنگیں، لب گفتار رنگیں ہے

سخن قصیدہ گوئی میں بھی استاد تھے ۔ آئمہ کی منقبت اور امرائے وقت کی مدح میں تیرہ چودہ قصائد کہے ہیں ۔ نواب ارسطو جاہ مشہور وزیر حیدر آباد کی مدح میں (۴۷) بیت کا قصیدہ کہا تھا

جس کے چند اشعار یہ ہیں

کیا کہوں اب سے رنگ گل لالہ کی مثل — آتش طور بھڑکتی ہے بہر دست و جبل
قوت ناسہ ہے اور ہے عہد اسے کا — بار ور کیوں نہ خلائق کا ہو بہر نخل عمل
یعنی نواب فلک قدر امیر اعظم — جس کی ہمت کا جہان میں ہے نہ کچھ قدر و محل

قصیدہ در مدح نواب عالی جاہ

برسے بحر کرم سے بہرہ ور کر ابر نیساں ہو — صدف نو کیا کہ ہر خوشہ میں پیدا در غلطاں ہو
نشان خلق و آثار کرم باطن سے ظاہر ہیں — ندا اسم مبارک کیوں نہ پھر احمد علی خاں ہو

نواب کیواں جاہ کی شادی کی تقریب میں مشہور طوائف مہ لقا بائی چندا کے رقص و سرود کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے

رشک صد جشن کیقبادی ہے — شادی دل کشائے کیواں جاہ
مہ لقا کا وہ رقص مہر افزا — وہ ادائیں فسوں معاذ اللہ
وہ گیتیں دل فریب وہ ٹھوکر — وہ تغافل وہ عاشقانہ نگاہ

غرض سخن حیدر آباد کے دور متوسط تیرھویں صدی ھجری کے ایک جید اور خوش گو شاعر تھے۔ جن کا قلمی دیوان کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے جو تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور ایک مثنوی "صرصر سخن،، بھی یاد گار ہے۔

کتاب زندگی

(قسط نمبر ۶)　　　　　　　　　　　　　　　قیصری بیگم

مجھے گڑیاں کھیلنے کابھی بہت شوق تھا ۔ میری گڑیاں اجلی اجلی ، صاف ستھری گوٹا کناری کے کپڑے پہنے رہتیں اور جیسا میں اپنا گھر سلیقہ اور صفائی کا دیکھتی ویسا ہی گڑیوں کا گھر صاف ستھرا رکھتی ۔ اس زمانے میں ایک پیسے میں تین گڑیاں بکتی تھیں ۔ ایک گڑیا ، ایک گڈا ، ایک گڑیا کا بچہ جسکو چمنی کہتے تھے اور ایک ہی پیسہ میں گڑیا کا پورا گہنا رانگ کا بنا ہوا ملتا تھا ۔ بزاز جس کا نام بہاری تھا ۔ کپڑوں کے ذرا ذرا سے ٹکڑے لادیتا اور ہم خود سی کر کپڑے تیار کر لیتے ۔ مجھے تو گڑیوں کی بدولت بہت آسانی سے سینا پرونا آگیا ۔ گڑیا کے گھر میں دری چاندنی گاؤ تکیہ ، مسہری اسپر بستر ۔ سب کا خیال رکھتی اور دلچسپ کہانی بنا کر بالکل الگ تنہائی میں گڑیاں کھیلتی ۔

آپا صغرا بیگم کی شادی:

میں چھ برس کی تھی کہ آپا کی شادی ہوئی اور مجھے اس بات کا ملال رہا کہ ایسی دھوم کی شادی میری ایسی عمر میں ہوئی کہ یاد بھی نہیں ۔ میرے بہنوئی محمد امین‌الحق کو جن کو میں بھائی صاحب کہتی تھی ہمیشہ مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ آرسی مصحف کے وقت آپ بڑی شفقت سے سرے کندھے پر چڑھ بیٹھیں ۔ میں کسی بد تہذیب تھی ، کم از کم مجھے اپنی ایسی بد تہذیبی کی اپنی ذات سے امید نہیں ہونی چاہئے تھی ۔

سنی سنائی ہوئی کہتی ہوں کہ آپا کی شادی سے پہلے ہی میری عزیز بیویاں مجھسے کہنے لگیں کہ آپا تو سسرال جا رہی ہیں اب تم اماں کا کام کرنے لگو ۔ اماں کو کام کی دقت نہ رہے ۔ میں نے اونچی اونچی جگہوں پر چڑھ کر سامان کی کوٹھری کھولنے کی کوشش شروع کردی ۔ کھونٹیاں پکڑ کر طاقوں پر چڑھتی رہی ۔ بڑے بھائی کی شادی ہوئے دو برس ہوئے تھے تقریباً ۱۸۹۸ء تھا کہ پورے دھوم دھام ، تزک و احتشام کے ساتھ شادی رچی اور دوسری بار اماں جان کو اپنا حسن انتظام دکھانے کا موقع آیا ۔ اماں کا اہتمام معمولی اہتمام نہ تھا ۔ دادا ابا ، دادی اماں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسی منتظم ، سلیقہ شعار بہو نصیب ہوئی جس کا کام ذمہ لیا چاروں طرف سے واہ واہ ہونے لگی ۔ یہ مادہ ہر ایک میں نہیں ہوتا ، قدرت جس کو چاہے عطا فرمائے ۔

آپا کا جہیز دنوں پہلے ہی سے اماں نے جوڑنا شروع کردیا تھا ۔ جو کپڑا ان کو پسند آتا جو برتن اور جو چیز اچھی دیکھتیں لے کر سینت دیتیں ۔ شادی سے پہلے ہی وہ دن رات اس میں مصروف رہنے لگیں ۔ ان کو خیال تھا کہ ایسا نہ ہو اور لوگوں کی طرح آخری وقت تک کام جاری رہے ۔

جیسے مثل ہے کہ وداع کے وقت تک لڑکی کی ماں کے ہاتھ میں سوئی رہتی ہے ۔ وہ راتوں کو بیٹھ کر ہر کام کے متعلق سوچتیں اور دن کو عمدگی سے کام کرتیں ۔ ایک ایک چیز ان کے ہاتھ کی سلی ہوئی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی ۔ برسوں بعد بھی علی گڑھ کی نمائش میں جب آپا نے اماں کے ہاتھ کی دستکاری رکھی تو اس پر انعام ملا ۔

سب جوڑے جب ٹک گئے تو ان کو ایک خاص طریقے سے تہ کرکے ان میں ٹانکے لگا دئیے کہ مصالحہ اوپر ہی سے نظر آئے ۔ کھولنے کی ضرورت نہ پڑے ۔ عموماً یہ طریقہ دہلی اور حیدر آباد میں رائج تھا ۔

جب جہیز دکھانے کو باہر نکالا گیا تو دادا ابا مرحوم انگشت بہ دندان رہ گئے اور فرمایا کہ میں نے بادشاہوں کے جہیز دیکھے ہیں مگر ایسا جہیز کسی کا بھی نہیں دیکھا ۔ بھئی واہ واہ! چھوٹی دلہن نے کمال کا جہیز سیا اور تیار کیا ۔

مینا کاری ، سلیقہ ، صفائی ، ہنر مندی ہو تو ایسی ہو ۔ ایک ایک کڑھت ان کے ہاتھ کی لاجواب تھی ۔ پھول پتی کا کام ایسا کہ معلوم ہو واقعی پھول بکھرے ہوئے ہیں ۔ باغ لگا ہوا ہے اور پھر جو جس کام کے واسطے موزوں تھا اس سے اس کاریگری میں مدد لی ۔ مثلاً گوہر النساء بیگم نے ڈھیلے پاجاموں کے پٹھے اجرت سے لاجواب تیار کئے ۔ وہ نانی اماں کی کسی رشتہ کی بہن ہوتی تھیں ۔ کام ان کا سجل تھا اور ان کی لگن سب کو پسند تھی ۔ سوزنیاں ، چاندنیاں ، دستر خوان ۔ غلاف ، تکیہ ۔ پینچ وغیرہ سرور نانی کی بیوی سے سلائی کے سلوائے ۔ جو سینے میں مشہور تھیں ۔ چھپر کھٹ کا پردہ ، چادریں ، گل تکیے ، پلنگ پوش ، مسندھی کے بندھن ، صندوقچوں کے غلاف ، کسنے موباف ، بٹوے ، حرم ، کرتیاں ، وغیرہ خود تیار کیں ۔

جا نماز ، جزدان ، مسند تکیہ نہایت خوبصورت کارچوبی تھا ۔ رضائیاں ، دولائیاں ، چادرے ، قابل دید تھے ۔ اس کے علاوہ سیلابچی اور اگالدان وغیرہ کے حوش نما زرر انداز ۔ قرآن شریف مع جزدان ، تورے پوش ، خوان پوش ، پٹاری کی گردی ، پانداں کا غلاف ، پانوں کی صافیاں ، تلے دانیاں ، داگوں کی پیچکیں ، ڈولی کا پردہ ، ڈولی کی سوزنیاں طرح طرح کے کام اماں جان کے ہاتھوں کے سلے ہوئے تھے ۔ غرض پارچہ جات میں کوئی چیز چھوٹی ہوئی نہیں تھی ۔ اسی طرح زیور بھی ماموں انور حسین صاحب کی معرفت خوبصورت پائدار بنوایا تھا کہ دن رات پہننے پر ایک نگینہ بھی جھڑتا نہ تھا ۔

کانوں میں طلائی پتے ، بالیاں ، بجلیاں ، سہارے اور مرصع قابل دید جھلنیاں دی تھیں ۔ گلے میں جڑاؤ زیور الگ طلائی الگ ۔ مالا ، گلوبند ، چمپا کلی ، جوشن ، نونگے ، انگشتریاں ، کڑے ، کنگن ، چوہے دتیاں ، مرصع پونہچیاں ۔ پاؤں میں چوڑیاں وہ بھی طلائی اور انگوٹھوں کے چھلے ۔

کھانے کا پورا پورا اہتمام ماموں انور حسین کے ذمہ تھا۔ جو پنجابی لوگوں کے باورچیوں سے پکوا کر وقت مقررہ پر ڈوییوں میں لا کر پہنچا دیتے۔ ذرہ سی دیر نہ سویر، جو کام تھا عمدہ ۔جلد اور وقت پر کہ کسی کو شکایت کا موقع ہی نہ تھا۔

چنانچہ ماموں سے لے کر سانچق، برات، چوتھی، چالے سب کا انتظام ان کے حوالے کردیا گیا۔ شادی سے پہلے اور بعد کی جتنی مہمانداری رہی ان کا کھانا بھی بے کھٹکے یکتا رہا۔ پہلے سے جھالہ، کتھا، الائچی، زردہ، پان کا اہتمام امتہ الحبیب کے ذمہ ہوا۔ مٹی کے برتن جن کا دہلی کی تقریبوں میں رواج تھا اس لئے کہ ہر ایک کا کھانا الگ الگ جگہ نکالا جاتا۔ پہلے سے بنوا ڈھلوا کر رکھ دئے۔ پانوں کی صافیاں تک سلیں، تولیے، صابن، بیسن، کھلی، منجھن، تیار کرادیا۔ سب برتنوں پر قلعی کروائی گئی۔ جہیز کے برتن قلعی کروائے گئے تھے ان پر نام بھی کندہ کرا دیا گیا۔ دولہا کے واسطے جوڑے کے علاوہ خلعت بھی دیا گیا۔ جو دہلی کے متمول لوگوں میں دیا جاتا ہے۔ یہ خلعت سات پارچہ، گیارہ پارچہ، اکیس پارچہ کا ہوتا ہے۔ جس میں پورے تھان کے تھان ہوتے ہیں۔ دولہا کے شہانے کا سامان سلامی، شادی، چوتھی، چالوں کی جو دی جانے والی تھی اس کے واسطے روپے اشرفیاں صابن سے دھوکر چمکدار کئے گئے۔ دوشالے بھی پارچہ کے ساتھ دئے جانے ہیں اس کے رنگ پسند کر کے لئے گئے۔

بہنوں، بھاوجوں، بھانجیوں، بھتیجیوں کے علاوہ چماریوں، نوکروں، نائی، بہشتی، مہترانی کے جوڑے، دومنیوں کو دئے جانے کے دوپٹے ٹاکے گئے۔ اپٹنا، پیندان اور حصے بخرے بانٹنے کے واسطے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ سب مہیا کرلیا۔ اور سامان ہلکا پھلکا نہیں سب ٹھوس اور عمدہ۔

اس مکمل تیاری پر اس سستے زمانے میں دس ہزار روپے صرف ہوئے اور ایک چیز بھی ایسی نہ رہی کہ یاد نہ رہی ہو۔ نا کوئی اس کو نام رکھے نا کسی چیز کی کمی رہی ہو۔

اس رشتہ میں صرف دو باتوں پر نظر کی گئی کہ دولہا اپنے بھائی کا بیٹا ہے اور بچپن کی منگنی ہے۔ دولہا اس رشتے سے شاد شاد تھے۔ ادھر بھی سب تیاریاں مکمل تھیں۔ رت کا جوڑا، چوتھی کا جوڑا اور اس کے علاوہ کئی جوڑے بھاری بھاری، زیور میں مرصع جھومر جو اعلیٰ درجے کا تھا اور مرصع جھپکے کے بالے۔ پاؤں میں بھاری طلائی لچھے۔ سہ، انگوٹھی، چھلے۔

مہمان سب اپنے خاندان کے۔ دونوں طرف کے مدعو لیے ہوئے۔ بھاری بھاری سمدھنیں۔ ۔ دولہا کی طرف سے آئیں۔ ہنسی، مذاق، دل لگی، دنا، نحانا، خوشی اور شادیانے ۔۔ نو حسن تھی ہی دولہا سالی تھی کوانے خوبصورت، خوش مذاق تھے۔ ساری شادی خوش مذاق لوگ رہے۔ سوا مہینے مہمانداری رہی۔ گوالیار سے سب عزیز مہمان آئے، سا ۔۔ بھاری بھالی والے برابر مہمان رہے۔ شادی پوری رسومات کے ساتھ ہوئی۔ سہرے کے ۔۔ جلد سے دریافت کیا کہ کیا باندھا جائے گا تو ابا جان نے فرمایا کہ مجھ سے ۔۔ کو اختیار ہے ان سے دریافت کرو یعنی دولہا کے والد صاحب سے۔ چنانچہ ان ۔۔ سہرا باندھا گیا۔

دولہا کا مکان تو بالکل ہی قریب چھتے والی حویلی تھا ۔ گلیوں میں لے جاو تو دو پیسے ڈولی تھا ۔ لیکن برات بڑی دھوم دھام سے خوب گشت کرتی ہوئی دلہن کے گھر آئی ۔ مردانہ سب دیوان خانہ میں اور زنانہ تیرھی حویلی اور چھتے والی حویلی میں تھا مہمانوں سے گھر گونا گوں بھرا ہوا ۔ پاؤں کے زیوروں کی جھنکار سے دل کے کنول کھلے جاتے ہیں ۔ بچے جھم جھم جھم کی اچکنیں پہنے سروں پر مصالحہ کی ٹوپیاں ۔ سرمہ لگائے نیل ڈالے ہوئے خوش خوش بشاش بشاش ہیں ۔ باپوں کی بتاریاں آباد ہیں ۔ دلہن کو صبح کو غسل کروایا ۔ اندر کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا ۔ باہر سے وکیل اور گواہ دلہن کا عندیہ لینے آئے کہ عقد منظور ہے یا نا منظور ۔ خوب وقت پر پوچھا کہ اگر کوئی دلہن انکار کردے تو جوسوں سر دال بٹے اور نہکا فضیحتی ۔ اب گواہ تو اپنا فرض ادا کر رہے ہیں وکیل صاحب وکالت کا کام انجام دے رہے ہیں ۔ دلہن کی رویے روتے آنکھیں سوج گئیں ، سبکیاں لے رہی ہے ۔ میراثنیں اسے گیت گارہی ہیں کہ بتی پرائی ہوگئی ۔ اب اس پر والدین کا کوئی حق ہی نہ رہا ۔ پالا پوسا ، چودہ ، پندرہ برس کیجے سے لگائے رکھا اب وہ دوسروں کے حوالے ہو رہی ہے ۔ ہمارے ہاں دلہن وہی بوی بناتی ہیں جن کا سہاگ مشہور ہوتا ہے ۔ سارے خاندان میں اماں جان ہی سے دلہن بنانے کی خدمت لی جاتی تھی ۔ اپنی لاڈلی بیٹی کو بھی اماں ہی نے دلہن بنایا ۔ اس طرح کہ تیل لگایا چوٹی گوندھی ، بادلے کے سنہری تار لبٹ کر جوٹی کو خوش نما بنایا جاتا ہے ۔ جوٹی گندھ چکی تو منھہ ہاتھ دھلوایا ۔ سرمہ مسی لگائی ، پان کھلایا ، رنگ کا جوڑا ، سبزاطلس کا ایک برہ پاجامہ جس پر روپہلی لچکہ لگا ہوا ۔ ریشمی باریک سرخ ململ کا دوپٹہ اور اسی کا خوب لمبا کرتہ اس پر بھی ٹھپہ لگا ہوا ۔ اب عطر سہاگ عطر موتیا کو گلاب میں حل کر کے تمام جسم پر مالش کی کہ رگ رگ خوشبو سے مہکنے لگی ۔ اس کے بعد سب زیور پہنایا ۔ پھولوں کا گہنا پہنایا ، جوتی بھی پہنا دی اور سب مہمانوں نے بار بار دلہن کو دیکھا اور باچھیں کھل گئیں ماشا اللہ دلہن کا کیا دیکھنا؟ چاند چمک رہا ہے جب دلہن کو آراستہ کرنے کے بعد سب بار بار دیکھ چکے تو باہر صدر دالان میں مسند تکیہ لگا کر دولہا میاں کو بلوالیا ۔ ڈومنیوں کی آوازیں تیز ہوئیں ۔ گانا زوروں پر ہونے لگا ۔ سب کی نظریں باہر کی طرف لگی رہیں کہ اب دولہا آتا ہوگا ۔ سب حسین بہنیں ڈیوڑھی پر انتظار میں کھڑی ہیں کہ دولہا کے سر پر آج ان کو آنچل ڈالنا ہے ۔ جوں ہی دولہا میاں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا بہنوں نے اپنے نوئی ٹھپہ کرن آنچل کے دوپٹہ کے جھمجھماتے ہوئے آنچل سب طرف سے دولہا کے سرپر ڈالے ۔ دولہا میاں ؛ مردانہ حسن پھٹا پڑتا ہے ۔ اس پر گلابی شیروانی ، گلابی پگڑی ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی ..ہے ، ریشمی سرخ دستی رومال ہونٹوں پر رکھے ۔ خراماں خراماں اندر داخل ہوئے ۔ ڈومنیوں نے کہا "اے اللہ کی اماں"، شادی شادی دولت باد شادی مبارک ۔ سب کی نگاہیں دولہا پر جمی ہوئی ہیں ۔ دولہا مسکرا مسکرا کر اپنی بہنوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں ۔ بہنیں شاد ہو رہی ہیں ۔ مسند پر دولہا بیٹھ گئے ۔ اور تقاضا ہونے لگا بھئی اب دلہن کو لے آؤ اور مہمان بیویاں اب دلہن کے کمرے کا رخ کرنے لگیں ۔ بچیاں دوڑیں ، سارا کمرہ بھر گیا ۔ مسند کے آس پاس اول ہی سے سمدھنیں بیٹھ گئیں کہ دلہن دولہا سے بالکل قریب رہیں ۔ دلہن کا انتظار ہو رہا

ہے ۔ دلہن والوں کی طرف سے شربت پلائی کی رسم خوب ہنسی مذاق کے ساتھ ہوچکی ہے ۔ اب بڑی بڑی چمکدار سینیوں میں بن دھنیا ، کتری ہوئی چھالیا ، الائچیاں لائی گئیں ۔ سمدھنوں کی طرف سے ماماؤں نے ان چیزوں کو اپنے کپڑوں میں خالی کر لیا ۔ اب سب مہمانوں کے جھرمٹ میں دلہن کو گود میں اٹھا کر لائے ۔ مسند پر دولہا کے سامنے لا بٹھایا اور ایک بیوی نے جو دلہن والی ہیں دلہن کو دبا دبو کر بٹھا لیا ۔ بہنیں کان میں دولہا سے باتیں کر رہی ہیں آج غلام بننا پڑے گا ۔

دولہا :—اور تم غلام کی بہن—اے ہے بڑی شرم کی بات ہے ۔

ایک بہن :—میں بتادوں؟ غلام کے بدلے گلاب کہہ دینا ۔

دولہا :—تمہارے دولہا میاں نے ایسا ہی کہا ہوگا؟ جب ہی تو یہ ترکیب یاد رہی ۔

ایک :—اوئی دولہا کیا بے حجاب ہے ۔ اے ذرا تو شرم کرو ۔ دلہن سنے گی تو کیا کہے گی ۔

دولہا :—یہ سن سکتی ہیں؟

بہن :—اور نہیں تو کیا دشمن بہرے ہیں ۔

لو وہ قرآن شریف اور آئینہ آگیا ۔ آرسی مصحف ہونے لگا ۔ وہی غلامی کی خوشگوار تکرار ہونے لگی ۔

اے کہدو نا ایسی چاند جیسی دلہن کے غلام نہیں تو اور کیا ہو ۔ بولو آنکھیں کھلواؤ ۔ شرم کاہے کی ۔ کہدو بیوی میں تمہارا غلام ہوں ۔ ساری عمر خدمت کروں گا ۔

ایک بہن :— اور یہ بھی کہدو جوتیاں اٹھاؤں گا ۔

دولہا :—جوتیاں تم شوق سے اٹھا لینا ۔

بہن :—چلو یہی سہی ۔ کوئی عزت تو جاتی نہیں بھاوج کی جوتیاں اٹھانے میں ۔

ایک بیوی :—اے کہدو میاں ۔ سب کہتے ہیں کیا حرج ہے ۔

دولہا کو پس و پیش ہے اور ہر طرح ان الفاظ کو کس پیرایہ میں ادا کیا جائے ، سوچ رہے ہیں ۔ لو بھئی کہدیا اب تو غلام بن گئے ۔

اب اللہ کا نام لے کر قرآن شریف کھولو ۔ سورہ اخلاص پڑھ کر ماتھے پر دم کرو ۔ خدا ایسا فرماں بردار رکھے کہ اس کی جوتی دیکھ کر کسی کا منہہ نہ دیکھو ۔ میراثنیں گا رہی ہیں ۔ بنوں ہریالی گھونگٹ کھول ۔ سدا متوالی گھونگٹ کھول ۔ تیرے گھونگٹ میں چندا براجے ۔ بنڑا پایا انمول ۔

میری ہریالی گھونگٹ کھول　　اماں کی پیاری گھونگٹ کھول
راج دلاری ۔ گھونگٹ کھول　　باوا کی پیاری گھونگٹ کھول
ایک لکھ دوں گا گھونگٹ کھول　　دو لکھ دوں گا منہہ سے بول
میری ہریالی گھونگٹ کھول

گیت

بنا میرا سج گیا ماں ۔ سنہرے گوٹے میں
سنہرے گوٹے میں ۔ روپہلے گوٹے میں
باوا پیارا سج گیا ماں ۔ سنہرے گوٹے میں
بہنوں پیارا سج گیا ماں ۔ سنہرے گوٹے میں

ان گیتوں کے بعد منڈھا گانا شروع ہوا تو سب ہی کا دل بھر آیا اور دلہن تو سسکیاں لے ہی رہی تھی ۔ آج اس کی ساری خوشی پر اوس پڑی ہوئی ہے ۔ اس کو بار بار یہ خیال ستا رہا ہے کہ میرے کنوارپنے کا زمانہ آج ختم ہوا ۔ آج میرے کمزور کندھوں پر زندگی کا جوا رکھ دیا گیا ۔ یہ بار عظیم مجھے اٹھانا ہے ۔ سمدھنوں کی جلدی سے بارے اب فینس دروازے پر آئی ۔ اب دولہا نے دلہن کو اٹھوا کر فینس میں سوار کروا دیا ۔ سب کی آنکھیں اس میں سے پرنم تھیں ۔ دلہن کو سوار کرا کے دولہا مردانے میں سدھارے ۔ سب عزیز باہر منتظر کھڑے تھے ۔ دولہا کو گود میں اٹھا کر سفید براق ، زیور پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار کرا دیا ۔ پیچھے ننھا سا بچہ شاہ بالا بیٹھا ۔ دلہن کے ساتھ ان کی نندیں بیٹھیں ۔ پالکی پر کارچوبی پردہ پڑا ہوا دولہا کے گھوڑے کے پیچھے پالکی لگا دی ۔ دونوں دلہن دونوں کی سواریوں پر گنگا جمنی مورچھل ہلتے ہوئے ۔ سارے معزز مہمان دولہا کے ساتھ پا پیادہ چل رہے ہیں ۔ شہدوں کی چیخ پکار ہے ۔ دولہا دلہن پر سے برابر چاندی کے پھول شہدوں کے واسطے پھینکے جا رہے ہیں ۔ پالکی کے پیچھے جگمگاتا ہوا چھپر کھٹ آرہا ہے جس پر زر تار پردہ ہوا سے ہل ہل کر بہار دے رہا ہے ۔ اس کے پیچھے پورا جہیز حماریوں کے سروں پر دور دور تک پھیلا ہوا چلا آرہا ہے ۔ بازار والے سب دوکانوں پر کھڑے ہوئے سڑکوں پر ٹھہرے ہوئے برات کا تماشہ دیکھ رہے ہیں ۔ ہر ایک کا چہرہ بشاش ہے ۔ شاید دولہا کے دل کی بشاشت کا اثر ہے ۔ اب یہ برات خوب گشت لگاتی ہوئی بڑی دھوم دھام سے نراے کے پھاٹک میں داخل ہوئی اور جھتے والی حویلی کی ڈیوڑھی میں سب اترے ۔ مہمانوں کی بگھیاں پہلے یہاں پہنچ چکی تھیں جن کو برات آنے کا بے حد انتظار تھا ۔ آواز کے ساتھ ہی سب چھتوں پر دوڑے اور وہاں سے دیکھنے کے بعد دروازے پر ہجوم ہوا ۔ دولہا سے دلہن کو اتروانے سے پہلے بکرا پالکی پر سے صدقہ کر کے حلال کیا اور اس کا خون دلہن کے پاؤں کے انگوٹھوں کو لگانے کے بعد دلہن کے پاؤں دودھ سے دھلائے ۔ اس کے بعد دولہا نے اس خوشگوار بوجھ کو اتارا اور سب کے ساتھ ساتھ چل کر صدر دالان میں مسند پر بٹھا دیا ۔ دولہا سے بے تکلف بیویاں ہر ہر قدم پر اب بھی مذاق کر رہی ہیں اور دولہا ترکی بہ ترکی جواب دے رہا ہے ۔

مذاق کرنے والی زیادہ تر اپنی چچا زاد بہنیں ہیں جن سے بھاوج ہونے پر دوہرا رشتہ ہو گیا ہے ۔ بھاوجوں کا اور دیور کا مذاق چلتا رہتا ہے ۔ تھوڑی سی دیر کے بعد جب مہمانوں اور دولہا دلہن نے ذرا دم لے لیا تکان دور ہوئی تو دلہن دولہا کے واسطے دسترخوان بچھا کر اس پر ست کولوں کی کھیر لا کر رکھی جس پر پستہ بادام پڑے ہیں ، چاندی کے ورق لگے ہوئے ہیں ۔

سب اس دستر خوان کے چاروں طرف آ جمع ہوئے ۔ میرابس گا رہی ہیں ۔ دولہا کی طرف سے دلہن کو اور دلہن کی طرف سے دولہا کو کھیر کھلائی جا رہی ہے ۔ اس موقع پر لڑکی بالیاں جو بے تکلف ہوتی ہیں ۔ جب دولہا دلہن کے ہاتھ کا نوالہ منہہ سے لینے کو جھکتا ہے وہ نوالہ اچک لیتی ہیں ۔ اور دولہا کو خوب خوب ستا کر جواب سوال کرتی ہیں ۔

کھیر کھلائی کی رسم کے بعد اب باہر سے پھوڑے کی دیگیں آئیں ۔ اور دھیں ۔ سارا گھر خوشبو سے مہکنے لگا ۔ دستر خوان بچھایا اور سب نے تناول طعام سے فراغت حاصل کی ۔ دلہن کے واسطے بالا خانہ کا کمرہ آراستہ کیا تھا یہ کمرہ خاص ان کے واسطے تھا ۔ پانی کی صراحی گلاس اور ضروری سامان کہ کسی بات کی تکلیف نہ ہو ۔ صدر میں مسند تکیہ لگا ہوا ۔ شہ نشین میں خوبصورت گلوب کا دو بتی کا صاف اور روشنی دینے والا لیمپ رکھا ہوا ۔ کھونٹی پر دولہا کا سہرا اور پھولوں کا گہنا اس سجاوٹ میں اضافہ کر رہا تھا ۔

دس گیارہ بجے دلہن کو اوپر لا کر چھپر کھٹ میں آرام کرا دیا ۔ اور ساتھ والیوں کو ان کے پاس رہنے کی ہدایت کر دی ۔ وہ دونوں اوپر ہی رہیں ۔ اس کام سے فارغ ہو کر سب نے اپنے اپنے بستروں پر جو ساتھ لائے تھے آرام کیا اور سب نے ایسا اطمینان کا سانس لیا گویا ایک گڑھ جیت لیا ۔

صبح کو رو نمائی کی رسم ادا ہوئی سب مہمان تازہ دم ہو کر لباس تبدیل کرکے اس تقریب کے واسطے دلہن کے آنے کا انتظار کرنے لگے ۔ بے تکلف بہنوں نے اوپر جا کر دلہن کو آراستہ کیا ۔ نیچے لا کر سب کو سلام کروایا اور مسند پر بٹھا دیا ۔ سب نے چاروں طرف سے دلہن کو گھیر لیا ۔ منہہ دکھائی ہونے لگی ۔ بار بار دلہن کو دیکھنے لگے ۔ منہہ دکھائی میں کسی نے زیور کسی نے انگشتریاں کسی نے نقدی دی ۔ سب شاد شاد ہیں ۔ اس شادی میں بزرگ بیوی نو بڑی چچی صاحبہ تھیں جن کے صلاح مشورے سے شادی کا ہر ایک کام سر انجام پایا اور منتظم دولہا کی حقیقی ہمشیرہ صاحبہ ارجمند جہاں بیگم تھیں ۔ جنہوں نے اپنی والدہ صاحبہ کے بعد سب بھائیوں کو سنبھالا اور ان کی وجہ سے گھر بہت عمدگی اور سلیقہ سے چلتا رہا ۔ شادی کا جو کام ہوا بہت معقولیت سے ہوا ۔

رونمائی میں آنے والے مہمانوں میں ہماری اماں جان بھی تھیں جو دولہا کی چچی ہونے کی حیثیت سے تشریف لائیں اور دلہن کے گلے میں منہہ دیکھ کر طلائی مالا پہنا دی ۔ دلہن حسب دستور اپنے میکے واپس گئی اور شام کو چوتھی کی تقریب بڑے شوق و ذوق سے منائی گئی ۔ میوے اور ترکاری کے خوان ۔ پھولوں کی گیندیں ، پھولوں کی جھڑیاں سب سامان خوانوں میں آگیا ۔ اور سہ پہر کو مہمان آنے شروع ہوئے ، سمدھنیں سج بن کر چوتھی کھیلنے آموجود ہوئیں ۔ ہنسی مذاق ہونے لگا ۔ میراثنیں اپنا حق لینے کے لئے گالیوں کے گیت گا رہی تھیں ۔

بعد مغرب رنگیلے مسخرے دولہا میاں اسی طرح سجے بنے زنانہ میں آئے ، چوتھی کی رسم ادا ہونے کے بعد خوب زور دار چوتھی کھیلی گئی ۔

دولہا کو تو آرزو تھی کہ کنواری باؤلی والی لڑکیوں سے مقابلہ ہو تو دیکھیں کہ کون ور رہتا ہے ۔ لڑکیاں بھی کھیل کود کی شوقین ۔ دولہا کو تاک تاک کر مارتیں اور خوب خاص ۔ اب دولہا میاں کی باری آئی جوں ہی لڑکیاں مار کر اندر بھاگیں وہ ان کے پیچھے دلہن کے کمرے میں گھس گئے ۔ اس کمرے میں آپا کے پاس بھابی فردوسی بیگم تھیں وہ ڈر کے مارے چھپی بیٹھی تھیں کہ چوٹ نہ لگ جائے ۔ ان کے ہاں بچہ ہونے والا تھا ۔ جوں ہی دولہا نے اندر قدم رکھا ، آپا جو دلہن بنی ڈر کے مارے چیخنے لگیں "اے ہے بھابی ہیں ۔ اے ہے بھابی ہیں"۔ ان کی بے اوسانی پر سب ہنس دیے ۔

بھابی کی ایک تو شرم کی عادت اور دوسرے سسرال ۔ تیسرے حمل کی شرم کہ پیٹ کا ذرہ سا ابھار بھی کسی کی نظر میں نہ آئے ۔ لیکن چوتھی سے نہ کوئی بھی محفوظ نہ رہا ۔ زور دار چوتھی کھیلنے کے بعد دولہا نے اور سب نے شب کا کھانا کھایا پھر دولہا دلہن رخصت ہوئے ۔ آج بھی دلہن کو دولہا سے اٹھوا کر سوار کروایا جاتا ہے اور دلہن کے سولہ سنگھار ہوتے ہیں ۔ پھول پہنائے جاتے ہیں ۔ دولہا کو سلامی دی جاتی ہے ۔

مہمان شب باش ہوئے ۔ دوسرے دن اماں جان کی طرف سے چالہ تھا ۔ خوب مہمانداری اور ڈنا بجانا رہا ۔ اب چالوں کا سلسلہ جاری ہوا ۔ جو ایک ایک دن ہر ایک عزیز کی طرف سے ہوتے رہے ۔

ایک مزیدار بات یاد آئی ۔ دلی اور خصوصاً بیرم خان کے تراہے میں جو خاص مغلی والوں کا محلہ تھا ۔ مکان اس طرح کے ہیں کہ نیچے گلیوں میں سے تو پیدل کا راستہ ہے ڈولیوں میں بیویاں آتی جاتی ہیں اور اوپر سے پختہ چھتیں ایک مکان سے دوسرے مکان تک اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ دوسرے محلے تک پہنچ جاؤ ۔

ابا جان کے مکان ڈیڑھی حویلی سے آپا کی سسرال چھتے والی حویلی کی چھت ملی ہوئی تھی لیکن آنے جانے کا راستہ نہ تھا ۔ دیوار نیچی تھی کہ ادھر کے آدمی ادھر اور ادھر کے آدمی ادھر نظر آتے تھے ۔ آپا جان کی شادی ہوئے چند دن ہی گزرے تھے اور ان کے نہ ہونے سے سب کے دل اداس تھے ۔ ایک دن ابا جان جو اپنے مکان کے بالا خانے پر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ آپا اپنے کمرے کے سامنے کھڑی ہیں ۔ ابا کی ان پر نظر پڑی تو فرط محبت سے ادھر ابا کا دل بے تاب ہوگیا اور ادھر آپا کا دل بھر آیا ۔ رونے لگیں ، ایسا معلوم ہوتا کہ اب بس اس گھر سے الگ ہوکر بیاہی بیٹی پڑوسن داخل کی مصداق ہوگئی ۔

ابا جان نے اماں کو آواز دی کہ بیوی ادھر آنا ۔ اماں نے اوپر جانے کے بعد عجیب نظارہ دیکھا کہ ادھر تو آپا کھڑی رو رہی ہیں اور ادھر ابا کی خوبصورت آنکھیں پرنم ہیں ۔ اس کے بعد بڑھئی کو بلا کر دیوار میں کھڑکی لگوادی ۔ پھر تو آپا کا معمول تھا کہ روز ناشتہ کرنے کے بعد سسرال سے میکے آجاتیں ۔ یہاں ان کے واسطے کھانا رکھا رہتا ۔ وہاں شرما کر برائے نام کھاتیں اور یہاں کھانا کھالیتیں ۔

بھائی صاحب بڑے سرور تھے ایک دن ان کے پیچھے ہی آگئے اور بولے اچھا یہ معاملہ ہے نقد مال اڑائے جاتے ہیں۔

دھلی میں دلہنوں کے ساتھ جو عورت بھیجی جاتی ہے اس کو ساتھ والی کہتے ہیں اس کے ساتھ سبکے سے کھانے پینے کا ذائقہ دار خشک سامان دے دیا جاتا ہے کہ دلہن شرما کر سسرال میں نہ کھا سکے گی۔ موقع دیکھ کر الگ بٹھا کر کھلا لینا۔ دلہن بالکل برائے نام کھاتی ہے۔ سسرال والیاں چھیڑتی ہیں کہ بوا ہماری دلہن تو چڑیا کی جیب، مانڈے کا بھبولا کھاتی ہیں۔ ادھر سے ایک نند نوالہ دے رہی ہیں ادھر سے ایک دے رہی ہیں۔ دلہن کو منہہ چلاتے بھی شرم آتی ہے۔

سعیدی بیگم کی پیدائش:

رجب کی ۲۷ کو ۱۸۹۵ء میں آپا کی شادی ہوئی اور دو مہینے چالے کی دعوتوں میں گزرے۔ رمضان کے مہینہ میں بھابی فردوسی نے پورے روزے رکھے۔ ۲۹ تاریخ کو روزہ کھولنے کے بعد جب کہ ان کا نو ماسہ ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے۔ ولادت کے آثار معلوم ہوئے۔ بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ آج طبیعت ناساز ہے۔ اماں نے جھٹ ایک آدمی کو مع ڈولی کے ان کی والدہ اور نانی صاحبہ کے پاس بھیجا اور ایک آدمی قابلہ کو بلانے دوڑ گیا۔ آپا تو اس دن گھر ہی میں تھیں آناً فاناً سب تیاری ہوگئی۔ رات کا وقت تھا، ابا جان عید کرنے حیدر آباد سے دھلی آئے ہوئے تھے۔ دونوں بھائی علی گڑھ سے عید کرنے آگئے۔ کل صبح کو عید ہونے والی تھی کہ سعیدی بیگم کی ولادت ہونے کے سامان ہونے لگے۔

صدر دالان میں اماں کا مبارک چھپر کھٹ تھا اس پر برف سی چادر ہے۔ سامان جو زچہ بچہ کے واسطے پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا سب نکال کر رکھ لیا۔ روئی کے پردے دالانوں کے چھوڑ دیئے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ خال خال بیویاں اندر رہیں۔ کنبہ کو اماں نے اطلاع نہیں کی۔ ان کو یہ بہت برا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت زچہ تو پریشانی میں رہے اور سب اس کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔ قریب قریب سے جن کو سن گن معلوم ہوئی وہ بے بلائے آگئے۔

دو بجے ہوں گے کہ اندر سے بچی کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے چاہا کہ اندر جا کر بچی کو دیکھوں کہ اماں نے روک دیا کہ ذرا سی دیر میں میں تم کو بلا لوں گی۔ مجھے بڑا شوق تھا کہ اماں کب بلائیں اور میں کب دیکھوں۔ جب وہ گھڑی آئی تو میں نے کیا دیکھا کہ بھابی کا چہرہ چاند کی طرح چھپر کھٹ میں چمک رہا ہے۔ دونوں ہاتھ منہہ پر رکھے ہیں سر کو کساوہ بندھا ہوا ہے۔ سرخ دوشالہ اوڑھے لیٹی ہیں۔ پائنتی منی سی بچی کو دوھرا کرتہ پہنائے سر کو کساوہ باندھے نہالچہ کے اوپر جھم جھم کی رضائی اڑھائے آپا لئے بیٹھی ہیں۔ سب بڑے شوق سے بچی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور اپنی اپنی رائے بیان کر رہے ہیں کہ بچی کس کی شکل ہے۔

بچی کو ذرہ سی ٹھیس لگ گئی تو نازک سر سں دو گومڑے آگئے۔ رنگ اسا سرخ تھا کہ سب کو اندیشہ تھا کہ کالی ہوگی۔ شاید اس چوٹ کی وجہ سے جو بھابی کو لانے میں چھپر کھٹ کی لگی بچی تکلف سے سرخ ہوگئی۔ صبح صبح سب کو اطلاع ہوئی تو ڈولیوں کا تانتا لگ گیا۔ سارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں۔ بعض ہم عمریں چھیڑ رہی تھیں کہ بھابی اسی بھی کیا جلدی تھی سوہاں تو کھالی ہوتیں۔ بعض کہنے لگیں لو بوا یہ اللہ ساں کی طرف سے تمہیں عیدی ملی ہے۔ ننھی سی گڑیا ہے اللہ عمر دے۔ نصیبہ اچھا کرے۔

کوئی کہتی بوا بچی سمجھدار ہے جب رمضان سربف حمر سے گزر گئے ماں نے اطمینان سے پورے روزے رکھ لیے تو دنیا میں آئی ہیں۔ خدا ساتھ خیر کے چلہ نہانا نصیب کرے۔

کوئی کہتیں چچی اماں جیسی آپ نیک ہیں ویسی ہی نیک بہو بھی ملی۔ سرم کی، حیا کی، کم سخن، نیک مزاج۔

اے بی دادا کو خوشخبری دے دو کہ خدا نے ساتھ خیر کے پوتی دی۔

کوئی کہتا اے بی بیٹی کیا بیٹا خدا نیک نصیب کرے۔ ماشاءاللہ صورت سے بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ ماں باپ دونوں حسین، بچی کیوں نہ حسین ہوتی۔

ماں کی شکل ہے۔

نہیں یہ ماں سے زیادہ اچھی نکلے گی۔

ابا جان کو بلایا۔ سب نے مبارکباد دی۔ وہ مسکرائے سب نے سلام کیا دعا دی۔ ہمارے دادا ابا نے یعنی بچی کے پر دادا نے کان میں اذان دی۔ شہد چٹایا۔ ابا جان نے عید سعید کی مناسبت سے سعیدی بیگم نام تجویز کیا۔ اے بی بچی بھوکی ہیڑ ہیڑ کر رہی ہے۔ ماں نے پورے روزے رکھے ہیں۔ دادا سے شہد چٹواؤ ان کو غصہ نہیں آتا۔ کہتے ہیں غصہ والا آکر سہد چٹائے تو بچہ غصیلا ہوتا ہے۔ نام سب کو پسند آیا کہ بہت موزوں ہے چھوٹا سا پیارا نام ہے اور نیا ہے۔ آج سارے عالم میں عید کی خوشی ہو رہی تھی اور ہمارے ہاں تو عید دوہری ہوئی۔ بلکہ تہری چوہری کہ ابا جان کے حیدر آباد سے اور بھائیوں کے علی گڑھ سے آنے کی بھی خوشی عید سے کم نہ تھی۔ روز روز مبارکباد کو لوگ آتے رہے۔ ابا جان بھائیوں اور ہم نے غسل کیا۔ عید کے کپڑے پہنے۔ مردوں کا لباس حیدر آبادی شیروانی اور ترکی ٹوپی تھا۔ عید کے دن ابا جان اپنی خوبصورت آنکھوں میں سرمہ لگاتے، شیر خورمہ ضرور پکتا، عطر ضرور لگاتے اور عید گاہ جب تشریف لے جاتے تو اماں جان گھر کو فرش و فروش سے آراستہ کرکے گھر کی کایا پلٹ کرتیں۔ ابا جان اور بچے عید گاہ سے آتے تو بازاری خستہ کچوریاں، گولے کے کباب، مٹھائی اور بچوں کے واسطے کھلونے لاتے۔ ان کے آنے کے بعد سب آپس میں عید ملتے۔ پہلے ابا اور اماں کو آداب کرتے اس کے بعد سب سے عید ملتے۔ گھر میں گانا ہوتا رہا۔ خوب دھوم دھام رہی۔ ساتویں دن عقیقہ ہوا۔

بالوں کو روپے میں تول کر روپیہ خیرات کر دیا اور بالوں کو آٹے کے اندر رکھ کر گولی بنا کر ندی میں ڈلوا دیا۔

چھٹی کے روز زچہ بچہ کو غسل کرانے کا دن آیا۔ دیگوں میں پانی گرم ہوا۔ چھپر کھٹ سے ملے ہوئے کشادہ حجرے میں چوکی بچھا کر دروازے بند کر کے دائی نے پہلے بچی کو نہلایا اور آپا کو دے دیا۔ آپا نے اس کو صاف تولیہ میں لپیٹ کر چھپر کھٹ میں لا کر دوہرا گرم کرتہ پہنایا۔ سر کو کساوہ لپیٹ کر کنٹوپ پہنا دیا۔ سرمہ لگایا اور پان کے ٹکڑے پر کتھا چونا لگا کر صاف پنکھی میں اس کو باریک پیس لیا۔ اور ایک صاف باریک کپڑے میں اس کی ایک ننھی سی پوٹلی بنا کر بچی کو پان کھلایا۔ یہ دوا سمجھی جاتی ہے کہ اس سے سینہ گرم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو رضائی اڑھا کر کوئی گود میں لے بیٹھا۔

بچوں کو بھی بچی کو گود میں لینے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اور تقاضا لگاتے ہیں کہ ہم کو دیجیے۔ باری باری سب نے بچی کو گود میں لیا۔ دائی نے ایک تانبے کے بادئیے میں نل کی سفید کھلی میں میٹھا تیل ڈال کر پانی ڈالا۔ وہ ذرا سی دیر میں پھول کر سفید ہو گئی۔ اب پردے چھوڑ کر زچہ کے جسم پر وہ ملی اور بچی کو دودھ پلوانے کے بعد آہستہ سے نہانے کی چوکی پر لے گئے دروازے بند ہیں۔ آٹے کا دودھ ایک چینی کے کٹورے میں بنا کر اس میں ہرا پان اور ایک چمکدار روپیہ ڈالا۔ نندوں نے آکر وہ دودھ زچہ کے سر پر پان سے لے کر ڈالا۔ یہ ایک رسم ہے جو غسل سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ کٹورہ مع روپئے کے دائی کو دیا جاتا ہے۔ زچہ کے پاؤں کے نیچے بھی روپیہ رکھ دیا جاتا ہے۔ غسل کے بعد زچہ کے اترے ہوئے کپڑے اور یہ روپیہ دائی کا حق ہوتا ہے۔

اب صرف دائی ہی نہیں بلکہ دو چار گھر کی بیویاں زچہ کے غسل خانہ میں رہیں۔ پانی کو سہتا سہتا سمو دیا اور گرم گرم پانی سے زچہ کو صابن لگا کر غسل کرایا۔ پھر اس کا ایک ایک جوڑ دھارا جاتا ہے ایک ایک جوڑ پر کئی کئی گرم پانی کے لوٹے لوٹنی سے ڈال کر ختم کئے جاتے ہیں۔ جب غسل کرچکے تو سرخ قند کی چادر اڑھا دی۔ ناک میں نتھ پہنا دی۔ آنکھیں بند کروادیں، قرآن شریف کھول کر زچہ کو دکھایا اور بچہ کو گود میں دے کر بچہ کو دکھایا اور آہستہ آہستہ اسی طرح چادر اوڑھے چھپر کھٹ میں لے آئے۔ پہلے جلدی جلدی بال خشک کئے۔ لباس پہنایا، بادام کا حریرہ پلایا، پان منہ میں دیا اور گرم سلا دیا۔ بچی اگر زیادہ بھوکی ہوتی تو ماں کے بال اس کے تالو پر مل کر دودھ پلوا دیا۔ پھر کالے دانے کا دھواں دیا کہ اس کی خوشبو سے گھر میں زچہ خانہ معلوم ہوتا ہے۔ ہوا صاف ہوتی ہے اور گرمی پہنچتی ہے۔ روزانہ شام کو کالا دانہ آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ بچہ کی ٹوپی، رضائی کو بھی اس کا دھواں دیا جاتا ہے۔ اس سے نظر گزر کے دور ہونے کا بھی خیال ہوتا ہے۔ شام کو مہمان بیویاں آنی شروع ہوئیں اور قریبی عزیز نانی، خالہ، ممانی، بہنیں، سہیلیاں بچی کے واسطے جھم جھم کے کرتہ ٹوپی، پاجامہ،

جوتی کشتیوں میں لگا کر اس پر کھیلیں بتاشے ڈال کر لاتی ہیں ۔ ایک ایک بنت بناؤ کا کرتہ ٹوپی ۔ ہسلی ، کڑے ، ٹیکہ ، باؤں کا زیور ، گھنگرو ، گلے میں چمپا کلی ، ننھے ننھے سے جو سن (بازو کا زیور) جنے لئے جھنجھنے وغیرہ لائیں ۔

سب کا لایا ہوا سامان سب کھول کر دیکھ رہے ہیں اور تعریف کر رہے ہیں ۔ اب زچہ اور بچی کو بھاری کپڑے پہنانے زیور پہنایا ٹیکہ لگایا ۔ ماں کی گود میں دے دیا ۔ ماں بھی جھومر لگائے نتھ پہنے بیٹھی ہیں ۔ شرم سے نگاہیں نہیں ملاتیں ۔ اے بوا بچی کو سنبھالو ۔ کہیں دسمن دور پار گر نہ پڑے ۔ سامنے میز لگائی اس پر ایک تھال میں سفید سفید خشکہ پر دودھ ڈال کر شکر بچھا دی اپنی برابر والیاں اطراف سے گھیرے کھڑی ہیں اور سب تماشا دیکھ رہے ہیں ۔ زچہ کے ساتھ ساتھ سہاگنیں تھال کھا رہی ہیں ۔ جب تھال کھا چکے تو یہ تھال دائی کے حوالے کیا اور کھانے کی سینی رکھ دی ۔ اس میں کئی طرح کے سالن ہیں اور ان کے علاوہ تورنن کا سالن بھی خصوصیت سے پکا ہے ۔ چھٹی کے دن زچہ کا پرہیز توڑ دیا جاتا ہے ۔ اور یہ صرف ایک دن کے واسطے رعایت ہے ۔ ورنہ روز صبح کو عناب ، سقمونیا کی اچھوانی دی جاتی ہے ۔ گوند سکھانے سنورے کا ناشتہ دیا جاتا ہے ۔ دوپہر کو انگیٹھی پر پکایا ہوا خوب گھی دار شوربہ اس میں پھلکے بھیگے ۔ شام کے کھانے میں مونگ کی دال کی خوب گھٹی ہوئی کھچڑی جس میں گھی زیادہ ڈالا جاتا ہے ۔ منہ صاف کرنے کو سونف کے دانے ۔ پانی بہت کم مقدار میں پینے کو دیتے ہیں ۔ زیادہ تر سونف کا اور گاؤ زبان کا عرق پلاتے ہیں جو کوری کوری سوندھی کلیا میں رکھتے ہیں اور ہدایت یہ ہوتی ہے کہ دانت بھینچ کر ذرہ ذرہ سا پیو ۔ ورنہ پیٹ بڑا ہوجاتا ہے ۔ زچہ کے پیٹ پر ململ کی پانچ گز لمبی پٹی بھی اسی خیال سے باندھتے ہیں کہ پیٹ بڑا نہ ہو جائے ۔

زچہ کو چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ زچہ خانہ سسرال میں ہوتا ہے ۔ شرم و حجاب دامن گیر ہوتا ہے جو دیا کھایا نا کھلونے کی طرح جس ڈل موڑا مڑ گئی ۔

رات گئے زچہ کو آہستہ آہستہ چلا کر باہر صحن تک لائے ۔ بچی کو گود میں دے دیا اور کہا لو تارے دیکھ لو ۔ اس کے بعد واپس چھپر کھٹ پر لے آئے ۔ گھر کے بزرگ اس رات کو نومولود بچے کے ہاتھ سے ایک کاغذ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھواتے ہیں کہ اسی رات کو قسمت لکھی جاتی ہے ۔ خدا مبارک کرے اس کے نام کی برکت سے قسمت اچھی ہو ۔

حسب دستور بھابی کے زچہ خانے میں بھی بھانڈوں کو اطلاع ہوگئی تھی ۔ لیکن دادا ابا کے ڈر سے زیادہ گانا بجانا نہیں ہوسکا کہ ان کی ڈیوڑھی قریب تھی ان کا احترام رکھنا ضروری تھا ۔ یوں میراثنوں کے آنے سے وہ ناراض نہ ہوتے تھے کہ وہ دائرے سے (ایک طرح کی دف) گاتی ہیں جو شرع میں جائز ہے اور ان کا حق ہوتا ہے کہ مدتوں کی لگی بندھی ہوتی ہیں ۔

جس طرح عورتوں میں شرم و حجاب کا مادہ تھا اسی طرح مردوں کے مزاج میں غیرت و شرم کا مادہ تھا۔ ہمارے بڑے بھائی کے مزاج میں بہت شرم تھی اندر آتے شرماتے تھے کہ اب بیٹی کے باپ بن گئے۔ لوگ چھیڑیں گے۔ بیٹی کی طرف کبھی دیکھتے بھی نہیں تھے۔

آپا مظفر جہاں کہتیں اے بھائی قسم ہے اس نے ابھی تم کو دیکھا تھا۔ لو ذرا گی ذرا لے لو۔ بھائی کہتے مجھے گھن سی آتی ہے۔ ہاتھ لگاتے جھرجھریاں آتی ہیں۔

بھابی کا دودھ اگوا دیا تھا۔ ان کو دودھ پلاتے بے حد شرم آتی۔ چھپر کھٹ کا پردہ چھوڑا جاتا اس پر بھی بچی کو گود میں دینے کے بعد وہ اوپر سے دوپٹہ ڈال لیتیں کہ کوئی ادھر دیکھ نہ لے۔ دونوں میاں بیوی کے مزاج میں شرم تھی۔ جہاں کسی نے بچی کا ذکر نکالا مسکرادئیے اور نظریں نیچی کرلیں۔ بچی کی دیکھ بھال اماں کے ذمہ رہی۔ بھابی کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا میری ممانی سیدہ بی خدا بخشے سعدی کا کام کرتی تھیں۔ کام کیا ہم لوگوں میں بچوں کا کام خود دادی نانی یا ماں کو انجام دینا پڑتا تھا۔ کپڑے بدلنا غسل کرانا پاؤڈر، سرمہ لگانا، صاف ستھرا رکھنا۔ ماما برائے نام رکھی تھی۔

سعدی گیارہ مہینے کی تھیں۔ جو آپا کو خدا کے فضل سے نواں مہینہ لگا اور ان کا نوماسہ ان کی سسرال میں ہوا۔ رسم کے جوڑے کی طرح سبز ایک بر پاجامہ سرخ ریشمی ململ کا دوپٹہ کرتہ۔ سفید مصالحہ ٹکا ہوا۔ ہاتھ پاؤں میں حنائی مہندی لگی۔ سوھن سلائی کی چوڑیاں پہنائیں۔ پنجیری بنی ناک میں نتھ پہنائی، گود بھری سب مہمان اس موقع پر جمع ہوئے۔ اب آپا کو پالکی میں ان کے میکے پاؤں بھرنے کو بھیج دیا۔ یہاں ان کے آنے کی سب تیاریاں ہوئیں تھیں۔ سب نے اترتے ہی ان کو گھیر لیا۔ اب شرم و حیا تو دنیا سے اڑ ہی گئی۔ سب مردوں کے سامنے بھی کمان کی طرح اکڑی رہتی ہیں۔ ایک رات کو کسی نے آ کر اماں سے کہا کہ خدا جانے کیا بات ہے اصغری رو رہی ہیں۔ اماں سمجھ گئیں کہ دال میں کالا ہے۔ انہوں نے سب سامان جو بچے کے واسطے تیار کر رکھا تھا نکالا۔ نہالچہ، دوھر، دولائی، رضائی، پونڑے، سر کے تساوے، دوھرے کرتے، سدریاں، جرابیں، کنتوپ، ٹوپیاں اور راہ دیکھنے لگیں کہ ذرا درد بڑھیں تو سسرال بھجوا دوں سسرال میں ان کی نند کو اطلاع کرا دی۔ وھاں سے پالکی آگئی۔ سسرال میں سب راہ ہی دیکھ رہے تھے کہ آپا اتریں، ہاتھوں ہاتھ اتروا کر ان کو لے گئے۔

اسی وقت انہوں نے پہلے تو دائی کو اور اپنی سوتیلی والدہ خورشید جہاں بیگم کو اور اماں جان کو ڈولی بھیجی۔ یکے بعد دیگرے سب آگئے اور تھوڑی دیر میں سارے عزیز جمع ہو گئے اور وہ رونق اور چہل پہل کہ گھر شادی خانہ معلوم ہونے لگا۔ سب کام آپا چھما بیگم اپنی والدہ کے حسب منشا کرتی تھیں کہ وہ مدبر، منتظم اور بزرگ سمجھی جاتی تھیں۔ ان کا تدبر اور وقار قابل تعریف تھا اور اپنی نیک طینتی کے سبب سب ان کا ادب کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے سوتیلے بچوں سے آنکھ ٹیڑھی نہ کی اور چچا ابا کو بہت آرام پہنچایا۔

چچی اماں مولانا فخر صاحب کے خاندان میں تھیں اور حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کی طرف سے ان دونوں بہنوں کا حصہ مقرر تھا جو سالانہ ان کو ملتا تھا۔

آپا کی عادت بہت ضبط کی تھی۔ اس تکلیف سے چہرہ پر ایک رنگ آتا ایک جاتا، منہ چوڑی کی کانچ ہوگیا۔ منہ پر رومال اوڑھے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے لیٹی ہیں اور سب ایک دم خیریت پوچھ رہے ہیں۔ بڑے بوڑھے کہہ رہے تھے کہ بیٹی منہ پر سے ہاتھ نکالو۔ دم گھٹ رہا ہے۔ منہ کی بھاپ تو نکلنے دو۔ آنکھیں نہ کھلنے آجائیں گی۔ چچا کا گھر ہے کسی غیر کا تو نہیں۔ سب اپنے ہی تو ہیں۔ بنو ایسا ضبط نہ کرو۔

جٹھانیاں اپنی چچا زاد بہنیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے شرم اسی دامن گیر ہے کہ کسی بات کی اجازت نہیں دیتی۔ سسرال میں وہ صرف بچوں سے بات کرتیں کہ وہ گھونگٹ میں گھس کر ان سے بات کرتے تھے اور جب آپا ان سے کبھی بات کرلیتیں تو فخر سے کہتے کہ چچی بیوی نے ہم سے بات کی۔ تم سے نہیں کی۔

ایک دن نہ دو دن پورے نو دن اسی پریشانی میں گزرے۔ تب خدا خدا کرکے سان نعیم الحق تولد ہوئے اور سب میں مبارک سلامت ہوئی کہ اللہ نے بڑا فضل کیا۔ بھابی سے زیادہ ان کے زچہ خانہ میں دھوم دھام رہی کہ اپنے ہی گھر کے آدمیوں سے گھر بھرا پڑتا تھا۔ جیٹھ جٹھانیاں ان کے بچے نوکر، ساس، نندیں آئے گئے مہمان، بڑا سا گھر اس میں ایک ایک دو دو کمرے سب کو ملے ہوئے۔ صدر دالان میں زچہ کا چھپر کھٹ بنا ہوا۔ آپا کے دولہا بڑے خوش مذاق آدمی تھے۔ وہ با ادب ضرور تھے۔ بے ادب بے باک نہیں تھے۔ مگر ہمارے بھائی کی طرح شرمیلے نہ تھے اور بہت شوقین، زندہ دل۔

بچے کے دادا ابا یعنی بڑے چچا خان بہادر مولوی محمد انوار الحق صاحب نے بچے کے کان پر اذان دی اور نام رکھا۔

چچا ابا کا مکان دوسرے محلے میں تھا اور دادا ابا کا مکان بھی کسی قدر فاصلے پر تھا اس لئے یہاں بھانڈوں کا گانا دل کھول کر ہوتا رہا۔ روز کوئی نہ کوئی ٹولی آجاتی۔ چلمنیں چھوڑ کر اندر بلا لیا جاتا۔ سب لڑکی بالیاں اور بچے کی دادی پھوپی چچی، نانی، سب کی طرف سے ان کو خوب بیلیں ملتیں اور شاد شاد جاتے۔

آخر دادا ابا سے نہ رہا گیا۔ ایک دن سنا کہ وہ فرما رہے تھے کہ اتنا گانا بجانا کیوں ہورہا ہے۔ کیا کسی ہیجڑے کے ہاں بچہ ہوا ہے۔ بچوں نے آکر ایک دن اڑایا کہ دادا ابا آرہے ہیں۔ بھانڈ بجائے ڈرنے کے بڑا خوش ہوا اور بولا کہ ان کے ہاتھ کا ڈنڈا کس کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم کو یہ فیض پہنچے تو مالا مال ہوجائیں۔ آج تو مولوی صاحب کے ہاتھ کی مار کھا کر جاؤں گا۔ آخر اس نے دادا ابا کی جا کر بے حد خوشامد کی اور ان سے ایک دوانی حاصل کرکے گیا کہ اسکا تعویز اپنے گلے میں ڈالوں گا۔

غرض خوب دھوم دھام سے چھٹی چلہ ہوا اور آپا چلہ نہا کر ساتھ خیر کے اماں کے ہاں آئیں۔ اس زمانے میں زچہ کو چلہ تک کوئی کام نہیں کرنے دیتے تھے۔ نہ سینا نہ چھالیہ کترنا نہ لکھنا پڑھنا۔ نہ دماغی کام بالکل آرام اور خوشی سے یہ دن گزارے جاتے ہیں کہ زچہ کے سب اعضاء کمزور ہوتے ہیں۔ مکمل آرام ملے، آنکھوں سے کام لینے سے آنکھوں کے امراض ہوجانے کا وہم ہوتا ہے۔ دماغ کی کمزوری سے بال سفید ہوں یا درد سر رہنے لگے۔ چلنے پھرنے سے رگ پٹھوں پر بار پڑکر طرح طرح کے روگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بچے کو گود میں لئے رہنے سے انسانی گرمی پہنچنا مفید سمجھا جاتا تھا۔ دودھ گھنٹوں کے حساب سے پلانا کون جانتا تھا۔ بچہ کو بھوکا دیکھا دودھ دے دیا کہ اس کا پیٹ ہی کتنا ہے ذرا سا ہیا، پیشاب کر دیا، پیٹ خالی کا خالی ہو گیا۔

بچوں کا علاج بڑی بوڑھیاں آسان آسان دواؤں سے کر لیتی تھیں۔ رونے بچے کو اللہ اللہ کہہ کر بہلایا جاتا تھا۔ اس کے کان کے پاس منہ لگا کر سریلی آواز میں کہتے اللہ بھلے بھائی اللہ بھلے۔ اللہ ربی اللہ بھلے۔ یعنی اس کے کانوں میں ابتداء ہی سے اللہ کا نام لیا جاتا تھا۔

آپا کو بچہ پالنے کا تجربہ نہاں تھا۔ عمر ہی کیا تھی وہ بھائی صاحب کے گلے کا ہار تھا۔ وہ ہلا جلا کر اسکو چپ کرتے۔ راتوں کو بھی جب بچہ رویا اٹھ بیٹھے اور گود میں لے ہلانا شروع کر دیا۔ اس سے بچے کو ایسی بری عادت پڑی کہ وہ دن رات ہلانے سے چپ رہتا۔ ورنہ بے چین ہوتا اور روتا۔

بچہ کی پرورش اگر پوچھو تو مغربی طریقہ پر درست ہوتی ہے کہ ہر وقت گود میں رہنے سے بچہ بجھ جاتا ہے۔ ڈھیٹر جاتا ہے، ہاضمہ خراب رہتا ہے۔ اور اس واسطے دوا کا عادی ہوجاتا ہے۔ جو اس کے کمزور معدہ اور آنتوں کے واسطے مضر ثابت ہوتا ہے۔ بچہ کو گود میں رکھنے کی عادت نہ ڈالیں اس کو لٹائے رکھیں کہ ہاتھ پاؤں مار کر دودھ ہضم کرے۔ اور چڑچڑا رونا بھی نہ ہو۔ سونف کھانا ماں کے واسطے مفید ہے کہ اس سے ہاضمہ درست ہوکر دودھ صاف ہوتا ہے۔ اس کی اجابت کا خیال رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہاضمہ کیسا ہے۔

کوند جو زچہ کو دیا جاتا تھا اور بعض جگہ اب بھی دیتے ہیں۔ پیٹ کے واسطے اچھی نہیں ہوتی اور ستورا ضرور ثقیل ہوتا ہے۔ پہلے اور اب دونوں طریقوں کو دیکھ کر مناسب طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

باقی آئندہ

افادات میمنی

عربی لغت نگاری کے موضوع پر دلی اردو بورڈ میں علامہ عبدالعزیز میمنی کے خطبات

(قسط دوم)

اچھا صاحب اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عربوں کے ہاں تحریر کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، تو نثر تو یاد کم رہتی ہے اور جب عبدالمطلب کی تحریر ابن ندیم نے دیکھی ہے وہ تو غالباً پانچ یا چھ کلمے سے زیادہ نہیں ہے اور اس زمانے کی جو یاد داشتیں ہمیں ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ لین دین کے سلسلے میں نوٹ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی اور کلام مجید میں بھی خدا نے اسی کا ذکر کیا ہے:

"اذا تداینتم بدین الی اجل فاکتبوہ"، اے مسلمانو! جب تم ایک مدت کے لیے قرضہ لو تو اس کی تحریر کرلو۔ پھر آگے خدا فرماتا ہے: "ولا یاب کاتب ان یکتب کما علمه الله"، الله نے اسے کتابت کا فن سکھایا ہے تو کسی کاتب کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خدا فرماتا ہے کلام مجید میں: "فلیکتب"، یاد رکھو اس کو لکھنا پڑے گا، لکھے وہ ضرور۔ لیجیے صاحب آپ کے اوپر یہ فرض ہوگیا خدا کی طرف سے۔ "ولیملل الذی علیه الحق"، یعنی دینے والے کا یہ کام نہیں کیونکہ اس کا مفاد وابستہ ہے، بلکہ وہ آدمی کہ جس کے اوپر حق ہے یعنی قرضہ ہے اسے اقرار لکھنا پڑے گا یا لکھوانا پڑے گا کہ میرے اوپر فلاں آدمی جو فلاں ابن فلاں ابن فلاں ہے اس کی یہ رقم واجب الادا ہے جو میں نے فلاں تاریخ کو لی تھی، فلاں تاریخ ادا کروں گا۔ یہ تو کلام مجید میں خدا نے حکم دیا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ حالت ہے عربوں کی، تو لکھنے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اچھا سنیے آپ! ایک شاعر جس نے آنحضرت صلعم سے پہلے کا زمانہ پایا ہے اور پھر آخری زمانے میں اسلام لے آیا ہے اور بہت مشہور شاعر ہے اس کا دیوان بھی میرے پاس ہے 'ابو ذؤیب الهذلی'، وہ کہتا ہے:

عرفت الدیار کرقم الدواة یزبرها الکاتب الحمیری

"میں نے محبوبہ کے گھروں کے نشانات سے پتہ چلا لیا، ٹھیک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ دوات میں قلم ڈبو کر لکھا گیا ہو اور حمیری کاتب اس کو لکھ رہا ہو"۔

اب بولیے صاحب اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ شمالی عرب کا کاتب بد نصیب تھا، وہ بیچارہ لکھنے کے قابل نہیں تھا، خود لکھ رہا ہے وہ۔ اور سنیے آپ! کتاب سیبویہ کے ایک ہزار پچاس

شعر ہیں ، جو شواہد کہلاتے ہیں ، ان میں کی ایک بیت آپ کو سناتا ہوں ، یہ بڑے مقدس مانے جاتے ہیں عربی زبان میں :

کما خط الکتاب بکف۔ یوما۔ یہودی یقارب او یزیل

سیبویہ نے اپنی کتاب میں اس بیت کو اس مناسبت سے نقل کیا ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان میں کسی اور کلمے کو ٹھونسا جاسکتا ہے حالانکہ یہ بہت مشکل ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ کے مابین تو لکھتا ہے کہ "کما خط الکتاب بکف یوماً،، جیسے کہ کوئی تحریر لکھی گئی ہو کبھی۔ تو "بکف،، جو ہے اس کا مضاف الیہ نہیں ذکر کرتا اور " یوماً،، کو بیچ میں لے آتا ہے پھر " یہودی،، مضاف الیہ آگیا ہے۔ یہودی کے ہاتھ کی تحریر۔ لیجیے صاحب معلوم ہوگیا کہ وہاں لکھنے والے یہودی تھے، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے ہاں عبرانی رسم الخط کا رواج تھا اور (Syriac) کا رواج سیریا میں زیادہ تھا ، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں کوئی رسم الخط ڈھونڈنا حماقت ہے اور کوئی کامیابی لمبی چوڑی ہونے والی نہیں۔ اب لیجیے صاحب عربوں کے حافظہ سے کام لے کر ان کے شعروں کا قصہ جو ممتاز صاحب کے سوال سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ابن قتیبہ کی جو کتاب الشعر و الشعراء ہے یا طبقات الشعراء اس کے شروع میں اس نے اس سے بحث کی ہے۔ کتاب المعارف میں بھی اس نے اس سے بحث کی ہے ، اس میں وہ لکھتا ہے کہ جتنا کلام عربی زبان کا ہمارے پاس ہے اس میں نبی کریم صلعم کی بعثت سے ایک سو برس کے آگے کوئی جا ہی نہیں سکتا ، بس قصہ ختم! یہ بڑا حیرت انگیز اور بڑے آدمی کا بیان ہے جو مبرد کے زمانے کا ہے اور جس نے جاحظ کا زمانہ پایا ہے اور جس کی بہت سی تصانیف ہمارے پاس ہیں۔

ممتاز حسن صاحب:—مولانا وہ جو آپ نے عربی کے پہلے صاحب دیوان شاعر . . . .

علامہ میمنی :—اچھا وہ آرہا ہے ذرا صبر فرمائیں۔

اچھا صاحب تو اس میں مثلاً دوید ابن نہد ایک شخص ہیں ، کہ جن کے سن کا متعین کرنا تو بڑا مشکل ہے ، مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام سے بہت کافی پہلے تھے۔ کافی کے معنی وہی جو میں نے آپ سے عرض کیے ، یعنی یہ کہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا شاید سو سوا سو برس ہوگا اس سے زیادہ نہیں۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ جتنے شعر عربی کے قدیم ہم تک پہنچے ہیں وہ تین چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ کوئی یہ چاہے کہ لمبے لمبے قصیدے میں لاؤں گا تو "اول من هلهل الشعر مهلهل،، (یعنی سب سے پہلے جس نے شعر گنگنایا وہ مہلہل تھا) مگر مہلہل کا دیوان جو ہے اس کا بہت سا کلام جعلی ہے۔ اور امالی ابی علی قالی میں جو اس کا قصیدہ دیا ہے اس کے اندر پونتیس کے قریب ابیات ہیں ، میں نہیں سمجھتا کہ یہ سو فیصد صحیح ہے ، مگر بہر حال نقل کرنے والا تیسری صدی ہجری کے آخر کا آدمی ہے ، اور خلیفہ حکم بن عبدالرحمان کا استاد ہے ، اور امالی اس کی تصنیف ہے۔ اس میں نیز دیگر کتابوں میں بھی ہے ، مگر میرے پاس ایک کتاب

ہے جو ابن الکلبی اور ابن اسحاق کے نام سے منسوب ہے اور وہ کتاب ہے "کتاب بکر و تغلب" اس میں ایک قصیدہ ایک سو دو بیت کا ہے۔ لہذا اس کے جعلی ہونے میں تو کلام ہی نہیں۔ اچھا قصیدوں کے جعلی ہونے کا قصہ سنیے۔ ہمارے پاس جو قدیم ترین تصنیف عربی شعر و شاعری پر ہے وہ طبقات الشعراء محمد ابن سلام الجمحی کی ہے، جو قریباً اصمعی کا استاد ہے، تو اس نے بہت دلچسپ بات لکھی ہے، اور یہ سن کر آپ بھی مزہ لیں گے اور ڈاکٹر یوسف صاحب آپ کو بھی بہت لطف آئے گا، وہ لکھتا ہے کہ میرے زمانے میں یوسف بن سعد ایک شخص ہے، اس نے لکھا ہے یا مجھے بتایا ہے کہ آج سے ایک سو سال پہلے یہ قصیدہ گھڑا گیا ہے، لامیہ کے جوڑ پر:

و ابیض یستسقی الغمام بو جهه   ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل

آپ کو حیرت ہوگی یہ سن کر، کہ صحیح بخاری میں ایک بیت موجود ہے، یہی بیت جو میں نے آپ کو سنائی اور یہ قصیدہ ابن اسحاق نے اور پھر ابن ہشام نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اور ابن ہشام نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے "وأ کثر اهل العلم بالشعر ینکر اکثرها"، اکثر وہ علماء جو شعر و شاعری سے باخبر ہیں وہ اس کے بہت سے حصے کو نہیں مانتے۔ جو اس نے لکھا ہے، اور وہ بڑا متمدن تھا، دنیا اس کو مانتی ہے، یعنی ابن ہشام کو، اور ابن ہشام کا سن وفات ہے ۲۱۸ کے قریب، اور ابن اسحاق کا سن وفات ڈیڑھ سو ہجری کے قریب ہے۔ یہ قدیم ترین تصانیف ہیں جو اسلام میں ہوئی ہیں۔ خیر تو کہتا ہے کہ یوسف ابن سعد نے مجھے لکھا جو "صاحبنا" (یعنی) ہمارا دوست تھا"، ایک سو سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ابن اسحاق کے پاس بہت سے صحابی آتے تھے اور آکر ان کو کچھ نذرانے پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ نذرانہ ہے۔ یہ فلاں حلوے والے کی مٹھائی ہے یہ فلاں کے ہاں کی۔ یوں کرکے پیش کرتے تھے، بعد ازاں کہتے تھے، کہ یہ ہمارے دادا کے شعر ہیں جو انہوں نے جنگ احد میں کہے تھے، اور یہ جنگ خیبر میں، ان کو بھی اپنی کتاب میں کہیں چپکا دیجیے، وہ بیچارے نیک دل آدمی تھے، سوچتے تھے کہ جب یہ کہتے ہیں اور ان کے بیٹے پوتے ہیں تو سچ ہی ہوگا۔ چنانچہ وہ لے لیتے تھے، اس طرح سے یہ شعر ٹھونسے گئے ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ ابن ہشام جب نقل کرتا ہے تو لکھتا ہے کہ اکثر علمائے شعر و شاعری جن میں ابو زید بھی ہیں، وہ ان شعروں کو نہیں مانتے۔ ابو زید انصاری بہت بڑا عالم ہے۔ یہ بھی دوسری صدی ہجری کا ہے۔ میں آئندہ چل کر اگر موقع ملا، عرض کروں گا کہ تمام علوم جتنے بھی ہیں .... ممتاز صاحب کو اپنے موضوع کو بہت بدلنا پڑے گا کیونکہ عربی میں ......

ممتاز حسن :- تو آپ ہی بدل دیجیے۔

جی وہی تو عرض کر رہا ہوں کہ عربی میں کسی ایک علم کی تدوین کا کوئی خاص زمانہ نہیں ہے۔ اگر آپ سنیں تو میں عرض کروں گا کہ صرف نحو اور لغت ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مادہ اور صورت جسمیہ، کہ ان دونوں کے بغیر کوئی جسم مرکب نہیں ہوسکتا اسی لیے

جو علماؑ اور ان کے تذکرے جو ہمارے ہاں لکھے گئے ہیں اور وہ بہت بڑی تعداد میں ہیں وہ سب تذکرے کوئی نحویوں کے خاص تذکرے نہیں ہیں اور وہ تذکرے دراصل ان علماؑ کے ہیں جو یہ سب علوم جانتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک عالم ایک علم کو زیادہ جانتا ہے دوسرے علم میں ذرا دوسرے درجہ پر ہے، اور دوسرا جو ہے اس دوسرے علم میں اونچے درجے پر ہے۔ اب آپ دیکھیں یہاں میرے پاس پڑا ہوا ہے عباب صاغانی کا "العباب الزاخر و اللباب الفاخر" اگر موقع ملا اور میں وہاں تک پہنچا تو آپ کو دکھاؤں گا کہ اس میں کیا تماشے ہیں۔ اس میں وہ سیبویہ کو لغویین میں شمار کرتا ہے۔ اب بولیے آپ کہاں جائیں گے۔ سیبویہ وہ آدمی ہے کہ جس نے عربی صرف و نحو پر وہ کتاب لکھی جس کی زمین پر کوئی مثال نہیں۔ اس سے پہلے ایک کتاب عیسیٰ بن عمر ثقفی کی تھی، دوسری کتاب خلف کی ہے۔ اس کی بابت سنیے: خلیل بن احمد اتنا بڑا امام کہ امام بخاری کے استادوں کا استاد، چنانچہ وہ صحیح بخاری میں اس سے نقل کرتے ہیں۔ وہ امام بخاری کا استاد نہیں بلکہ ان کے استادوں کا استاد اور سیبویہ کا استاد تھا۔ خلیل کا ایک شاگرد جو سیبویہ سے پہلے شاگردی کرتا تھا اور عربی زبان، ادب اور شاعری میں بڑا اونچا مقام رکھتا تھا اور یہ ابو نواس جو ہمارے ہاں کا مشہور شاعر ہے اس کا استاد تھا، اس نے اپنے دیوان میں اپنے استاد خلف کے دو مرثیے بھی لکھے ہیں۔ میں نے اس کی کتاب دریافت کرکے شائع کرا دی ہے، اور یہ قدیم ترین کتاب ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سب ذرا ذرا سی کتبیاں ہیں، اور ان کی مصطلحات بھی سیبویہ کی مصطلحات سے قدرے مختلف ہیں، مگر سیبویہ کی کتاب کے متعلق ایک فقرہ میں نے دیکھا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ تمام کتابوں میں ملتا ہے، وہ یہ کہ سیبویہ کی کتاب میں صرف یہی بات نہیں ہے کہ سیبویہ سے پہلے کسی نے ایسی کتاب نہیں لکھی اس کے بعد بھی آج تک روئے زمین پر نہیں لکھی گئی۔ میں نے جو تمام دنیا کے کتب خانے ٹٹولے تو ان کے اندر مجھے تین چار کتابیں ملی ہیں جن پر مسلمانوں نے اپنا سب کچھ صرف کر دیا ہے اور ان کے نسخے ایسے ایسے بے مثال ہیں کہ لکھوکھا روپیہ ان نسخوں کی تیاری میں صرف ہوا ہے، خواہ وہ اندلس میں وہ یا مراکو میں یا مشرق میں۔ ان میں سب سے اول درجے کے اوپر تو سیبویہ کی کتاب ہے، اور نام بھی اس کا ہے "الکتاب" یعنی اجازت نہیں ہے کوئی لفظ بولنے کی اس کے علاوہ۔ آپ دیکھیے " ذلک الکتاب لا ریب فیہ "۔ کلام مجید کے لیے خدا تعالیٰ نے "الکتاب" کا لفظ استعمال کیا ہے، مگر عربی میں آپ کو ایسا نہیں ملے گا۔ عربی میں تو "الکتاب" سے مراد ہے سیبویہ کی کتاب۔ کیونکہ اس کے بعد بھی کوئی بشر اس درجہ کی کتاب نہیں لکھ سکا۔ اسے لوگ کس کس طرح حفظ کرتے تھے، حالانکہ یہ ایک ہزار ورق کے اندر ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے، جتنی داد دی جائے کم ہے۔

تو جناب من! میری گذارش یہ تھی کہ عربوں نے جس زمانے میں صرف و نحو کے لیے یہ کام کیے تھے اسی زمانے میں لغت کے لیے بھی کیے تھے۔ اسی زمانے میں شعر و شاعری کے سلسلے میں بھی کیے تھے۔ اسی زمانے میں جاہلیت اور مخضرمین اور اسلام کے قدیم شعراؑ کے کلام کو مرتب اور مدون کرنے کی بھی کوشش کی، اور تیسری صدی ھجری کے بالکل آغاز میں تین چار پانچ چھ کے

قریب کتابیں شعر و شاعری پر بھی لکھ ڈالیں، جن میں عبداللہ بن المعتز کی کتاب "طبقات الشعراء المحدثین" ہے نیز "کتاب البدیع" ہے اور ابن ابی عون کی کتاب ہے "التشبیہات"۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں۔ تو اب میری یہ گزارش ہے کہ اسلامی علوم کی تدوین کے سلسلے میں دوسری صدی هجری کے شروع سے لے کر تیسری کے آخر یا چوتھی کے بالکل آغاز تک عربوں نے بہت کچھ کام کیا۔ پہلی صدی میں بہت کم کیا، اور چوتھی صدی سے یہ ہونے لگا کہ جو کتابیں لکھی جاچکی تھیں انہی کتابوں کے اندر کچھ اصلاح، کچھ کمی بیشی، یا بہت سی کتابوں کو یکجا کرنا، الغرض اس ٹائپ کے کام ہونے لگے۔ اگر مجھے اس سلسلے میں کچھ کہنے کا موقع ملا تو میں بہت کچھ سناؤں گا آپ کو۔

ستار حسن :- پہلی صدی میں کوئی لغت کی تدوین کا واقعہ آپ کو یاد ہے۔

علامہ میمنی :- یہ موضوع ابھی میں نے شروع نہیں کیا ہے۔ اس کی طرف آرہا ہوں۔ خیر تو آپ طبقات الشعراء ابن قتیبہ کے شروع میں وہ کلام دیکھیں گے جو دو دو تین تین بیتوں پر مشتمل ہے مثلاً: "الیوم یبنی لدوید بیته" آج دوید کا گھر بنایا جائے گا۔ مطلب یہ کہ آج مرنے والا ہوں اور قبر میں میرے لیے ایک ٹھکانا بنایا جائے گا۔ "لوکان للدھر بلی أبلیته" اور اگر زمانے میں کوئی چیز بچ رہی ہوتی جس کو میں نے پرانا نہ کیا ہوتا ہو اور کرلیتا، گویا معلوم ہوتا ہے بڑی عمر پائی ہے اس نے "أوكان قرنی واحداً کفیته" یا میرا ہمسر کوئی ایک آدھ آدمی ہوتا تو میں اس سے ٹکر لیتا۔ الغرض یہ انداز ہے۔ آپ کو سنگل شعر اور ان کے ترجمے سنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی قسم کے دوچار ٹکڑے ملیں گے، مگر وہ بہت تھوڑے ہیں۔

اب لیجیے صاحب ایک کتاب دوسری صدی هجری کی ہے اور اس کا مصنف غالباً قدیم ترین لوگوں میں سے ہے جنہوں نے طبقات الشعراء پر کام کیا ہے، اس کا نام ہے عمر بن شبہ نمیری مگر اب بدنصیبی سے یہ کتاب فنا ہوگئی، عمر بن شبہ نمیری نے عمر بھی بہت پائی، سو کے لگ بھگ، اس کی کتاب کا بھی شاید ہمیں بہت کم پتہ چلتا مگر اور لوگوں نے جن کو یہ ملی تھی انہوں نے حوالے دیے ہیں۔ ایک کتاب جس سے مجھے بڑی دلچسپی تھی اس کا میں نے قلمی نسخہ مصر میں نقل کروایا تھا، وہ ہے ابو احمد عسکری کی "شرح مایقع فیہ التصحیف" اس میں وہ لکھتا ہے کہ عمر بن شبہ کی کتاب طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ یہ شعراء جو ہمارے سامنے ہیں ان میں سب سے پرانا شاعر "الافوہ الاودی" ہے "وقد کاد یدرک عیسیٰ علیہ السلام" یعنی گویا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا تھا، مگر میں نہیں مانتا ہوں، اس کے دیوان کا بنانے والا میں ہوں اور چھپ چکا ہے، مدتیں ہوئیں، باایں ہمہ میں نہیں مانتا۔ اس کے دو تین قصیدے ہیں جو بڑے مانے جاتے ہیں۔ اچھا اور دیوان کا جو نسخہ میں نے دیکھا تھا محمد محمود شنقیطی کا نقل کرایا ہوا، اس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں ایک عجمی نسخہ سے جس میں بہت غلطیاں تھیں میں نے اس کو نقل کرایا ہے یا اپنے ہاتھ سے نقل کیا ہے۔ ان کا خط مغربی تھا اور وہ میں نے پڑھ لیا تھا مصر میں بیٹھ کر، پھر اس کو ایڈٹ کیا اور ادھر ادھر سے جو کلام ملا سب میں نے

جمع کیا، مگر میں اس کو نہیں مانتا ہوں کہ یہ پورا دیوان اس کا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ ابیات اس کی ہوں، یہ بات یقینی ہے۔ ایک قصیدہ اس کا بہت خوبصورت ہے جس کا مطلع یہ ہے:

لا یصلح الناس فوضی لاسراۃ لہم
ولا سراۃ اذا جہالہم سادوا

اور اسی قصیدے میں کہتا ہے:

فینا معاشر لم یبنوا لقومہم
وان بنی قومہم ما افسدوا عادوا

کہتا ہے کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ جنہوں نے اپنی قوم کے لیے کوئی تعمیری کام نہیں کیا اور جو کوئی کام کرنے چلتا ہے تو اس میں روڑا اٹکاتے ہیں۔

میں نے اپنی سمط اللآلی میں اس کی تخریج کردی ہے، جہاں جہاں بھی مل سکتا ہے اس کی نشاندھی کردی ہے۔ مگر ایک قصیدہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں کی ایک بیت سن کر آنحضرت صلعم خفا ہوگئے تھے اور آپ نے منع کر دیا تھا کہ یہ قصیدہ نہ سنایا جائے، بعض کتابوں میں ملتا ہے، وہ شعر میں آپ کو سنا دیتا ہوں یہ موضوع بھی بہت دلچسپ ہے، اب اس زمانے میں غالباً اس بیت کو سننے سے کچھ نہیں بگڑے گا، بات یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کا متولی بہت قدیم زمانے میں قبیلہ جرھم ہوا کرتا تھا، قبیلہ جرھم کے بعد آنحضرت صلعم کے آبا و اجداد جو تھے قصی ابن کلاب ابن مرۃ ابن کعب ابن لوی بن غالب۔ قصی نے ان لوگوں کو بھگا دیا۔ کن کو؟ جر ھم والوں کو اور خانۂ کعبہ کی تولیت خود لے لی۔ تو یہ شاعر جو پرانے زمانے کا ہے بگڑ بیٹھا اور کہتا ہے:-

ریشت جرھم نبلا فرمی جر ھما منھن فوق و غرار

کہتا ہے کہ ایک تیر جس پر جرھم نے پرگیری لگائی تھی۔ پرگیری جانتے ہیں نہ آپ! یعنی تیر کے اوپر جو ایک پر لگایا جاتا ہے اس کی وجہ سے تیر سیدھا جاتا ہے ورنہ ادھر ادھر چلا جائے گا۔ اس کو عربی میں ریش کہیں گے اور اردو میں پرگیری کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ جرھم نے ایک تیر کو پرگیری لگائی تھی مگر جرھم کے کلیجے کو اس تیر کی پرگیری نے اور اس کے سوفار نے اور جو جو اس میں تھا سب نے چھید دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تولیت جرھم کے پاس تھی۔ جرھم والوں نے جب کہ اسماعیل علیہ السلام کو ان کی والدہ یہاں چھوڑ گئی تھیں سنبھالا تھا۔ اسماعیل علیہ السلام کو ابراھیم علیہ السلام چھوڑ گئے تھے مکہ میں تو جرھم نے ان کو پالا پوسا کھلایا پلایا بڑا کیا، جب جوان ہوگئے اور صید و شکار کے لیے جانے لگے اس زمانے میں ان کو اپنی بیٹی دی، اسی کی یہ نسل ہے تمام دنیا میں، تو کہتا ہے کہ دیکھو جرھم نے کیا کچھ کیا تھا اور اس کا کیا پھل ملا یہ برا مضمون ہے اور یہ سب قریش سے متعلق ہے اس لیے

کہتے ہیں آنحضرت صلعم نے اسے ممنوع قرار دیدیا۔ مجھے تلاش ہوئی کہ اس قصیدے کا پتا چلاؤں چنانچہ بہت کتابیں قلمی ، کچھ بانکی پور میں نہیں کچھ میرے پاس بھی تھیں ، انہیں جمع کر کے کوئی پینتیس یا کم و بیش ابیات میں نے اس کی جمع کر لیں اور میں نے کہا کہ اب غالباً یہ مقصد رہا نہیں ، نہ جرھم ہے نہ خانہ کعبہ کی تولیت قریش کے ہاتھ سے نکلنے کا اندیشہ ہے۔ اب کیا حرج ہے ، اور میں یقینی طور پر مانتا بھی نہیں ہوں کہ یہ سب صحیح ہو ، بہر کیف میں نے اس دیوان کو جتنا کچھ پایا تھا مصر میں اس سے دوگنے کا اضافہ کرکے شائع کر دیا تھا۔ یہ قدیم ترین شاعر ہے کہ جس کے متعلق اتنے بڑے قدیم ترین عالم کا یہ قول ہے کہ "و کانہ" ادراک المسیح،، گویا کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کہاں تک صحت ہے کہاں تک نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اس کے دیوان میں جو شعر ہیں ان میں عجب عجب احتمالات پیدا کیے جاسکتے ہیں ایک یہ ہے کہ تیسری صدی ھجری میں اور چوتھی میں ایران میں ایک شاعر تھا اس کا نام علی بن محمد الأفوہ تھا ، افوہ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کا منہہ پھٹا ہوا ، جوڑا ہو تو اس کا لقب بھی الفوہ تھا اور اس کا کلام ہے ، وہ بھی غالباً اس میں ٹھونسا گیا ہے ، اچھا اس میں چار پانچ ابیات مجھے ملیں جو ابوالعلاً المعری کے رنگ سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں بمقابلہ افوہ کے ، اور میں نے وہاں لکھ بھی دیا ہے کہ یہ امر محال ہے کہ یہ بیت افوہ کی کہی جاسکیں۔ بہر کیف اب یہ حالت ہے اور ان تحقیقات کے یہ نتائج ہیں۔ آپ کو کوئی قدیم شعر جو ایک سو برس پہلے کا ہو ملنا قریباً محال ہے جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے ، سوائے ان دوچار بیتوں کے۔ ان کی بابت بھی سوفیصدی یقین مجھے نہیں ہے مگر ان میں کچھ جان ہوسکتی ہے تھوڑی سی۔ ہمیں ضرورت ہے کہ ہم بہت ہی غائر نظر سے ان چیزوں پر نگاہ ڈالیں اور ایک دم انٹ سنٹ فیصلے نہ کرلیں۔ البتہ عربوں کے انتشار کی جو تفاصیل ملتی ہیں یعنی سد ماٴرب کا ٹوٹنا اور پھر مختلف عرب قبائل کا حیرہ کی طرف جانا ، بلقا کی طرف جانا اور تنوخ کا شام کے علاقوں کی طرف جانا اور وہاں جاکر بس جانا یہ سب تفاصیل تو ملتی ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عربوں کی زبان عربی نہیں تھی ان کی زبان سبائی اور حمیری تھی۔ مگر یہ بھی آپ کو ماننا پڑے گا کہ آنحضرت صلعم کی ولادت کے زمانے میں یمنیوں میں عربی زبان کا رواج ضرور تھا۔ اب وہ کس درجہ میں تھا اس کا فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے مگر کچھ یقین ہے سبب اس کا یہ ہے کہ نعمان بن منذر کے جتنے شاعر ہیں ، ان کا وہ کلام جو نعمان کے متعلق لکھا ہے وہ موجود ہے ، بڑا خوبصورت ہے اور تمام واقعات جو اس کے متعلق ہیں وہ بھی سب ملتے ہیں مثلاً عدی بن زید عبادی یہ خسرو پرویز کے یہاں انٹر پریٹر یا پرائیویٹ سکریٹری تھا جزیرۃ العرب سے متعلق تمام امور اس کی نگرانی میں تھے۔ بعد کو اسے بہت بری طرح سے مروا دیا گیا پھر خسرو پرویز نے نعمان کو مروا دیا اور کیا کیا تماشے ہوئے ہیں۔ یہ سب ہمارے ہاں محفوظ ہیں ، اغانی وغیرہ کتابوں کے اندر ، پھر یہ ہے کہ جو کتابیں جزیرۃ العرب پر لکھی گئی ہیں۔ ممتاز صاحب کو بھی خوشی ہوگی اور آپ کو بھی یقیناً خوشی ہوگی یہ بات سن کر کہ میں قدیم ترین کتاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایک کتاب ہے پیرس میں کوفی خط میں لکھی ہوئی اس کا فوٹو میرے پاس ہے اور اس کو خط نسخ میں بھی چھاپ دیا گیا ہے بڑی عجیب

کتاب ہے آپ فی الجملہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عربی کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے اچھا اور ابن السکیت کے ہاتھ کی تحریر ہے اتنا بڑا امام ابن السکیت! اور آیندہ صحبتوں میں اگر کبھی میں نے اس سلسلے میں کچھ کہا تو میں بتاؤں گا کہ ابن السکیت کیا ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے اصمعی سے کہا کہ اسلام سے پیشتر کی تاریخ جزیرۃ العرب کی اور عربوں کی لکھ کر لاؤ۔ چنانچہ اصمعی نے محنت کی اور جو جو واقعات لوگوں کی زبانی یاد تھے اس کی بنا پر لکھی۔ کوئی ریکارڈ نہیں تھا اس کے پاس بہر حال دلچسپ ضرور ہے اسی طرح ایک کتاب ہے ابو حاتم کی غالباً چھپی تھی اور شاید میرے پاس بھی ہوگی تو اس کے اندر جاہلیت کے زمانے کے جو معمرین ہیں ان سب کے حالات اور ان کے واقعات درج کیے ہیں۔ مگر یہ بھی سب یاد داشت کے اوپر مبنی ہے۔ ان کے اندر کمی بیشی کی بڑی گنجائش ہے، خیر تو وہ یہ کتاب تیار کر کے لایا تو خلیفہ ہارون الرشید خوش ہوا اور اس نے اس کو دو جاگیریں دیں یعنی اصمعی کو اور ان دو جاگیروں کا نام ابن السکیت کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اسی کتاب کے اصل نسخہ کے اوپر جو ۲۴۴ ہجری کا لکھا ہوا ہے کوفی خط میں۔ اس سے اصمعی مالا مال ہوگیا تھا، تو ایک یہ کتاب بھی ہے اس کا بھی ذکر کرنا چاہیے ان کتابوں میں مگر یہ ہے کہ سو فیصدی میں اصمعی کی ان روایتوں پر اعتبار نہیں کرتا۔ اب سنیے آپ فہرست ابن ندیم میں آپ کو ملے گا اور کتابوں میں ملے گا کہ ایک بڈھا آدمی تھا جرہم میں کا اور کہا جاتا ہے کہ جرہم قبیلہ فنا ہوگیا اور اس قبیلہ کا کوئی نام لیوا دنیا میں نہیں رہا۔ بایں ہمہ ایک آدمی رہ گیا تھا اور اس کا نام ہے عبید شریہ" الجرہمی اور اس کی ایک کتاب ہے "اخبار الامم الماضین"، گزشتہ قوموں کے واقعات کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کے زمانے میں یہ موجود تھا اور جاہلیت کا زمانہ اس نے پایا تھا لہٰذا قدیم ترین کتاب کا میں ذکر کر رہا ہوں ممتاز صاحب اس کو سن لیں مگر میری رائے بعد کو آئے گی۔ تو عبید بن شریۃ الجرہمی نے نظم کیا ہے قدیم عرب کی تاریخ کو اور وہ نظم عربی میں پائی جاتی تھی اور اس کے قلمی نسخے بھی دو ایک ہیں اور ابن ہشام کی کتاب التیجان جو حیدر آباد میں چھپی ہے اس کے آخر میں اخبار الامم الماضین عبید بن شریہ" الجرہمی کی چھاپ دی ہے۔ مگر میں عرض کروں گا کہ جتنی جرہم کی تاریخ ہو یا جتنی جنوبی عرب کی تاریخ ہے علاوہ کتبوں کے، جو عربی کی کتابوں میں لکھی گئی ہے بڑا مشکل ہے کہ سو فیصدی اس پر اعتبار کیا جائے۔ میں نے قدیم تحریروں میں یہ دیکھا ہے کہ ایک شاعر تھا یزید بن مفرغ الحمیری وہ خود حمیری تھا تو اس کو کسی رئیس نے یا گورنر نے مجبور کیا کہ تم حمیریوں کی تعریف کے متعلق کچھ شعر کہو وہ اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا اگر آپ کو یاد ہو تو امام حسین کی شہادت کا قصہ جو ہے زیاد بن ابیہ سے متعلق ہے زیاد بن ابیہ کے بعد اس کا بیٹا عبید اللہ بن زیاد تھا اور عبید اللہ بن زیاد ہی اس کو خراسان لے گیا تھا اپنے ساتھ اور اسی کے کلام کے اندر فارسی کے کچھ کلمے ملیں گے آپ کو:

آب است و نبیذ است و عصارات زبیب است سمید رو سپید است

تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھندے ابن مفرغ کو آتے تھے مجھے تو ابھی بھی خیال ہوتا ہے کہ اس میں بہت بڑا حصہ یا بہت بڑا جرم یزید بن مفرغ حمیری کا ہے اور اشعار اسی کے گھڑے ہوئے

ہیں ۔ اس لیے کہ جاہلیت اور مخضرمین اور امیر معاویہ کے زمانے تک کی عربی نہیں ہے جو میں نے دیکھی ہے "اخبار الامم الماضین" میں ۔ اور بہت سے علما ہیں جو میری طرح نہیں مانتے تھے ، اسے بھی ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ہے اچھا صاحب اللہ جانے ۔ بہر کیف میں آپ کو یہ نثر اور نظم سب چیزیں جو اسلام سے پیشتر کی عربی کی تھیں ان میں جو جو یاد آتی ہے کچھ میں لکھ کے تو لایا نہیں اور جو جو میرے دماغ میں منتشر ہیں اگر یاد آتی جائیں گی تو سناتا جاؤں گا ۔ اچھا مگر آج کل بڑی بڑی تحقیقات کی جارہی ہیں ۔ ہمارے دوست ڈاکٹر حمید اللہ نے آنحضرت صلعم کے خطوط جو ۸ھ میں آپ نے اپنے ہاں کے بادشاہوں کے نام لکھے تھے ان کے فوٹو جہاں تک ان کو مل سکے انہوں نے دئیے ہیں ۔ ان میں ایک تو منذر ابن ساوی جو عمان کا گورنر تھا اس کے نام نبی کریم صلعم کا خط ہے اور یہ وہاں کے اورینٹلسٹوں کے جرنل میں سب سے پہلے چھپا تھا اور میں نے آج سے چالیس برس پہلے لاہور میں وہاں کے جرنل میں دیکھا تھا اور پھر اوروں نے بھی چھاپ دیا ہے خیر تو اس کے بعد پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں نے مقوقس عظیم القبط کے نام جو آنحضرت کا خط تھا اور جو غالباً سلطان عبد الحمید خاں کو ایک اورینٹلسٹ نے دیا تھا ۔ عمرو بن العاص کی مسجد کے پاس ایک محلہ ہے جہاں پر قبطی رہتے ہیں اور وہاں ایک گرجا ہے ، اس گرجے میں میں جا چکا ہوں اس گرجے کے کتب خانے میں یہ خط اس اورینٹلسٹ کو ملا تھا اور آپ تعجب نہ کیجیے گا گرجے کے کتب خانوں میں عجیب عجیب چیزیں مل جاتی گی اور ملی ہیں میں عرض کروں گا ۔ اچھا صاحب تو اس خط کو لوگوں نے بہت کچھ مشہور کیا ہندوستان میں شہنشاہ حبش کے ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل خط ، دعویٰ جسا کیا جاتا ہے ، وہ ملا وہ انہوں نے اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں دے دیا ہے ۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو پہلے مصر میں تھے ، نام ہے صلاح الدین المنجد ان کو وہ خط مل گیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خسرو پرویز کے نام بھیجا تھا ۔ یہ میرے خیال میں ان سب میں اہم ہے ۔ اس لیے کہ یہ خط یقیناً آنحضرت کے زمانے کا معلوم ہوتا ہے خط بالکل وہی معلوم ہوتا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بیچ میں سے دو ٹکڑے کر دیا گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس نے آنحضرت کے خط کو غصے میں آکر پھاڑ دیا تو آپ نے فرمایا :

اللہم مزقہ کما مزق کتابی ھذا

خدا تو اس کو بھی پارہ پارہ کر دے اور ریزہ ریزہ کر دے جس طرح اس نے میرے خط کو ریزہ ریزہ کر دیا ۔ چنانچہ وہ اور اس کی حکومت سب کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ریزہ ریزہ ہوگئے اور وہ خط بھی ریزہ ریزہ ہی شکل میں ہے اور وہ بھی ملا ہے کسی قبطی (ہنری فرعون) کے پاس سے اور ہرن کے چمڑے پر ہے ۔ جو بہت بری طرح سے اینٹھ گیا ہے ، اس زمانے میں کاغذ واغذ تو تھا نہیں ، اب رہ گئی میری رائے اس سلسلہ میں تو میں نے کچھ تھوڑا سا عرض کر دیا کہ اس میں وہ تین جو ہیں پہلے کے ان کے متعلق میں کوئی آخری رائے دینے کے قابل نہیں ہوں ، نہ سو فیصدی اعتبار کرنے کے قابل ، نہ ہی اس قابل کہ ایک دم انکار کر دوں ، اس کے بین بین ہوں مگر اس کے متعلق مجھے کچھ شک ہوتا ہے ۔

اب آپ فرمائیے ممتاز صاحب جو سوال آپ کا تھا۔

ممتاز حسن :

سوال یہ ہے کہ وہ خط کیا ہے۔

علامہ میمنی :

تو میں بتا چکا آپ کو کہ وہ خط جو آج کل خط رقاع اور خط نسخ اور اس کے ساتھ بچپن کا جو خط ہوا کرتا ہے اوت پٹانگ لونڈوں کا اس انداز کے اوپر۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا خط جو قدیم ترین ہے اس تلوار پر جو قسطنطنیہ کے دارالاثار الاسلامیہ میں محفوظ ہے اور میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام لکھا ہوا ہے۔

سوال :۔یہ کیسے ثابت ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نہ اس میں وہ جھگی ہے جو خط کوفی میں ہوتی ہے ، اور جو خط نسخ کی آیندہ چل کر شکلیں بنی ہیں ابن بواب کے زمانے یا ابن مقلہ کے زمانے میں یا ابن اسد قاری کے زمانے میں جو پرانے تیسری چوتھی صدی ھجری کے لوگ ہیں ان میں وہ بات نہیں ہے۔ میں نے جو تیسری چوتھی صدی ھجری کی کتابیں قدیم دیکھی ہیں ان میں جب الف لکھتے ہیں تو نیچے تک گھسیٹ لاتے ہیں تو یہ خاص بات ہے۔ اور اندلس میں بھی ایسا ہے۔ اور شمال مغربی افریقہ میں خط کے عجیب عجیب نمایے ہوئے ہیں جن کے باعث آج کل یہاں والوں کو پڑھنے میں دقت ہو گی۔ ک الف زبر (کا) اور ط ا زبر (طا) دونوں کی ایک سی شکل ہے۔ مجھے خود جب میں سمط اللالی پر کام کر رہا تھا تو طلی کلی کا لفظ آیا اور ہمارے کاتب نے جو مکہ کا رہنے والا تھا بارھویں صدی ھجری میں ، اس نے طلی کو کلی لکھا ہے مگر جب اندلسی نسخہ میں میں نے دیکھا اور مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اندلسی ط کو کیسے لکھا کرتے ہیں۔

سوال :۔ایک ذرا سی بات پوچھوں کہ۔حمیری خط کے کتبے کی بابت۔وہ کتبے جو نکلے ہیں اس میں تو خط کوفی سے بھی زیادہ واضح بہت اچھا خط عربی کا معلوم ہوتا ہے۔

یہ میں نے مانا کہ نکلے ہیں ، یہ صحیح ہے مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس زمانے کے ہیں جب خط مسند حمیری کا رواج تھا۔ خط مسند حمیری کی کچھ خصوصیتیں ہیں اور ایک چیز میں عرض کر دوں کاش میں نے پہلے عرض کر دیا ہوتا تو کچھ عقدہ حل ہوجاتا ، حمیریوں میں ایک بڑا عیب تھا ، وہ سب لوگوں کو خط سیکھنے نہیں دیتے تھے اور مخصوص طبقے کے لوگ تھے کہ جن میں یہ خط سکھایا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس وقت اسلام آیا ہے تو پورے یمن میں کوئی آدمی ایسا نہیں رہا تھا کہ جو خط مسند حمیری کے اندر لکھنے کے قابل ہو۔ یہ میں نے خود عربی کتابوں میں پڑھا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خط مسند حمیری ختم ہوگیا سبب یہ ہے کہ ادھر تو حبشیوں کے ماتحت رہے ، ادھر ایران بھی تھا ، ادھر اسلام شروع ہوا اور صحابہ یہاں آنے شروع ہوئے اور وہ گورنر ہوئے تو انہیں عربی زبان کی طرف

توجہ دینی پڑی نتیجہ یہ کہ خط مسند حمیری جس کو پہلے ہی سے حمیریوں نے عام رواج نہیں دیا تھا وہ دنیا سے غائب ہو گیا۔ یہ تو میں نے خود پڑھا ہے کتابوں میں آپ چاہیں تو میں نکال کر دکھادوں۔ رہا موجودہ رسم الخط تو وہ تو انبار سے آیا ہے۔ انباری خط کی اصل شکل ہے کتاب فہرست ابن الندیم میں آپ کو ملے گی اس میں انہوں نے ذرا ذرا سا تغیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ علی طول الزمان اور مسلمانوں کی ایک کمال کی بات آپ سے عرض کروں اور جتنی بھی داد دی جائے کم ہے وہ یہ ہے کہ عربوں نے یہ خط جب ان کے پاس آیا تو اس کو کوئی پانچ سات آٹھ نو دس شکلیں دیں۔ آگے چل کر اور ایک ایک کے اتقان تنمیق او تحسین میں جو کمال دکھایا ہے اس کی کوئی مثال ہی نہیں اس لیے سب کا یہ کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں نے مصوری کو کم لیا ہے یا چھوڑ دیا ہے یا کچھ ٹھہرے ہیں تو انہوں نے خط لے لیا ہے جو مصوری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ آپ دیکھیے یہ ابن بواب جس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو نسخے سینٹرل انسٹیٹیوٹ میں میں نے محفوظ کر دیے ہیں اور یہاں بھی اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بعض صفحات اب بھی میرے پاس موجود ہوں گے۔ اس کے استاد ہیں ابن اسد قاری، ساڑھے تین سو ہجری کے زمانے کے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب امالی یزیدی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور ان سے آگے زمانہ ہے ابن مقلہ کا اور ابن مقلہ سے پہلے اتنا اعلیٰ خط نہیں تھا اور جو خط ابن مقلہ کے زمانے تک مروج تھا اور ابن مقلہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے اس کی مثالیں آپ کو بہت سی مل جائیں گی۔ جن کتابوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ دوتین کتابوں کے اور بھی نام سن لیجیے۔ ایک کتاب ہے کہ جب طاہر ابن الحسین مامون کے زمانے میں خراسان کے گورنر ہوکر جانے لگے تو مامون سے انہوں نے درخواست کی کہ حضور میری اولاد ایران میں رہے گی تو ان کی عربی تباہ ہوجائے گی، مجھے اجازت دیجیے کہ میں پانچ چھ بدو عربوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اور کہنے لگے کہ ہماری صحت کا کیا ہوگا۔ غیر ملک میں جا رہے ہیں فلانے حکیم کو ہمارے حوالے کیجیے تو مامون نے کہا: اچھے اچھے آدمی چن کر تم لے جاؤ گے تو ہمارے پاس بغداد میں کیا رہے گا، تو کہنے لگے کہ حضور اس کے بغیر تو چارہ نہیں، کہا اچھا لے جاؤ چلو اجازت مل گئی۔ اب سنیے، آپ اپنے کانوں کو کھڑا کر کے رکھیے ایسے وحشی نام سناؤں گا کہ ان کے سننے سے جنات بھی بھاگ جائیں گے۔ ابوالعجنس عبسجو، عوسجہ عرام بن الاصبغ ابو العمیثل الاعرابی ان میں کے یہ پانچ چھ آدمی ہیں ان میں سے ایک ابو العمیثل کا نام میں لوں گا۔ ابو العمیثل میں ممتاز صاحب کے سوال کا تھوڑا سا جواب بھی آجائے گا وہ یہ ہے کہ ابو العمیثل الاعرابی تھا اس کی زبان بڑی بھاری تھی اور عربی کا بڑا ماہر تھا، لکھنا پڑھنا ایسے نہیں آتا تھا۔ مگر بہت قابل آدمی تھا تو جب ابو تمام جو عربی کا اتنے اونچے مقام کا شاعر ہے جب یہ خراسان گیا اور عبد اللہ بن طاہر کو یہ قصیدہ سنانا چاہا جس کا مطلع ہے:

ادملت مصونات الدموع السوا کب   علی مثلها من اربع و ملاهب

اس قدر خوبصورت قصیدہ ہے کہ میری زبان میں طاقت نہیں ہے کہ تعریف کرسکوں۔ اس نے سنانا چاہا تو جناب وہاں کا دستور معلوم ہوا کہ آپ سنا نہیں سکتے جب تک ابوالعمیثل پاس

نہ دے دے لہذا ابو العمیثل کے پاس گئے اور ابو العمیثل نے کہا کہ یار برا اچھا قصیدہ ہے کل ہی مجھے موقع دلوا دیتا ہوں۔ اس نے انصاف کیا ، اور آج کل کا حال یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر حسد کرتے ہیں ، یاد رہے کہ ابو العمیثل خود بھی شاعر تھا ، ہمارے ہاں کے لوگ ایسے موقع پر سیاست کرتے ہیں ، تو وہ قصیدہ سنایا گیا اور اس پر بہت ہی انعام و اکرام دیا گیا اور بہت قدر کی گئی اس کی۔ اب سنیے ابو العمیثل نے ایک کتاب لکھی ہے "ما اتفق لفظہ و اختلف معناہ"۔ اور ابو العمیثل کے متصل زمانے میں کوئی چالیس تیس برس آگے پیچھے دو تین چار پانچ چھ کتابیں لکھی جاچکی ہیں اس موضوع پر۔ ان میں ایک کتاب کو مجھے فخر حاصل ہے کہ میں نے شائع کیا تھا اور وہ مبرد کی "ما اتفق لفظہ و اختلف معناہ من القرآن المجید" ہے ، قرآن مجید میں ایسے الفاظ کہ الفاظ ایک ہیں اور معنی الگ الگ ہیں خیر اس موضوع پر میں نے بڑی نفیس کتاب لکھی ہے ، مبرد کی کتاب کا نسخہ یانیزید کے کتب خانہ میں موجود ہے ۲۸۰ ھجری کا لکھا ہوا ، اور اس کے آخر میں لکھا ہے" و کتب ابو الجہم و ھو یشھد ان لا الٰہ الا اللہ سنتہ ثمانین و مائتین"۔ یہ کتاب لکھتا ہے ابو الجہم جو خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے سنہ ۲۸۰ ھجری میں ، کتاب موجود ہے اس کے ایک آدھ صفحے کا فوٹو اب بھی میرے پاس پڑا ہوا ہے۔ اچھا ایک بڑی مقدس کتاب ہے کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں اور وہ اس قابل ہے کہ اس کو آنکھوں سے لگایا جائے ، حضرت امام احمد بن حنبل سے اکثر فقہی اور دینی سوالات کیے جاتے تھے۔ امام احمد بے انتہا محتاط بزرگ تھے اگر انہیں قرآن پاک کی کوئی آیت یاد ہوتی تھی تو سنا دیتے تھے اور فتویٰ نہیں دیتے تھے فتویٰ دینا ان کے اصول کے خلاف تھا اگر حدیث میں واقعہ کہیں ملتا تو وہ حدیث سنا دیتے تھے اگر صحابہ اور تابعین کے کوئی فیصلے ملتے تھے تو وہ بھی سنا دیتے تھے اور اس کے بعد کہتے تھے بھئی دیکھو میں نے قرآن شریف میں غور کیا حدیث میں غور کیا اور جو فتاوی صحابہ اور تابعین کے تھے ان میں سوچ کیا مجھے تو کہیں ملا نہیں تو لوگوں نے کہا امام صاحب قرآن و حدیث کو آپ نے اتنا پڑھا ہے اس کے جو قواعد و قوانین و ضوابط ہیں ان کی بنا پر کوئی فتویٰ دیجیے اس کے بغیر کیسے کام چلے گا؟ تو کہنے لگے کہ تم اپنے آپ ہی یہ کام کرلو سارا بوجھ میرے اوپر نہ ڈالو۔ یہ تھے امام احمد بن حنبل تو ان سے جب فتوے پوچھے جاتے تھے تو ان کے ایک شاگرد تھے ان کا نام سن لیجیے امام ابو داؤد سجستانی۔ جن کے متعلق ابن الاعرابی کا یہ قول ہے کہ خدا کی کتاب کے بعد سنن ابی داؤد سجستانی مسلمان کے لیے کافی ہے کوئی ضرورت نہیں کسی اور کتاب کی۔ خود انہوں نے امام احمد کی مجلس میں بیٹھ کر جو سوالات کیے گئے تھے ان کے جوابات جو امام احمد بن حنبل نے دیے ہیں اپنے قلم سے لکھے ہیں اور یہ ۲۶۴ ھجری کا لکھا ہوا نسخہ امام ابو داؤد کے ہاتھ کا کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے اور یہ چھپ بھی چکا ہے اور میرے پاس ایک دو صفحے کا فوٹو ہے۔ اس کے علاوہ آپ دارالکتب المصریہ میں جائیں تو امام شافعی کے شاگرد مزنی جو تھے ، ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی امام شافعی کی "کتاب الرسالہ"، وہاں موجود ہے اور مصری گورنمنٹ اور مصر کے باشندے اسے آنکھوں سے لگاتے ہیں ، قدیم ترین کتاب ہے اور بہت پیارا نسخہ ہے۔

(باقی آئندہ)

(بیاد زیبا)

قطعہ تاریخ وفات

جو چھ ہجری اور چار عیسوی مادوں پر مشتمل ہے

نسیم امروہوی

سید علی حسنین زیبا ردولوی مرحوم، جو تقریباً دو سال پہلے انفارمیشن افسر (مرکز) کے عہدے سے پنشن لے کر سبکدوش ہوئے تھے، یکم جولائی ۱۹۶۸ء کو اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے رحلت کر گئے۔ مرحوم دور حاضر کے ایک مستند ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ خصوصاً آپ کے قصیدے، مناقب، نوحے اور مرثیے بہت مقبول و مشہور ہیں۔ غزلیات اور نظموں کے علاوہ آپ نے کم و بیش پچاس قصیدے اور چھ سات مرثیے کہے، جن کا اقتباس آئندہ کسی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔ بیرونی ناظر کی حیثیت سے آپ نے ہماری زیر تدوین لغت کے لیے معتدبہ تعداد میں سندیں اور مثالیں فراہم کیں، جو مرحوم کی یادگار کے طور پر ہمارے ذخیرۂ اسناد میں شامل رہیں گی۔

ادارہ

چن لیے ہیں کیسے کیسے پھول رضواں نے نسیم
بس گئی ہے رنگ و بو کی ایک دنیا خلد میں

با عمل، عالم، محدث، خطبہ خواں، واعظ، فقیہ
کل زمیں پر منتشر تھے آج یکجا خلد میں

مومنین و موقنین و صالحین و زائرین
حسب ترتیب مراتب جلوہ آرا خلد میں

متقی، غازی، نمازی، معتکف، زاہد ولی
قاری قرآں کہ جن کا بول بالا خلد میں

عابد شب زندہ دار و حق گزار و روزہ دار
صورتیں ہیں نور کی اللہ کیا کیا خلد میں

عاشقان آل و سلطان سر خم غدیر
حوض کوثر کے کنارے زیر طوبیٰ خلد میں

دیکھ اے خاک حرم ہر بوترابی کا یہ اوج
خاکساری سے ملا قصر معلیٰ خلد میں

امتیں موجود سارے انبیا کی ہیں، مگر
امت مولیٰ ہے ہر امت سے اولیٰ خلد میں

خون کا غازہ ملے رخ پر شہیدان وفا
سرخرو اپنے عمل سے پیش مولا خلد میں

مرثیہ گویان فرزند علی و فاطمہ
کھولتے ہیں مرثیہ خوانی کا بستہ خلد میں

ہے وہی مجلس وہی ذاکر وہی سب سامعین
کھنچ گیا ہے ہو بہو دنیا کا نقشہ خلد میں

جس جگہ یہ ذاکر و مداح مولا ہیں، وہیں
بہر زیبا مسند شایاں و زیبا خلد میں

کون زیبا؟ وہ جو اک نووارد بزم بہشت
آمد آمد کا ہے جس کی آج چرچا خلد میں

کون زیبا؟ وہ جو فرش خاک پر ہے محو خواب
مدح خوانی پر ہے تکیہ اور بچھونا خلد میں

کون زیبا؟ وہ کہ جس کے شاہباز فکر کا
آشیاں تھا کربلا میں اب بسیرا خلد میں

شعر جس کے محفلوں میں سن گئے ہیں جبرئیل
اس سے پہلے جاچکا ہے نام اس کا خلد میں

لے گئی نہ کچھ کے دنیا سے جیسے متقی سخن   اب سناؤ چل کے مولا کو قصیدہ خلد میں
اللہ للہ ضعف پیری میں یہ سعی پر ثمر   جان جب کھوئی شباب اس وقت پایا خلد میں
اس ادا سے کچھ قضا آئی کہ دے بیٹھا وہ دل   روح پہنچی بعد میں دل پہلے پہنچا خلد میں
اس محل پر یہ ہوئی تاریخ رحلت بر محل   ''پیکر بے دل لحد میں روح زیبا خلد میں''

۱۳۸۸ھ

گلشن رضواں میں میں کر سب نے یہ مصرع نسیم   اک نیا گلدستہ' تاریخ باندھا خلد میں
رحمت باری سے فرمانا سطور یادگار   ''محفلیں برپا ہوں پہنچیں جلکہ زیبا خلد میں''

۱۳۸۸ھ

لن ترانی تھا امر حق ۔ رضواں پکارا ناگہاں   ''وہ سنا حیدر نے زیبا کا قصیدہ خلد میں''

۱۳۸۸ھ

دی صدا جنت کے غنچوں نے چٹک کر دم بدم   ''عطر بیز محفل حسنین زیبا خلد میں''

۱۳۸۸ھ

خیمہ مجلس پر پکارے ''واہ'' کہہ کر جبرئیل   ''نوحے زیبا کے ہیں سب مقبول زہرا خلد میں''

۱۲   ۱۲۷۶   ۱۲۸۸ھ

دی صدا عیسیٰ نے مرہم ۔ اٹھ کر چرخ سے   ''مصطفیٰ بھی سن رہے ہیں شعر زیبا خلد میں''

۹۶۸ ع

یہ بھی سن لو ۔ ''جمع ہیں سب اک مجلس کے لیے   مصطفیٰ 'زہرا ، علی، حسنین، زیبا خلد میں''

۱۱۳۸

چاہے یوں کہہ لو بتکرار حروف بیناب   در نجف میں، ضوسہ و انجم میں ، زیبا خلد میں

۹۶۸

چاہے استخراج سن، معجم سے کر کے یوں کہو   منقبت خواں اور سرافراز ، زیبا خلد

۹۶۸

سن کے یہ ہجری سن بول اٹھے حروف مہملہ
سربسر حور و قصور اور کلک زیبا خلد میں

۱۳۸۸ھ

اردو لغت کی مجمل اشاعت

اردو لغت کے اجزا' جو ''اردو نامہ'' کے ساتھ ساتھ قسط وار
چھپتے ہیں چار آنے فی جز کی شرح سے خرید کئے جاسکتے ہیں ۔
سابقہ اجزا' میں اب صرف جزو ۹ تا ۲۴ بہت محدود تعداد میں باقی ہیں ۔
ترقی' اردو بورڈ ، اردو منزل ، جمشید روڈ کراچی ۔ ۵

شاعر

نسیم امروہوی

شاعر گرہ کشائے رموز حیات ہے — ہر رخ سے اس کے حسن نظر کائنات ہے
صورت گری میں آئینہ دار صفات ہے — دنیائے عنصری میں ہے اور نور ذات ہے

عالم قریب تر جو یہ لاتا ہے دور کا
مخلوق کبریا میں ہے خالق شعور کا

شاعر، حریم غیب کا آئینۂ ظہور — ہر منزل وجود و عدم پر جسے عبور
یہ اس کی ہے نظر جو فروغ چراغ طور — یہ اس کی بے خودی کہ خودی کا جسے شعور

دراصل شاہکار خدائے جلیل ہے
یہ ناظم حیات کی نظم جمیل ہے

شاعر کی زندگی ہے کہ اعجاز آب و گل — فکریں ہوں لاکھ، پھر بھی نہ ہو فکر مضمحل
اس کا شعور حرکت درد، بصد درد جاں گسل — بیگانۂ سکون و تغیر پسند دل

یہ انقلاب نو کی تمنا لیے ہوئے
سینے میں زلزلوں کی ہے دنیا لیے ہوئے

شاعر کہ جس کی فکر میں تخلیق کی نمود — فطرت کا خون گرم ہے بالاتر از جمود
حق یہ بھی کہ اس سے ہے تحقیق کا وجود — یہ نیست اور نبود میں ہے شان هست و بود

خشک اور تر نگاہ میں اس کی تمام ہے
یہ حق پسند ہو تو خدا کا کلام ہے

شاعر نہ ہو جو کفر و ضلالت سے ہمکنار — الہام ہے پھر اس کا کلام ملک وقار
کس کو نصیب نوع بشر میں یہ افتخار — شاعر، براہ راست ہے تلمید کردگار

سو بندشوں سے عقدۂ دل کھولتا ہوا
گویا ہے اک صحیفۂ حق، بولتا ہوا

شاعر کا یہ شکوہ مسلم ہے لا کلام — لیکن نہیں سب اہل سخن کا یہ وصف عام
کچھ ان میں وہ ہیں جن کا تخلص برائے نام — کچھ ہیں برائے بیت فقط داد کے غلام

کچھ وہ کہ جن کو وزن و قوافی سے کام ہے
کچھ وہ کہ خود کلام میں جن کے کلام ہے

بعضوں کا ہے مذاق سخن ساغر و سبو — بعضوں کو صرف کوچۂ جاناں کی جستجو
بعضے، ہلاک شیوۂ امید و آرزو — بعضے، تلاش دل میں دل آشفتہ کو بکو

کچھ وہ ، کہ غرق اپنے کلامِ و کمال میں
کچھ پھنس کے رہ گئے خم کاکل کے جال میں

قاصر ہے اوج شعر سے زلفوں کی یہ کمند   اس قید سے ادب کی ہے منزل بہت بلند
شاعر وہ ہے کہ جس کا تخیل ہو ارجمند   سینے میں جس کے دل ہو مگر دل بھی دردمند

پرواز فکر رو کش روح الامین ہو
بالائے عرش جس کے سخن کی زمین ہو

قدرت نے کی ہے جن کو عنایت یہ مقدرت   ان کا سخن فلاح بشر ہے بہر جہت
ان شاعروں میں بھی زرہ قدر و منزلت   ممتاز تر ہے وہ جو کہے نعت و منقبت

پھر کیا کلامِ شعر کے حسن قبول میں
گزرے جو عمر مدحت آل رسول میں

مدحت کی بزم میں بھی توسل جو ایک بار   شاعر قلیل ، اور متشاعر ہیں بے شمار
اک نقل ، ایک اصل ، وہ صحرا ، یہ لالہ زار   وہ اک درخت خشک ، یہ اک نخل سایہ دار

وہ ترجمان وہم و گمان و سراب ہیں
یہ شاعری میں شارح ام الکتاب ہیں

زیبا ، کہ ہے یہ مجلس غم جس کی یادگار   اس صنف شاعری کا شعور اس کا تھا شعار
مدحت میں گل کھلاتی تھی طبع شگوفہ کار   تشبیب سے شباب تولا تھا آشکار

ہر شعر اس کا آیت ذوق سلیم تھا
اک امتزاج حسن جدید و قدیم تھا

دیکھے کوئی جو اس کے قصائد کو اک نظر   لفظیں بھی شاندار ہیں معنی بھی خوب تر
ذکر مجاز میں بھی حقیقت ہے جلوہ گر   پیش نظر بیان و معانی کے سب ہنر

گزرا سخن کی راہ میں راہیں نکال کے
فن کے پل صراط پہ خود کو سنبھال کے

وہ اس کی منقبت کہ عقیدت کی آبرو   وہ مرثیہ کہ رنگ میں جس کے ولا کی بو
ایک ایک لفظ ، آئینۂ فکر ہو بہو   ایک ایک حرف ، شانہ کش نظم مو بمو

تقریر وہ ، کہ زینت انشا کہیں جسے
تحریر وہ نگارش زیبا کہیں جسے

مدحت کے بعد رنگ تغزل کو دیکھیے   زور بیان و حسن تخیل کو دیکھیے
فطرت سے فلسفے کے تقابل کو دیکھیے   نباض کی نظر سے رگ گل کو دیکھیے

برج اسد ہے صید ، نظر کی کمند میں
عکس علوئے نفس ہے فکر بلند میں

مفہوم وہ کہ جدت و رنگین و لاجواب — اسلوب وہ کہ فہم کی لغزش کا سد باب
مضمون، کہ جس کی گود میں تخئیل کا شباب — معنی، کہ روح جس کی حلاوت سے بہرہ یاب
لفظیں، کہ جو روانی دریا سے کھاٹ لیں
محظوظ ہو کے اہلِ زباں ہونٹ چاٹ لیں

اس کی زبان تھی لب گویائے شاعری — اس کی نگاہ دیدۂ بینائے شاعری
شاگرد نجم، انجمن آرائے شاعری — یوسف لقا برائے زلیخائے شاعری
کنعاں کا حسن، مصر کا ہر کیف خواب تھا
اکسٹھ برس کے سن میں سخن پر شباب تھا

آغاز بھی سخن کا حسیں تھا مآل بھی — زیر نگیں کلام بھی تھا اور کمال بھی
قبضے میں حس خلق بھی حسن مقال بھی — غم جھیلنے میں سخت بھی نازک خیال بھی
اک ترجمہ حسینت مشرقین کا
سب سے بڑا شرف کہ ثنا خواں حسین کا

جو مطلع قصیدۂ غربت ہے وہ حسین — جو مقطع سلام شہادت ہے وہ حسین
جو مصرع کلام مشیت ہے وہ حسین — جو شاہ بیت خمسہ عصمت ہے وہ حسین
جو نظم شش جہت کے مسدس میں فرد ہے
جس کے لیے غزل میں بھی تاثیر درد ہے

باغ و بہار

مصنفہ میر امن دہلوی

میر امن دہلوی کا وہ لافانی شاہکار جس کی دل آویزی و دلچسپی آج بھی روز اول کی کی طرح ضرب المثل ہے۔ یہ ایڈیشن عام بازاری ایڈیشنوں سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسے ہمارے مشہور نقاد پروفیسر ممتاز حسین نے ڈنکن فاربس کے مستند نسخے سے مرتب کیا ہے۔

شروع میں انہوں نے اپنا عالمانہ مقدمہ اور آخر میں مشکل الفاظ و محاورات کی فرہنگ بھی شامل کی ہے جس کی وجہ سے اس نسخے کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اردو منزل جمشید روڈ کراچی۔ ۵ سے طلب فرمائیں

قیمت مجلد فی نسخہ ۵۰-۹ روپے۔

مراسلات

مکرمی ۔ سلام مسنون ۔

اسناد کے متعلق جو ایک مسلمہ اصول مدت سے چلا آرہا ہے اور جس پر قریب قریب ہمارے سب لغت نویس عمل کرتے رہے ہیں آپ کی لغت میں اس پر کما حقہ عمل نہیں کیا گیا ہے ، وہ اصول یہ ہے کہ صرف مستند اساتذہ کے یہاں سے مثالیں پیش کی جائیں اور کسی ایسے شاعر یا ادیب کی تصانیف سے مثالیں پیش نہ کی جائیں جو حیات ہو۔

اس اصول پر کاربند نہ رہنے کا شاید ایک سبب یہ بھی ہوا ہے کہ آپ نے قریب قریب ہر لفظ کے استعمال کی سند پیش کرنے کی کوشش کی ہے ، میرے نزدیک اس کی ضرورت نہیں تھی ، دنیا کی ہر زبان میں خصوصاً بول چال کی زبان میں سینکڑوں لفظ ایسے ہوتے ہیں جن کے استعمال کی کوئی سند پیش نہیں کی جاسکتی ۔

سند کے لیے کسی صرف مطبوعہ کتاب کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے ، بلکہ یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کتاب کا مصنف کون ہے ، مستند مصنف ہے کتاب نہیں ، مثلاً اکتوبر ۶۹ء کے ''اردو نامے،، میں صفحہ ۱۴۴ کے دوسرے کالم میں ''جند ہم عصر،، یا ''رویائے صادقہ،، کا حوالہ دیا گیا ہے گو یہ دونوں کتابیں بہت مشہور ہیں پھر بھی آپ ہر اردو خواں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ان کتابوں کے مصنفوں کے ناموں سے آگاہ ہوگا ، میرے نزدیک حوالہ اس طرح دینا چاہیے تھا :

عبدالحق (جند ہم عصر) نذیر احمد دہلوی (رویائے صادقہ)

آپ نے چند غیر معروف اور غیر مستند کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ، مثلاً احوال الأنسا' (اس نام کی دو کتابیں ہیں) ''فسانہ' ازدواج ، انتخاب فتنہ،، (اس میں صرف رماض ہی نہیں بلکہ اور لوگوں کے مضامین بھی ہیں جو سب کے سب مستند قرار نہیں دیے جاسکتے اور 'فردوس تخیل، وغیرہ کے حوالے صفحات ۴۳۲ اور ۴۳۳ پر دئیے گئے ہیں ؛ صرف یہی نہیں 'تاریخ ہندوستان، کا حوالہ بھی موجود ہے جو ایک دو نہیں تیس چالیس کتابوں کا نام ہے ۔

صفحہ ۱۴۴ پر پہلے کالم میں ''احتیاط کرنا،، بھی ہونا چاہیے تھا ۔ خدا جانے یہ محاورہ کیوں شامل نہیں کیا گیا ۔

صفحہ ۱۴۴ پر ایک لفظ ''احنا بحنی،، درج ہے ۔ جہاں تک مجھے علم ہے ، یہ کبھی اردو میں استعمال نہیں ہوا ، مرادی دادا پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ، اس لفظ کے معنی بیان کرتے ہوئے 'بحنا بحنی' کی جگہ 'بحنا بحنی، ہونا چاہیے ۔

صفحہ ۴۴۴ کے کالم میں ''احداق،، کے استعمال کی سند پیش کرتے ہوئے جو شعر درج کیا گیا ہے اس کے نیچے ''اودھ پنچ،، لکھا ہوا ہے ، یہ لکھنا چاہیے تھا کہ وہ شعر کس شاعر کا ہے ''اودھ پنچ،، ایک اخبار تھا جس میں مختلف لوگوں کے مضامین اور اشعار شائع ہوتے تھے جن میں مبتدی اور نو مشق لوگ بھی شامل تھے ۔

اس کے علاوہ اس لفظ کے متعلق یہ بھی لکھ دینا چاہیے تھا کہ یہ لفظ اب استعمال میں نہیں ہے ، جو الفاظ متروکات میں شامل ہیں ان کے متعلق یہ ضرور لکھ دینا چاہیے کہ یہ اب استعمال میں نہیں ہیں ، تمام زندہ زبانوں میں ترک و اختیار کا عمل برابر جاری رہتا ہے ، لغت نویس بھی اگر متروکات کی تصریح نہ کریں گے تو کون کرے گا؟ اس صورت میں آپ یہ فیصلہ صادر نہیں فرمائیں گے کہ فلاں لفظ متروک ہے بلکہ آپ ایک واقعہ بیان کریں گے . لفظ زندہ بھی رہتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں ، جس لفظ کا استعمال اس زبان کے بولنے والوں نے ترک کر دیا وہ گویا مر گیا ، اسی مرحوم لفظ کو ہم متروک کہتے ہیں اور جب ہم ایک متروک لفظ کی نشاندھی کرتے ہیں تو گویا ہم اس کی موت کا واقعہ بیان کرتے ہیں ، اس طرح اس کی موت کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہوتی۔

اردو نامہ بابت ماہ جنوری ۱۹۶۸ء میں صفحہ ۵۰ ، ۳۴ کے دوسرے کالم میں لفظ احساسات کے متعلق میرے نزدیک یہ وضاحت کر دینی چاہیے تھی کہ اردو میں بعض لفظوں کی جمع الجمع رائج ہے ، مثلاً حس کی جمع احساس اور احساس کی جمع احساسات ۔ یا وجہ کی جمع وجوہ اور وجوہ کی جمع وجوہات۔

کراچی	اثر میرٹھی	(جواب کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ افتتاحیہ)

مارے حفی۔ محبت اور سلام۔

آج بہت دنوں کے بعد اردو نامہ کا تازہ شمارہ ملا۔ تمہاری تازہ غزل پڑھی ، لطف اندوز ہوا۔ جو نوٹ تم نے غزل پر لکھا ہے ، دراصل بڑا ادبی مسئلہ ہے ۔ اس موضوع پر صحت مند بحث کی ضرورت ہے ۔ جب یہ رعایت ترکی اور عربی الاصل الفاظ کے ساتھ ہے تو ہندی الاصل الفاظ کے ساتھ کیوں نہیں، اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ جب اردو اسی فیصد ہندی الاصل ہے ۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسی ترکیبیں جائز قرار دی جائیں ۔ دو سال پہلے میرے ایک عزیز منظر شہاب نے جو ایک ڈگری کالج کے پرنسپل اور ذی علم آدمی ہیں ۔ اپنی ایک غزل کے مصرعہ میں ''خطرہ انجان،، کی ترکیب استعمال کی تھی ۔ اس پر ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی تھی ۔ اور مجھے یہ دیکھ کر واقعی رنج ہوا تھا کہ ساری بحث میں صرف دو آدمیوں نے دبی دبی حمایت کی تھی ، باقی لوگوں نے مخالفت ۔ اردو زبان کی اصل ہندی ہے ۔ عربی ، ترکی ، فارسی اور دوسری زبانیں پیوند سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں ۔ اردو گرامر عربی یا فارسی گرامر نہیں ، ہندی گرامر ہے ۔ افعال سارے ہندی ہیں ۔ پھر یہ پابندی رہے سے غلط نظر آتی ہے ۔ اس پر باضابطہ ایک مقالہ لکھو ۔ ۔ ۔ تمہارے نوٹ کا ردعمل دیکھنا ہے ۔

پچھلے دنوں جذبی علی گڑھ سے آئے تھے ۔ دیر تک تمہارا ذکر رہا ، دریا گنج سے تراھا بیرمخاں تک کی کہانیاں دھرائی گئیں ۔ ایک سال پہلے جاں نثار آئے تھے ۔ ان سے بھی ذکر آیا تھا ۔ پرانی یادیں تھوڑی دیر کے لیے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں ۔

پٹنہ ۔ ۲۶ جولائی ۱۹۶۸ء	تمہارا
سہیل عظیم آبادی

محترمی حقی صاحب ، سلام مسنون ۔

تازہ اردو نامہ نظر سے گزرا ۔ آپ نے ڈاکٹر شہید اللہ صاحب کا مضمون شائع کرکے نہ صرف اپنا وعدہ پورا کردیا بلکہ ممنون بھی کیا ۔ مجھے امید ہے آپ آئندہ اشاعت میں ، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے ، بورڈ کا منظور شدہ ضابطہ عام اشاعت کے لیے شائع کردیں گے ۔

(۲) آپ نے بہت اچھا کیا کہ جن لفظوں کی سندیں درکار ہیں ان کی فہرست شائع کردی ہے ۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ فہرست آئندہ ہر شمارے میں ضرور چھاپی جائے تاکہ بار بار لوگوں کی نظر سے گزرے ۔ عین ممکن ہے کہ یہ شمارہ کسی صاحب کو نہ ملے اور وہ تعاون سے محروم رہیں ۔ آپ نے اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ سند کی شرطیں کیا کیا ہیں ۔ اس کی تفصیل بھی لکھیے گا ۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ان لفظوں کی فہرستیں دھلی ، لکھنو ، حیدر آباد ، الہ آباد ، علی گڑھ وغیرہ کے اساتذہ ، ادیبوں اور عام اھل ادب کی خدمت میں خطوں کی شکل میں بھیجی جائیں ۔

(۳) امید ہے " فادات سمنی" کا سلسلہ منقطع نہیں ہوگا ۔ متواتر چھپتا رہے گا ۔ ناغے کے بغیر ۔

(۴) جلد اول کب تک چھپے گی ۔

(۵) کیا یہ ممکن نہیں کہ اردو نامہ پابندی وقت سے شائع ہو ۔ امید ہے مزاج گرامی خیریت سے ہوگا ۔

لاھور ۔ ۲۷ جولائی   محمد احسن خاں

مثال کسی مستند مصنف کی ھوبھو یقیناً بہتر ہے ، لیکن اس کا ملنا پہلی شرط ہے ۔ ہم نے سند کے سجیدہ مسئلے دونوں ہی حل کیا ہے یہ حوالہ دینا ہمارا کام ہے ، ماننا یا نہ ماننا پڑھنے والوں کا ۔ ظاہر ہے کہ تمام الفاظ کی سندیں دھلی یا لکھنو کے اساتذہ کی تحریروں میں سے نہیں مل سکتیں ۔

اردو نامہ پوری پابندی کے ساتھ اسی وقت شائع ہوسکے گا کہ بورڈ کے پاس اپنا پریس ہو ۔

ادارہ

کرم گستر

ایک عریضہ جوش صاحب کے پتے کے لیے حاضر خدمت کیا تھا ۔ لیکن ابھی تک جواب نہیں آیا ۔ ان کو ایک ضروری خط بھیجنا ہے ، پتے سے سرفراز فرمائیے ۔

جناب شوکت سبزواری کے اشتقاقیات کا سلسلہ آج کل بند ہے ۔ امید ہے موصوف مع الخیر ہوں گے ۔

"اردو نامہ" شمارہ ۱۳ ملا ، بڑے شوق سے پڑھا ، مجھے یقین ہے کہ آپ کا گراں قدر لغت ہند و پاک کی تمام السنہ کے لغات سے بہتر ہوگا ۔

شمارہ مذکور کے صفحات ۵-۹۶ اور ۱۰۹ پر لغت کے جو الفاظ آپ نے اسناد حاصل کرنے کے لیے شائع کیے ہیں ان میں سے بعض لفظ اور ان کے معنی قابل غور ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ نے یہ سارے الفاظ اور ان کے معنی کسی شعر، کسی عبارت یا کسی لغت ہی سے حاصل کیے ہوں گے۔ یہ اشعار، یہ عبارتیں اور یہ لغات خود ان الفاظ کی سند ہیں۔ سند طلبی کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ ہاں اگر ان میں سے کچھ لفظ یا معنی کسی قیاس کا نتیجہ ہیں تو اس کی وضاحت فرمائیے تا کہ ان پر تبادلہ خیال ہوسکے۔(۱)

جن الفاظ کے اشتقاق پر آپ نے رائیں طلب کی ہیں ان کے ضمن میں کچھ باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ لیکن یہاں جنگل میں کتابیں موجود نہیں ہیں۔ فضول قیاس آرائی سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

صفحہ ۹ کی آخری سطر میں آپ نے چالیسا (۱۰۰) کے معنی "وید کے چالیس متبرک اشلوک"، تحریر فرمائے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وید کے اشلوک نہیں ہوتے۔ وید منتر ہوتے ہیں، منتر اور اشلوک میں فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ وظیفہ کی کتابوں میں ہنومان چالیسا تو مشہور کتاب ہے لیکن وید چالیسے سے میں واقف نہیں۔ اس قسم کے چالیسے کسی بھی کتاب کے بن سکتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی وید چالیسا بنا ہو۔ مگر وہ کتاب عام نہیں ہے۔ لہذا چالیسا کے معنی میں وید کی تخصیص غیر ضروری ہے۔(۲)

آپ کی غزل صفحہ ۹۷ کے متعلق کیا عرض کروں۔ آپ ہند و پاک کے سب سے بڑے لغت کے مرتب اور مدون ہیں۔ زبان کے معاملے میں تو آپ کو کافی محتاط ہونا چاہیے ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

اس غزل کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس غزل کو آپ نے "اردو نامہ"، میں شائع کیا ہے۔ اس قسم کے سہ ماہی علمی رسالے ایسے ہیجان خیز مواد کو کبھی نہیں چھاپتے۔

آپ کی پیش کردہ تجویز کے متعلق مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ اردو نے عربی فارسی الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں، لیکن ان زبانوں کو ہمیشہ زبان غیر سمجھا۔ زبان لفظوں سے نہیں قواعد زبان سے پہچانی جاتی ہے۔ اردو کے پاس خود اپنے قواعد زبان ہیں۔ اضافت اور واو عطف فارسی کے قاعدے ہیں۔ زبان غیر کے قواعد کا اردو پر تصرف غلط اورخلاف ذوق سلیم ہے۔ عہد قدیم میں جب زبان خام تھی تو اس قسم کی غلطیاں ہوئی ہیں۔ جو اب متفقہ طور پر ترک ہوچکی ہیں۔ پھولدان اور بھنگڑ خانہ وغیرہ کسی شے کے اسم ہیں اور اسم نہ جانے کتنے اثرات کے تحت معرض وجود میں آتے ہیں۔ یہ اسم غلط العام ہونے کی وجہ سے قبول تو کرلیے گئے ہیں لیکن اہل علم اب پھولدان کو گلدان کہنا پسند کریں گے۔ بھنگڑ خانے کا بازاری لفظ تو بمشکل ہی کسی میعاری ادیب کے یہاں نظر آئے گا۔

جناب غضنفر امروہوی نے اپنے مراسلے میں صفحہ ۱۰۳ کے آخر میں فرمایا ہے کہ لفظ کی ابتدا ساکن حروف سے محال ہے۔ یہ بات عربی فارسی لفظوں کے لیے تو درست ہے لیکن اردو لفظوں کے لیے درست نہیں۔ اردو میں کیا، کیاری، پیار، گیارہ، دھیان، نہائے وغیرہ میں حروف اول ساکن ہی ہیں۔

مجھے حضرت غضنفر کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کہ اردو عروض ہندی عروض پر مبنی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو عروض کا مزاج ہی ہندی عروض سے بالکل مختلف ہے ، سوائے کچھ عوامی بحروں کے سسکرت کی بیشر کلاسکی بحریں ہمارے معیار و موزونیت سے مطابقت نہیں کرتیں ۔ آج کل نام نہاد کھڑی بولی کے ہندی شاعر جن سنسکرت بحروں میں شعر کہتے ہیں ان کو اردو والوں کے علاوہ شمالی ہند کے عوام بھی موزوں پڑھ نہیں سکتے ۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ شاید آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے بعض عروضیوں نے ہندی یعنی (انڈین) تلفظ کی رعایت سے بعض نئے زحافات عروض میں داخل کیے تھے ۔ جن کو اساتذہ عہد نے نہیں مانا ۔ خود مجھے اپنے کام کے لیے ان رسائل کی تلاش ہے جن میں وہ مضامین نکلے تھے ، اردو بحروں میں ایک افاقی موزونیت ہے ۔ لہذا وہ ہندی بحروں سے جابجا محض اتفاقاً مماثل ہوجاتی ہیں ۔ حضرت غضنفر اپنے جس مضمون کا ذکر فرماتے ہیں اسے دیکھوں تب ہی ان کی بات سمجھ میں آسکتی ہے ۔ مگر یہاں وہ مضمون ملنا آسان نہیں ہے ۔

یہ بحث بالکل الگ ہے کہ اردو بحور کو ہندی بحروں کے مطابق بنایا جائے ۔ مجھے اس خیال سے شدید اختلاف ہے ۔ نام نہاد ہندی کھڑی بولی کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے ۔ یہ شعر و ادب سے یک لخت محروم زبان دنیا کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتی ۔ اس کے قریب جا کر اردو کی تطہیر ، شستگی ، ترنم اور موزونیت ہر چیز پر اثر پڑے گا ۔ واضح رہے کہ ہندی سے میرا مطلب اودھی ، برج بھاشا اور متیھلی وغیرہ نہیں ہے ۔ ان میٹھی اور کالعسل بولیوں کا شعری ادب دنیا کی عظیم ترین زبانوں کے شعری ادب کے برابر ہے ۔ ہندی سے میرا مطلب اس موقع پر صرف کھڑی بولی ہندی ہے ۔ جس کا پھوہڑ پن ناقابل علاج ہے ۔

قیصری بیگم صاحبہ کی "کتاب زندگی" ایک معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہے ۔ ایسی حسین چیز مدتوں کے بعد ادب میں آتی ہے ۔ مصنفہ کی سگفتہ نگاری پر غبطہ ہوتا ہے ۔

بمبئی (انڈیا) یکم اگست ۶۹۸ء صفدر آہ

---

۱ ۔ وہ الفاظ جن کی سند مطلوب ہے عموماً لغات ہی سے ماخوذ ہیں ۔ اگرچہ لغت کا حوالہ بھی ایک طرح کی سند ہے مگر ہم کو ان کے استعمال کی مثال درکار ہے ۔ استعمال کی سند درج کرنے کو ترجیح دی ہے ۔

۲ ۔ آپ کی رائے درست ہے "ہنومان چالیسا" کی سند ہمارے پاس موجود ہے ۔

ادارہ

جناب محترم ممتاز صاحب ، متعنا اللہ بطول حیاتکم ۔ سلام خلوص ۔

امید ہے جناب کے مزاج بخیر ہوں گے ۔ گو آپ سے تعارف نہیں ، مگر آپ کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا اعتراف کسے نہیں ہوگا ۔ خدا تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس دور میں نشر و اشاعت

کے طفیل سینکڑوں میل دور بیٹھ کر ہم ایک دوسرے سے راہ و رسم بڑھا سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ ایک لمبا عرصہ ایک جلیل الشان عہدہ پر فائز رہ کر بھی علم و ادب سے وابستہ رہے۔ اس دور میں ایسی مثالیں نایاب ہیں۔ آج اس قلمی محفل میں اس ناچیز کو بعض امور کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی صائب رائے کا اظہار فرما کر حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

اول ترقی اردو بورڈ ، کراچی جس جامع اردو لغت کی تدوین میں مصروف ہے اس کی طباعت کا باقاعدہ آغاز کب ہوگا؟

دوم کیا مجوزہ لغت میں تصاویر کا ذریعہ بھی استعمال میں لایا جائے گا؟

سوم ''اردو نامہ،، ہر تین ماہ کے بعد چھپتا ہے ، کیا اسے ماہوار نہیں کیا جاسکتا یا کم از کم ہر دو ماہ کے بعد چھپوایا جائے تاکہ زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑے۔

چہارم لغت اردو کی جو قسط ہر شمارے کے ساتھ شائع کی جارہی ہے کیا زیر ترتیب لغت میں جوں کی توں نقل ہوگی یا بعض ترامیم بھی ہوں گی کیونکہ ان اقساط میں بعض باتیں نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ مثلاً :

۱ ۔ ایک قسط میں ''اجلہ،، کا کلمہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے یہ ''جلیل،، کی جمع ہے اور جمع بناتے وقت ''تعلیل،، کے قاعدے سے دو لام کے بجائے ایک ہی لام مشدد لکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کلمے میں دو ہم جنس جمع ہوں گے تو وہاں ''اعلال،، کا عمل نہیں ہوگا بلکہ ''ادغام،، کا عمل بروئے کار لایا جائے گا۔ اس کے بارے میں جناب کا کیا ارشاد ہے ؟

۲ ۔ موجودہ شمارے میں بعض الفاظ لکھے گئے ہیں کہ ان کی اسناد وغیرہ درکار ہیں۔ ان میں ایک لفظ ''چاٹی،، لکھا گیا ہے اس کے سامنے معنی درج ہوئے ہیں : ''دودھ کی ہانڈی،، یہ لفظ پنجابی ہے اور اس کے معنی ، اس بڑے برتن کے ہیں جو گھڑا نما کھلے منہ کا ہوتا ہے اور دودھ بلونے کے کام آتا ہے۔ البتہ دودھ کی ہانڈی ایک دوسرا برتن ہے ، جس کے لیے اردو میں ایک کلمہ نہیں ملتا (شاید جناب کی نظر سے گزرا ہو) اسے پنجابی میں ''کاڑھنی،، کہتے ہیں۔ اس میں دودھ کو گرم وغیرہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی بناوٹ بھی بڑی ہانڈی سے ملتی جلتی ہے۔ پنجاب میں اسی قسم کی ہانڈیاں زمینداروں کے گھروں میں ساگ کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

۳ ۔ ایک لفظ ''چاتر،، درج ہوا ہے۔ اس کے معنی ''جری اور بہادر،، بھی ہوں گے۔ مگر اس کے اصلی معنی ''چالاک ، عیار اور مکار،، ہیں۔ ظاہر ہے یہ بھی پنجابی لفظ ہے اور اس کے وہاں یہی معنی ہیں۔ اس لیے ان کا اندراج بھی ضروری ہے۔

۴ - موجودہ شمارے میں ایک کلمہ ''احمدی،، درج ہوا ہے - اس کے معنی تفصیلاً لکھے گئے ہیں اور نہایت مناسب تفصیل درج ہوئی ہے ، مگر ایک جگہ لکھا گیا ہے : ''قادیانی مذہب رکھنے والا،، یہ معنی محل نظر ہیں - اول تو اس لیے کہ ''قادیانی مذہب،، کوئی مذہب نہیں - دوسرے اس لیے کہ کسی کو اسی نام سے پکارنا مناسب معلوم ہوتا ہے ، جو نام وہ اپنے لیے خود اختیار کرتا ہے - اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ''لا تنابزوا بالالقاب،، محترم آپ کی دور رس نگاہ مجھ سے کہیں آگے ہے - مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے - مجھے امید ہے کہ آپ جیسی علم دوست شخصیت ان امور کے بارے میں اس ناچیز کی حوصلہ افزائی فرمائے گی - والسلام -

کھاریاں کینٹ - ۲۵ اگست ۹۸ء نیاز مند ، یعقوب امجد

---

۱ - بے شک ادغام ہونا چاہیے -

۲ - ''جانی غالباً اردو نہیں - یہ اردو ''چھٹا،، کا بدل ہے - اردو میں دودھ دوھنے کا برتن ''دوھاونی،، ہے اور دودھ بلونے کا برتن ''بلونی،، -

۳ - اس معنی میں اصل اردو لفظ ''چمر،، ہے جو عموماً خواتین کے لیے مستعمل ہے - یہ لفظ سنسکرت سے لیا گیا ہے - ''چامر،، اس کی وہ شکل ہے جو برج زبان میں ہے میں نہیں سمجھتا کہ ''چانر،، بہادر کے معنوں میں ہے -

۴ - میرے خیال میں یہ تنابز بالالقاب نہیں - مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف نسبت کر کے اگر احمدی کہہ سکتے ہیں تو قادیانی کیوں نہیں کہہ سکتے - تنابز بالالقاب اس وقت ہوتا جب مذمت کا پہلو نکلتا - ویسے بہتر یہ ہے کہ لکھا جائے ''مرزا غلام احمد قادیانی،، کا پیرو -

ادارہ

میں کئی سال سے مرزا غالب کے بارے میں معاصرین کی تحریریں اور بیانات (منظوم و منثور دونوں) جمع کر رہا ہوں اور اس سارے مواد کو ''غالبیہ،، کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے پہلے تین ابواب ، نگار رام پور میں شائع بھی کرچکا ہوں - اس کا مقصد یہ ہے کہ غالب سے متعلق سارا خام مواد یک جا ہوجائے اور محققین اور ناقدین کو ادھر ادھر تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے - یہ سارا مواد میں نے کئی ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے - میں نے حتی الامکان موضوع سے متعلق تمام گوشوں کی چھان بین کی ہے لیکن اس کے باوجود اس امر کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ بعض مفید مطلب تحریریں میری نظر سے نہ گزر سکی ہوں - اس لیے میں غالبیات میں دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مندرجہ ذیل ابواب کی تقسیم کو ملاحظہ فرمالیں اور ان سے متعلق جو کچھ ان کے علم میں ہو یا ان کے پاس ہو اس سے مطلع فرمائیں میں اس لطف کرم کے لیے بےحد شکر گزار ہوں گا اور ان عطیات کو مرحمت فرمانے والے کے حوالے سے کتاب میں درج کروں گا -

ایسا بھی ہوا ہے کہ میری نظر سے بعض ایسی تحریریں گزری ہیں جنہیں غالبیہ میں شریک ہونا چاہیے تھا ، اور انہیں میں نے نقل بھی کرلیا مگر میری یاد داشتوں کا ایک فائل ضائع ہوگیا اور یہ تحریریں میری نظر سے اوجھل ہوگئیں مثلاً میں نے غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات نوٹ کیا تھا جس کا ایک مصرع یہ تھا ع

غالب جو مر گیا ہے تو دلی اداس ہے

اب کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ کس کا تھا اور میں نے کہاں سے نقل کیا تھا۔

اسی طرح غالب کے قیام لکھنو کا ایک واقعہ کسی رسالے میں علم جفر پر ایک مضمون میں درج ہوا تھا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ غالب کی لکھنو میں کسی جفار سے ملاقات ہوئی اور امتحاناً غالب نے ایک مصرع کہہ کر اس کے اعداد جفار کو بتا دیے اور دوسرا موزوں مصرع دریافت کیا۔ جفار نے دوسرا مصرع علم جفر کی مدد سے بنا دیا غالب اس سے بہت متاثر ہوئے اور علم جفر کے قائل ہوگئے۔ وہ دونوں مصرعے کچھ اس طرح ذہن میں ہیں۔

وہ ہیں مشاق ستم اور میں ہوں مشتاق کرم
طینت ان کی اور ہے میری طبیعت اور ہے

یہ واقعہ کس رسالے میں اور کس سنہ و ماہ میں شائع ہوا تھا معلوم نہیں ، اگر آپ کی نظر سے یہ دونوں تحریریں گزری ہوں تو حوالے سے مطلع فرمائیے (اس واقعہ کا تذکرہ جناب نیر مسعود صاحب رضوی نے میرے نام ایک خط میں کیا ہے مگر انہیں حوالہ یاد نہیں) بہر حال مندرجہٗ ذیل ابواب سے متعلق جو بھی مدد کی جاسکتی ہو مجھے امید ہے کہ اس سے محروم نہ رہوں گا۔

پہلا باب تذکروں میں غالب کا ذکر۔

دوسرا باب ملاقاتیوں کے بیانات۔

تیسرا باب غالب کے ملاقاتیوں سے انٹر ویو جیسے پروفیسر حمید احمد خاں نے خضر مرزا اور معظم زمانی بیگم سے لیے ہیں۔

چوتھا باب معاصر اخبارات میں اور روزنامچوں میں غالب کی یا غالب پر تحریریں اور خبریں۔

پانچواں باب غالب کی زندگی میں لکھے ہوئے ایسے اشعار جن میں غالب کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان میں قطعات تاریخ وغیرہ بھی ہیں جیسے غالب کے بہرے ہونے کی تاریخ جو صاحب عالم مارہروی نے کہی تھی یا غالب کی وفات کی غلط خبر اڑ جانے پر جو قطعات کہے گئے یا غالب کی مدح میں قصائد اور متفرق ایک ایک دو دو شعر بھی اس باب میں آئیں گے جیسے یہ دو شعر :

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی به خاطر هیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید
ظل کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے سر پر نہیں ہے سایۂ بال ہما(صہبایی) نہ ہو

(میاں داد خان سیاح)

چھٹا باب　　غالب کی کتابوں پر دیباچے اور تقاریظ اور قطعات۔

ساتواں باب　　غالب کی وفات پر قطعے اور مرثیے وغیرہ۔

آٹھواں باب　　غالب کی وفات پر مضامین۔

نواں باب　　معاصرین کے خطوط جن میں غالب کا ذکر آیا ہو یا جو غالب ہی کے نام لکھے گئے ہوں۔

دسواں باب　　متفرقات ، ایسی تحریریں جن کا تعلق ان حضرات سے ہے جنہوں نے غالب کو دیکھا ان کے دوست تھے۔ اس میں اشعار کے مطالب وغیرہ جو غالب کے حوالے سے بیان کیے گئے ہوں درج کیے جائیں گے۔

یہ بھی عرض کردوں کہ اگر کسی شخص نے غالب کے بارے میں کوئی بیان دیا ہے لیکن اس شخص کی معلومات براہ راست نہیں ہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کے توسط سے ہیں اور وہ دوسرا شخص غالب کے عہد کا ہے تو یہ بیان بھی کتاب میں شامل ہوگا مثال کے طور پر کوئی شخص یہ بیان کرتا ہے کہ غالب نے میرے دادا کو اپنے فلاں شعر کا یہ مطلب بتایا تھا۔ یہ بیان غالبیہ کے دائرے میں آتا ہے۔ یا جیسے امیر مینائی کے حوالے سے جلیل مانک پوری نے غالب کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ رام پور سے واپسی کے موقع پر ایک بھٹنی نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے امداد چاہی تھی اور غالب نے اس کی مدد کی، یہ بیان اگرچہ امیر مینائی کے قلم سے نہیں ہے مگر چونکہ انہوں نے خود اپنے شاگرد سے بیان کیا ہے اور امیر مینائی غالب کے ملاقاتیوں اور ہم عہد شخصیتوں میں سے ہیں اس لیے غالبیہ میں اسے شامل کیا جائے گا۔

رام پور۔ رضا لائبریری۔ رام پور (یو۔ پی)　　　　اکبر علی خان

مکرمی تسلیم۔

''اردو نامہ،، (شمارہ اکتیسواں) ابھی ابھی موصول ہوا ہے جس میں قارئین سے چند الفاظ کے اسناد اور ماخذ طلب کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سردست کچھ عرض ہے :

(الف) ''چرچٹا،، (کس چ ، سک ر ، کس چ ، شد ٹ) کا ماخذ دیکھنے کے لیے سب سے پہلے اس لفظ کی مختلف شکلیں ذیل میں دی جاتی ہیں ، جو کہ طب کی کتابوں میں عام طور پر ملتی ہیں۔

چڑ چڑا (کس چ ، سک ڑ ، کس چ)

چرچٹا (کس چ ، شد ٹ) ———— چٹ چٹا (کس چ)

چرچرا (کس چ) ———— چٹ چرا (کس چ)

چچرا (کس چ)

چرچیرا (کس چ ، ی مج)

اس کے پودے کو سنسکرت میں ''اپا مرگ،،(۱) (فت م سک ر) کہتے ھیں ، جو کہ حقیقت میں ''اپ مرج،، (فت اپ ، فت م، سک ر) ھے۔ جس کے معنی مذھبی پاکیزگی وغیرہ کے ھیں(۲)۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ اس کا استعمال عموماً اسی ضرورت کے تحت ھوتا تھا۔ ورنہ پودے کا اصلی نام ''چر جیرا،، (کس ر، ی مج) ھے جو اصواتی تبدیلوں سے مندرجہ بالا شکلیں اختیار کر گیا۔ سنسکرت میں ''چر،، (کس ر) کے ساتھ دیگر نباتاتی نام بھی ملتے ھیں ، مثلاً ''چرجیون،، ، دو قسم کے درختوں کا نام ھے۔ شاید اس طرح آپ اصل ماخذ کو پکڑ سکیں(۳)۔ اس پودے کے دوسرے ھندی نام اونگا اور لٹ جیرا ھیں ، مگر لٹ جیرا عموماً چھوٹی خار دار بالیوں والے پودے کی ایک قسم کو کہ دیتے ھیں۔ البتہ چرچرا نام صرف اسی افسانوی کیفیت کو ظاھر کرنے کے لیے استعمال ھوتا ھے جو کہ فاربز ڈکشنری یا فرھنگ آصفیہ میں درج ھے(۴)۔ لفظ چرچٹا (کس چ ، سک ر ، کس چ ، شد ٹ) یا اس کی دوسری مندرجہ بالا شکلیں صرف اس پودے کی بالیوں کو بطور دوا استعمال کرنے کے لیے عطار اور طبیب بولتے ھیں (اس کے پھولوں کو آپا مرگ اور پتیوں کو نیلکنتھی بھی کہتے ھیں) ورنہ پودے کا اصلی نام چرحرا (چرچرا) ھی ھے ، جس کو فارسی میں خاردارگونہ(۵) اور عربی میں انکمہ(۶) کہتے ھیں۔

البتہ چرچٹا ایک اور پودے کا نام بھی ھے ، جس کو علاقائی زبانوں میں کنگو (کونگو) ، مرال ، یا کنگیر کہتے ھیں۔ اس کی جڑ کو کنگو مذھی بولتے ھیں۔ یہ بالکل ایک علحدہ پودا ھے ، اور لفظ چرچٹا کی مختلف شکلیں جو مندرجہ بالا دی گئی ھیں ، اس پودے کے لیے مستعمل نہیں(۷)۔

(ب) جہاں تک اسناد کا تعلق ھے ، کیا آپ امیر اللغات میں مصنف کی دی ھوئی مثالیں بطور اسناد اپنی لغت میں نقل کرنا مناسب سمجھیں گے؟ اگر ایسا ھو توکم از کم الف کی نختی والے چند الفاظ کی اسناد وھاں سے دستیاب ھوجائیں گی ، جن کی نقل حسب ذیل ھے :

اب تب ھونا : حال کیا پوچھتے ھو ، وھاں تو اب تب ھورھی ھے(۸)۔

ابالا : اچھا کھانا کیسا ابالا بھی وقت پر نصیب نہ ھوتا۔(آتش اور منیر کے اشعار بھی انہی معنوں میں بطور سند دیئے ھوئے ھیں)(۹)۔

ابرو پر میل نہ آنا : لاکھ مصیبتیں پڑیں مگر ان کے ابرو پر میل نہ آیا۔(''ابرو پر میل آنا،، محاورہ جو کہ آپ نے لغت میں دکھایا ھے ، اردو میں مستعمل نہیں (۱۰)

ابرہ چڑھانا : رضائی میں استر تو مضبوط ھے ابرہ اور چڑھا دو(۸)۔

ابی دبی : ابی دبی کھیلنا(۱۱) اور نہ ابی دبی،، کوئی vocable نہیں ، بلکہ علحدہ علحدہ الفاظ ھیں ، جنہیں آپ کو لغت میں علحدہ علحدہ دکھانا چاھیے تھا(۱۲)۔

اسی شمارہ میں لفظ ''احمد،، کے دیے ہوئے تینوں معنی اردو میں مستعمل نہیں(۱۳) ، جیسا کہ مندرجہ ذیل وجوہات سے ظاہر ہوگا:

۱ - ''نام،، جو ہوگیا تو وہ قواعدی طور پر اسم کہلائے گا نہ کہ صفت(۱۴) -

۲ - اسی طرح ''خطاب،، بھی اسم کے تحت آجاتا ہے(۱۵) -

۳ - یہ رسول پاک کا ''لقب،، نہیں تھا ، بلکہ آپ کی والدہ ماجدہ نے ''احمد،، نام رکھا تھا جس کے معنی بطور صفاتی نام یعنی اسم تفضیل (آپ کے دیے ہوئے معنی نمبر ۲) کے نہیں تھے (کیونکہ عرب میں زمانہ جاہلیت میں ان معنوں میں نام نہیں رکھا جاتا تھا) ، بلکہ

(Theophoric) یعنی بطور ذات باری تعالیٰ کی حمد سے مرکب ہونے والے ناموں کی مثال ہے اس کے معنی ذاتی نام (اسم علم) کے طور پر آپ کے دیئے ہوئے معنی نمبر ۱ کے تھے(۱۶) - البتہ یہ بعد کی بات ہے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے جب پیدائش کے ساتویں دن تمام قبیلہ کو مدعو کیا تو آنحضرت کا نام اپنے خاندان کے مروجہ ناموں کو چھوڑ کر محمد رکھا - ضمناً عرض ہے کہ چونکہ آپ مقام محمود (یعنی ایسی پوزیشن جو سراپا وجہ حمد و ستائش ہو) پر فائز ہوئے اس لیے عملاً آپ اپنے نام محمد کی تعبیر تھے ، یعنی ''وہ جو مسلسل و پیہم وجہ حمد و ستائش ہو،، کیونکہ آپ پیہم حمد(۱۷) و ستائش والے کام سر انجام دیتے رہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی کے مطابق حضور کا نام احمد بتایا جاتا ہے ، مگر خدائے پاک نے آپ کو ہر جگہ محمد کے نام سے ہی مخاطب کیا ہے(۱۸) -

نوٹ: ''احمد محمود،، کے جو قانونی معنی فاربز نے اپنی ڈکشنری میں دیئے ہیں ، ان کو آپ نے نظر انداز کیوں کردیا ؟(۱۹) -

۴ - یہ جو آپ نے محترم ڈاکٹر محمد شہید اللہ صاحب کے مضمون پر صفحہ ۹۵ کے نیچے اشتباہ والا نوٹ دیا ہے ، میری سمجھ سے بالا تر ہے - آخر آپ الفاظ ''بعینہ،، اور ''شانہ،، میں کھڑی زبر اور الٹی پیش کے اصول کو مزید کسی طرح وسعت دیں گے؟ یہ علامتیں (بمعہ (۲۰) اردو کے حرکاتی الف کے ، مثلاً عربی میں اشباعی الف کی وجہ سے لفظ ''لا،، میں لام پر زبر ہے ؛ مگر اردو میں حرکاتی الف کی وجہ سے ''لا،، میں لام پر زبر نہیں ہے) بغیر حروف ''الف،، ، واو ، یا ،، زیادہ کیسے اپنا مطلب پوری طرح ادا کر رہے ہیں - آپ یا تو ''داؤد ، (واؤ پر الٹی پیش) لکھیں گے یا ''داؤد،، (پہلی واو پر سیدھی پیش)- مگر ''اردو،، (واؤ پر الٹی پیش) یا ''اردو،، (دال پر الٹی پیش) لکھ کر اس کو ''اردو (ضم و اول)،، یا ''اردو (ضم د ، و مع ، سک و)،، پڑھنے کا اشتباہ کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا حروف ''الف ، واو ، یا،، بذات خود حرکات کا کام نہیں دے رہے؟ ''اس کو کہو،، میں لفظ ''کو،، میں حرف کاف یقیناً واو سے متحرک ہے - ورنہ واو یہاں حرف صحیح تو نہیں ہے، پھر مزید کاف پر سیدھا پیش ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کھڑی زبر اور الٹی پیش (بمعہ نکہ اردو

کے حرکاتی الف سے پہلے والے حرف پر زبر) کا یہ نیا رواج یقیناً اصواتیات (Phonetics) کیا بلکہ تجصوتیات (Phonemics) کا مذاق(۲۱) اڑانا ہے۔ یا تو اردو گرامر کو عربی (فارسی) کی گرامر کا غلام بنانے میں کچھا کچھی کا یہ عالم کہ محترمہ آمنہ خاتون کی بیشتر قیمتی تجاویز کو رد کیا جارہا ہے ، یا یہ بے مروتی کہ عربی کی کھڑی زبر اور الٹی پیش کا کوئی احترام ہی نہیں (مثلاً کھڑی زبر کا صحیح استعمال ایسے الفاظ میں روا رکھا جاتا تو کیا بہتر ہوتا جیسے ''کیا،، (استفہامیہ) سے فرق کرنے کے لیے ''کیا،، (فعل) (کے کاف کے نیچے کھڑی زبر لکھی جائے ، وغیرہ) اور تو اور خود ہماری اپنی ایجاد کردہ حروف ''الف ، واو ، یا،، کی مجہول (؟) حرکاتی آوازوں کا سہرہ بھی اتار پھینکا جا رہا ہے ۔ عربی میں حروف ''الف و ی،، اشباعی ہیں ، مگر اردو میں یہ بطور حرکاتی حروف بنائے گئے ہیں ۔ اشباع کا وہ مفہوم غلط ہے جو ہمارے ہاں قواعد دان عموماً لفظ ''ناخن،، سے ''ناخون،، بناکر پیش کا اشباع دکھاتے ہیں ۔ یقیناً یہ اشباع نہیں ہے ۔ آپ جیسے عظیم ادارے سے توقع ہے کہ میری اس عرض کو قارئین تک پہنچا دیا جائے گا تاکہ مزید وضاحت ہوسکے(۲۲) ۔

۵ ۔ آپ نے اپنی لغت میں جو عام ابجد سے ہٹ کر نئی ابجدی ترتیب وضع کی ہے ، اس کے لیے آپ کے پاس کیا اصواتی دلائل ہیں؟(۲۳) مثلاً :

(الف) آپ نے ''آ،، کو ''الف بغیر مد،، (الف مقصورہ) کی تختی کے اختتام پر رکھا ہے ۔ کیا اس ''آ،، میں پہلا الف زائد محض حرکاتی نشانی لگانے یا اگلے اعرابی حرف کو جوڑنے والی صورت نہیں ہے ، جس کی اپنی کوئی قیمت نہیں ، جیسے کہ دیگر الفاظ ''اب،، اس ، ادھر ، ای ، او،، وغیرہ کے شروع میں پایا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو اس الف کے بعد حرکاتی حرف الف ہو (جس کو ہم اردو میں ''مد،، سے لکھتے ہیں) ، تو یقیناً اس ''آ،، کی ترتیب ''الف،، کے بعد ''الف،، جیسی ہوگی ۔ اس ''مد،، کو حرکاتی علامت نہیں کہا جاسکتا ، بلکہ یہ محض الف زائد کے بعد حرکاتی الف لکھنے کی ایک رسم ہے جو کہ رسم الخط میں رائج ہے ۔ مگر زائد الف کے بعد حرکاتی واو اور حرکاتی یا کی کوئی نئی رسم بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حرکاتی الف کی رسمی شکل ''مد،، صرف اس لیے مان لی گئی ہے کہ ہمارے ہاں الف کے بعد الف جوڑنے کی کوئی رسم نہیں ہے ۔ غرض کہ جس طرح زائد الف ہماری ابجد کا پہلا حرف ہے اسی طرح حرکاتی الف (بمعہ (۲۰) اس کی رسم ''مد،، کے) ابجد کا پہلا حرف ہے ، جیسا کہ عربی میں ہمزہ اور الف ہمزة القطع دونوں عربی ابجد کا پہلا حرف سمجھے جاتے ہیں ۔ مگر اشباعی الف کو ''لا،، کی شکل میں آخر پر لکھا جاتا ہے لہذا ''مد،، کو لغت میں وہی جگہ ملنی چاہیے جو ابجدی ترتیب میں الف کو میسر ہے ، جیسا کہ آپ الفاظ ''سال،، اور ''مآل،، شکلوں میں ''مد،، کو یہ درجہ دے رہے ہیں ۔

(ب) دوسری مثال مخلوط‌الہا حروف کی ہے ، ان کو (سوائے ڈھ ، لھ ، مھ ، نھ کے) کیوں علیحدہ حروف تصور کیا جائے کیا انگریزی میں ''(Mad House)،، لکھتے وقت لغتی ترتیب میں (dh) کو اکٹھا سمجھ کر علیحدہ حرف رکھا جاتا ہے؟ یہ بھی تو آخر ہمارے اردو کے ''ڈھ،، جیسا

ہی تلفظ رکھتا ہے۔ کیا ایسے (Modern Aspirates) ماڈرن مخلوط الہا اصواتی لحاظ سے اکہرے حروف ہیں؟ یقیناً نہیں! البتہ 'کھ'، 'چھ' وغیرہ بھاری مخلوط الہا (Hand Aspirates) کو مفرد حروف کہا جاسکتا ہے، مگر وہ بھی اردو میں کئی جگہ بطور مابعد الہا (Post Aspirates) بولے جاتے ہیں جب کہ ان کو ہائے ہوز سے لکھا جانا چاہیے (اور حقیقتاً(۲۴) کچھ لوگ ایسا لکھتے بھی ہیں) مگر ہم وہی دوچشمی ھ سے عموماً لکھتے ہیں۔ غرض کہ ان کے لیے بھی یہ جواز موجود نہیں کہ انہیں بھی علحدہ حروف سمجھ لیا جائے(۲۵)۔

۶۔ آپ کی خدمت میں ایک چھوٹا سا نامکمل پمفلٹ علحدہ ارسال کیا جا رہا ہے۔ امید ہے اس میں جہاں سرخ نشان لگا ہوا ہے اس کو ملاحظہ فرما کر آپ ''مادہ فعل'' کو بھی بنیادی طور پر اپنی لغت میں جگہ دینے پر غور فرمائیں گے۔

والسلام۔

**راولپنڈی۔ ۱۹ جولائی ۶۹۸ء					ایس خانم۔ مولوی فاضل**

۱۔ یہ لفظ ''اپا مرگ'' نہیں ''اپا مارگ'' ہے۔

۲۔ ''اپ مرج'' (مصدر زیادہ) ہے اور اس کے معنی ہیں دور کرنا۔ اور صاف کرنا ''اپا مارگ'' اس مادہ سے ماخوذ ہے اس کی بگڑی ہوئی شکل نہیں۔

۳۔ ''چرچیرا'' سنسکرت میں کوئی لفظ نہیں یہ بھی صوتی اعتبار سے ناممکن ہے کہ ''چرچٹا'' بگاڑ یا تضحیک ہو ''چرچیرا'' کی۔ ''ر'' نے کبھی ''ٹ'' کی شکل اختیار نہیں کی۔

۴۔ فرہنگ آصفیہ میں چرچرا نہیں، بلکہ چرچٹا (کس چ، کس چ، ف شد ٹ) درج ہے

۵۔ فارسی میں ''جار واژ گونہ'' ہے نہ کہ ''جار دار گونہ''۔

۶۔ یہ لفظ لغات میں کہیں نہیں ملا حوالہ؟

۷۔ یہ تفصیلات خزائن الادویہ جلد سوم سے ماخوذ ہیں بعض مقامات نقل کرنے میں غلطی ہوئی۔

۸۔ اسناد سے مراد شواہد نہیں۔ یعنی لفظ کا اردو ادب میں استعمال۔

۹۔ اس معنی کے علاوہ دوسرے معانی کی سندیں دریافت کی گئی ہیں جو شمارہ ۳۱ کے صفحہ ۵ پر درج ہیں۔

۱۰۔ سجاد رائے پوری میر نفیس کے شاگرد تھے انہوں نے مرثیے میں کہا ہے:

دین چھوٹے ماموں کو جو علم شہ دم مصاف		ابرو پہ میل آئے تو پھر دل نہ ہوگا صاف

۱۱۔ ''کھیلتا'' کی قید مناسب نہیں کیونکہ اس طرح بھی تو بول سکتے ہیں: آج میں ابی دبی میں ہار گیا۔

۱۲ - ''ابی دبی،، کھیل کا نام ہے جیسے اکلی دمکلی کے معنوں میں یہ مستقل لفظ ہے -

۱۳ - جب سندیں درج کردی گئی ہیں تو ''مستعمل نہیں،، کا حکم نہیں لگایا جاسکتا

۱۴ - یہ ضروری نہیں کہ نام صفت نہ ہو (یا بالعکس) - جامد ، محمود ، جمیل وغیرہ ہزاروں نام ہیں جو صفت بھی ہیں - اس نام کے صفت (بھی) ہونے کی سند معنی کے ساتھ درج ہے -

۱۵ - یہ ضروری نہیں کہ خطاب صفت نہ ہو بلکہ خطاب کا بدرجۂ اولی صفت ہونا ممکن ہے -

۱۶ - جملے سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ مضمون نگار کیا کہنا چاہتا ہے -

۱۷ - ''حمد،، خدا کی تعریف سے مختص ہے - کسی کا کام ''قابل مدح،، ہوتا ہے نہ کہ ''قابل حمد،، -

۱۸ - حضرت عیسی کی پیشین گوئی سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ ''احمد،، حضور کا لقب تھا - کیونکہ انجیل میں ''احمد،، استعمال نہیں ہوا ''فار قلیط،، بولا گیا ہے جو ''احمد،، کا ہم معنی ہے -

۱۹ - یہ معنی فاربز کی ذاتی رائے کی حیثیت رکھتے ہیں ، نہ فیلن نے قانونی ڈکشنری میں لکھے ہیں ، نہ پلیٹس نے ، نہ کچہریوں میں مستعمل ہیں ، نہ عوام اس طرح بولتے ہیں اور نہ ادب میں اس کی کوئی سند ملی ہے -

۲۰ - ''بمعہ،، غلط ہے ''مع،، ہونا چاہیے -

۲۱ - ''ذ،، سے (مذاق) درست ہے -

۲۲ - ڈاکٹر شہید اللہ کی رائے من و عن شائع کی گئی ہے - جس پر اظہار خیال کا ہر شخص کو حق حاصل ہے -

۲۳ - صوتی طور سے ''آ،، -

۲۴ - اس کی املا ''حقیقتاً،، غلط ہے اور ''حقیقۃً،، درست ہے -

۲۵ - اردو لسانیات میں - ''اردو ھائیہ،، کے عنوان سے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے ، اسے دیکھ لیں -

ادارہ

اشتقاقیات

شوکت سبزواری

مجھے جہاں تک یاد ہے اس سے پہلے بھی میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ ''اشتقاقیات،، لسانیات کا ایک شعبہ ہے اور اس کا لسانیات کے دوسرے شعبوں سے قریب قریب وہی رشتہ ہے جو عموماً سائنس کی مختلف شاخوں میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ بات بہر حال واضح ہوجانی چاہیے کہ لسانیات کی دوسری شاخوں کو نظر انداز کرنے کے بعد ہم کسی لفظ کی اصل یا اس کا ماخذ دریافت نہیں کرسکتے۔ جس طرح صوتیات لسانیات کی ایک شاخ ہے اسی طرح صوریات (Morphology) یا عام قواعد بھی لسانیات ہی کی ایک شاخ ہے اور تقابلی گرامر بھی۔ اگر ہم لسانیات کی ان شاخوں سے واقف نہ ہوں یا واقف تو ہوں لیکن انہیں نظر انداز کر کے کسی لفظ کی اصلیت کا سراغ لگائیں تو ہمیں منہ کی کھانی پڑے گی۔ لفظ کی اصلیت کا سراغ لگاتے وقت ہمیں قدم قدم پر زبان کے قواعد، اس کے مزاج کے مطابق صوتی تبدیلیوں اور ملتی جلتی زبانوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔
آئیے اس اصول کی مزید وضاحت کے لیے دو ایک مثالیں لے کر ان پر غور کریں اور دیکھیں کہ قواعد یا تقابلی گرامر کو نظر انداز کردینے سے ایک کھوج لگانے والے کو کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں اور اسے کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

''نے،، اردو کا ایک عام اور کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اردو میں فاعل کی علامت ہے اور پنجابی میں چونکہ ''نوں،، مفعول کی علامت ہے اور ''نے،، اور ''نوں،، ایک دوسرے سے صوتی طور پر مشابہ ہیں اور فاعل و مفعول میں مناسبت بھی ہے اس لیے بعض اہل علم نے قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیا کہ ''نے،، پنجابی ''نوں،، کی شکل ہے اور اس سے بگڑ کر بنا ہے۔ ان حضرات نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ اولاً ''تو ''نے،، اردو (نیز ان زبانوں میں جہاں یہ مستعمل ہے) فاعل کی علامت نہیں۔ اگر یہ فاعل کی علامت ہوتا تو فعل لازم میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا اور نکلا، دوڑا، وغیرہ افعال کے فاعل پر ''نے،، بڑھا کر ہم یوں کہتے سورج (نے) نکلا، گھوڑے (نے) دوڑا۔ ان جملوں میں ''نے،، کا استعمال زبان کے محاورے کے خلاف ہے۔ صحیح اور بامحاورہ اردو ہے۔ سورج نکلا، گھوڑا دوڑا وغیرہ۔

ثانیاً اردو قواعد کے مطابق فعل ہمیشہ تذکیر و تانیث اور افراد و جمعیت میں فاعل کے مطابق ہوتا ہے لازم اور متعدی دونوں صورتوں میں مثلاً—گھوڑا دوڑا، گھوڑی دوڑی، گھوڑے دوڑے۔ لڑکا کتاب پڑھتا ہے، لڑکی کتاب پڑھتی ہے، لڑکے کتاب پڑھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ''نے،، آجانے کے بعد ''فعل،، کا فاعل سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس صورت میں فعل مفعول کے مطابق ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

لڑکے نے کتاب پڑھی ، لڑکی نے سبق پڑھا۔

پہلی مثال میں "کتاب" مفعول ہے اور وہ مونث ہے اس لیے فاعل (لڑکا) مذکر ہونے کے باوجود فعل مونث ہے۔ دوسری مثال میں سبق مفعول ہے اور وہ مذکر ہے ، اس لیے فعل (پڑھا) مذکر لایا گیا ہے حالانکہ فاعل (لڑکی) مونث ہے۔

اگر "نے" فاعل کی علامت ہوتا تو اس کے آنے کے بعد فعل اپنے فاعل سے کبھی منقطع نہ ہوتا۔ دراصل "نے" فاعل کی علامت نہیں۔ آلہ کی علامت ہے اور انگریزی (By) کے معنوں میں ہے۔ فعل کبھی آلہ کے مطابق نہیں ہوتا۔ "نے" کے بعد فعل کا رشتہ مفعول سے جو دراصل نائب فعل (مفعول مالم یسم فاعلہ) ہے قائم ہوجاتا ہے۔ اس کی سیر حاصل تفصیل میرے مقالے "نے" کی سرگزشت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ "نے" کا ماخذ کیا ہے یہ دیکھنا ہوگا کہ اردو اور اس کی ہمسر دوسری زبانوں میں جہاں "نے" مستعمل ہے اس کی شکل کیا تھی اور ان زبانوں میں جن سے اردو وغیرہ زبانوں نے ارتقا پایا "نے" کا وجود تھا یا نہیں اور اگر تھا تو کس شکل میں تھا اور اس کے کیا معنی تھے۔ جب تک اتنی چھان بین نہ ہو "نے" کے بارے میں آسانی سے کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا۔

قریب قریب یہی حال "اپنا" کے "نا" کا ہے۔ کچھ لوگ اسے اضافت کی علامت بتاتے ہیں حالانکہ اردو میں "اپنا" کو چھوڑ کر یہ "نا" علامت اضافت کے طور پر کسی دوسری جگہ استعمال نہیں ہوا۔ اردو میں بھی "اپنا" اضافت کے علاوہ بعض دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "اپنے سے" یا "اپنے کو" وغیرہ۔ یہاں "اپنا"، "ہم" کے معنوں میں ہے۔ پھر یہ امر بھی توجہ کے قابل ہے کہ پراکرت میں ، جو اردو اور اس کی ہمسر بولیوں سے زیادہ قدیم زبان ہے یہ لفظ اتن اور اپنیہ کی شکل میں ہے۔ اگر "اپنا" پراکرت اپنیہ سے لیا گیا ہے تو یقینی طور پر اس کا "ن" اصل لفظ کا جزو ہوگا۔ بعد میں اضافہ کیا ہوا لاحقہ نہ ہوگا۔ سنسکرت میں اس کی شکل آتمن ہے۔ اس میں بھی "ن" اصل لفظ کا جزو ہے۔ محض اس بنا پر کہ اردو میں "اپنا" ضمیر اضافی بھی ہے۔ "نا" کو لاحقہ اضافت قرار دینا اصولاً صحیح نہ ہوگا۔ اس لفظ کے اردو میں تمام استعمالات دیکھے جائیں گے۔ اس کی قدیم تر شکلوں پر غور کیا جائے گا تب کہیں جاکر "اپنا" کے "نا" کے بارے میں صحیح علمی فیصلہ کیا جاسکے گا۔

ایک لطیفہ عرض کرتا چلوں۔ ایک صاحب نے "وہ دوڑے" کے دوڑے ، کو اردو کے فعل مضارع سے مشابہ پا کر لکھا ہے کہ یہ مضارع ہے۔ "نے" اگر جملے میں نہ آئے تو اس کے بعد فعل مضارع ہوگا۔ حالانکہ "دوڑے" مضارع نہیں "دوڑا" کی جمع ہے۔ اور دونوں کا ماخذ جدا جدا ہے۔

ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیئے

جی! آپ مُسکرائے بنا کیونکر رہ سکتے ہیں۔ آخر آپ تبت ٹوتھ پیسٹ اور ڈی۔5 ڈینٹل کریم استعمال کرتے ہیں
تبت ٹوتھ پیسٹ طبّی اصولوں کے مطابق بہترین اجزاء سے تیار کیا جاتا ہے۔ تبت ٹوتھ پیسٹ دانتوں کو کیڑا لگنے سے
محفوظ رکھتا ہے اور منہ کی بدبو دُور کرکے ان کو صاف اور چمکدار بناتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسوڑھوں کو مضبوط بناتا ہے۔
تبت ڈینٹل کریم میں سوڈیم۔ این۔ لورائل سارکوسائینیٹ اور ڈی۔5 شامل ہیں۔ ڈی۔5
ایسے اجزا کا کیمیائی مرکب ہے جو مُنہ کو بدبودار سانس اور دانتوں کو پائیوریا سے محفوظ رکھتا ہے۔





دانتوں اور
مسوڑھوں کی
مکمّل
حفاظت کیلئے

تبت

ٹوتھ پیسٹ
اور
ڈی۔5
ڈینٹل کریم

کوہ نور کیمیکل کمپنی لیمیٹڈ
کراچی۔ ڈھاکہ


دُرِ شہوار
آپ کے دانت سچّے
موتیوں سے بھی بیش بہا
ہیں۔ ایک ذرا سی جِلا ان کے
لئے کافی نہیں۔ ان کو تو انتہائی
احتیاط اور حفاظت کی ضرورت ہے۔
تب ہی اُن کی خوبصورتی اور مضبوطی قائم
رہے گی: ان کی خاطر آپ ہمدرد منجن
استعمال کیجئے جسے سالہا سال کے تجربوں
کے بعد مکمّل کیا گیا ہے۔ یہ دانتوں کی اچھی
طرح صفائی کر کے اُن میں موتیوں کی سی
آب پیدا کرتا ہے۔ اُن کی صحت برقرار رکھتا
ہے۔ انگلی سے ہمدرد منجن ملنے کا ایک
فائدہ یہ ہے کہ اس طرح مسوڑھوں کی مالش
اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں
کے حُسن اور طاقت کے لئے
بڑی ضروری ہے۔
ہمدرد منجن دانتوں کو
صاف اور چمکدار رکھتا
ہے ان کو مضبوط بناتا ہے
ہمدرد منجن
مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچّے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی — لاہور — ڈھاکہ — چٹاگانگ

احمقائی (فت خف ا ، سک ح ، فت م) امث (قدیم) - احمقی -

رک : **احمقی -**

نہ بھول اے اس قدر بدل کلیوں کی آشنائی پر
کہ سب اہل چمن ہنستے ہیں تری احمقائی پر

۳۳ دیوان زادہ حاتم ، ۸۰

[ع : احمق + ا : ئی (لاحقہ کیفیت)]

احمقی (فت خف ا ، سک ح ، فت م) امث - احمقائی -

عقل یا تہذیب کے خلاف حرکت ، بے وقوفی ، حماقت -

اس ملک کوں من لگن کے والی
اس باغ کوں احمقی کے مالی

۱۷۰۰ من لگن ، ۳۹

کیوں نہ ہو حاصل خرابی روز محشر کے تئیں
احمقی سے ساد دیں کے تئیں نہیں دینے جواب

۱۷۳۲ آبرو ، ق ، ۱۱

نہ اے ساقی بادۂ احمقی
تری بات میں سب ہے بے رونقی

۱۷۳۰ کلیات سراج ، ۷۷

لوگ اپنی احمقی . . . کے سبب ان باتوں سے متعجب ہونے لگے -

۱۷۷۱ تفسیر مرادیہ ، ۱۱

عقلمندوں نے کہا ہے کہ احمقی کی نشانیاں پانچ ہیں -

۱۸۷۲ ستارۂ ہند : ترجمہ (انوار سہیلی) ، ۵۵

پس اپنے کو دانا وہی جانتا ہے
کہ جو احمقی سے سراسر بھرا ہے

? تہذیب النسا ، ۳۳

طرف افراط میں سفاہت ہے اور طرف تفریط میں بلاہت یعنی احمقی ہے -

۱۹۲۵ حکمۃ الاشراق ، ۲۱۵

[ع : احمق + ف : ی (لاحقہ کیفیت)]

احناف (فت خف ا ، سک ح) امذ ، ج -

۱ - حنفی عقیدے کے مسلمان ، فقہی مسائل میں امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی تقلید کرنے والے -

بہ نسبت اور فرقوں کے احناف یعنی حنفی مذہب لوگ بکثرت ہیں -

۱۸۸۵ جامع الاحکام ، ۱ : ۲۱

اس کا سارا نامی قول احناف نکال دینا چاہیے -

۱۹۰۶ الحقوق و الفرائض ، ۱ : ۱۰۸

علمائے نجد کو بھی وہ علمائے احناف سے بہتر جانتے ہیں -

۱۹۲۶ مسئلہ حجاز ، ۱۱۳

امام نودی نے جو تعریف مقرر کی ہے اس کو فقہائے احناف کی مقرر کردہ تعریف پر بھی فوقیت حاصل ہے -

۱۹۳۳ جنایات بر جائداد ، ۲۸

۲ - (شاذ) وہ لوگ جنہوں نے قبل اسلام بت پرستی ترک کر دی تھی اور ملت ابراہیم کے پیرو تھے ، حنفا -

مہک اس نافۂ طیب کی جو تھا عبد مناف
گہر درج شرف شامل سلک احناف

۱۸۹۳ سجاد رائے پوری ، مولود نامہ ، ۳

بعض سجادہ ایسے تھے جو اخلاف کے رشد
یافتہ تھے۔
١٩٠١ ... ١٩٣

[ع : حال ... کی
جمع ...]

احوال ...
(الف) بطور جمع۔

ر ک : **احوال (ب) جس کے کل معانی میں یہ
بطور جمع مستعمل ہے۔**

رنگ ہو اس ... کے احوال
اس کے ... کے احوال
١٧٠٠ من لگن ، ١٢٣

... حال سراج ... درد کی ...
مجموعہ احوال ہے دیوان ہمارا
١٧٣٩ دیوان سراج ، ١٦٦

... اور ان کی ...
کے احوال و ... سب ...
مذکور کی مناسبت کے لیے۔
١٨٠٥ آرائش محفل (افسوس)، ٦١

... احوال سے ...
... احوال سے ...
١٨٠٩ شاہ کمال ، ...

جب ہو گئی عرض ... کے ... زوال
حضرت سے سنئے ... احوال
١٨٨٢ ...، ٩٧

طلسم ... کے نہ پوچھیے احوال
ذہن کی ... ہے ... معاذ اللہ
١٩٢١ اکبر ، ... ٣٧

مصنفین کے احوال میں اختلاف ہے۔
١٩٠٥ حکمۃ الاشراق ، ١٥

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
١٩٣٥ بال جبریل ، ٢٠٨

ایسے احوال سرمدی و منازل رفیعہ انہیں حاصل
تھیں کہ کسی کو ... رسائی نہیں ہوتی۔
١٩٣٦ سوانح خواجہ بندہ نواز ، ١٢

٢ - (فلسفہ) شرائط و عوارض۔
ہر علم میں احوال (شرائط) ، قوانین ، قوی
امتحانات ، حقائق وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔
١٩٢٩ مفتاح الفلسفہ ، ١٥
(ب) بطور واحد۔

٣ - کیفیت ، حالت ، صورت حال (جو بھی ، ہے یا ہوگی)۔

لیے وقت کس میں بی بی بندھ رہی
سمجھنے میں احوال نس بدھ رہی
١٦٥٧ گلشن عشق ، ٨٢

نہیں درکار یا بولے بات اپنی زباں سیتی
بیاں کر رنگ کے طومار سوں احوال عاشق کا
١٧٠٧ ولی ، کد ، ٢٢

ناتجا بوجھ نہ احوال خموشی مجھ سے
ہے یہ وہ بات کہ آتی نہیں تقریر کے بیچ
١٧٩٣ قائم (مختار اشعار) ، ٨٠

احوال ہوتی انہوں کا ایسا میاں جنہوں نے
اس ذات بحث سے دل بند اجل کو توڑا
١٨١٨ انشا (کلام انشا) ، ٩٣

نہیں احوال میرا کس کو معلوم
مگر مجھ سے کوئی لکھا نہیں ہے
١٨٤٥ کلیات ظفر ، ١ : ٣٥

وہ جنوں جو فرط محبت میں بہم پہنچا اس نے
اس احوال کو پہنچایا۔

۱۸۵۹ خطوط غالب ، ۴۷۲

ہر صفحہ کہ احوال تھا اس نہج دو دہ سے
جس طرح کوئی کاٹ دے سطروں کو قلم سے

۱۸۷۴ انیس ، ۲ : ۲۰۲

زخم دل و جگر کا احوال کچھ نہ پوچھو
ناسور اب وہاں ہیں کل داغ تھے جہاں پر

۱۸۷۸ سخن بے مثال ، ۳۸

نہ کبھی کی مجھے عادت نہ سننا خلق کا شکوہ
کوئی جانے تو کیا جانے کہ ہے احوال کیا میرا

۱۹۵۰ ترانۂ وحشت ، ۱۵

۴۔ ذکر (واقعے ، واقعات یا ماجرے وغیرہ کا)، بیان۔

ارادہ ہے میرا لکھوں اک کتاب
قیامت کا احوال ہندی جواب

۱۶۷۹ آخر گشت (رمضان) ، ق ، ۲

احوال سلاطین ہنود کا . . . گورنر جنرل سر جارج . . . کی ابتدائے ریاست میں . . . تمام ہوا۔

۱۸۰۵ آرائش محفل (افسوس)، ۴

تقویم میں احوال اس روز کا دیکھنے سے معاملات کواکب ملیں گے۔

۱۸۳۷ ستۂ شمسیہ ، ۲ : ۳۳

احوال تاریخ کا سنتے ہیں تو کم سن کو عجائبات کے باعث افسانے کا مزہ ملتا ہے۔

۱۸۳۸ تاریخ ممالک چین، ۱ : ۳

احوال دور دور کا دیکھا کتاب میں
ہر صفحہ ہم کو آئنۂ دوربیں ہوا

۱۸۷۰ دیوان اسیر ، ۳ : ۲۶۳

آپ سنتے ہی نہیں ہائے مرا افسانہ
ہو طلسموں میں یہ احوال عجب اچھا ہے

۱۸۷۶ گلزار داغ ، ۲۶۵

۵۔ کسی پر گزرے ہوئے (کل یا جزو) واقعات یا واقعے کی تفصیل ، ماجرا ، سرگزشت ، (مجازاً) سوانح حیات۔

کہیا کھول احوال وصل و فراق
ہور آ کہیا وو سب باب کا اشتیاق

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۱۰۷

طاقت نہیں کسی کوں کہ یک حرف سن سکے
احوال گر کہوں میں دل بے قرار کا

۱۷۰۷ ولی ، ک ، ۱۷

گدا زادے نے سن یہ حرف مجرم
کہا احوال آنکھیں کرکے پرنم

۱۷۷۴ تصویر جاناں (مثنوی) ، ۶۳

دل میں سوچا کہ فی الواقع اگر اظہار اس احوال کو نہ کروں گا ، ممکن نہیں کہ مقصد کو پہنچوں۔

۱۷۹۲ عجائب القصص (شاہ عالم) ، ۶۶

ان کی خدمت میں چل کر احوال اپنا کہہ۔

۱۸۰۲ باغ و بہار ، ۲۰

لاچار ہو سارا احوال بیان کیا۔

۱۸۴۵ نغمۂ عندلیب ، ۱۹

موریس کے گذشتہ احوال سے تو آگاہ ہوگئے ہوں گے

۱۸۹۸ روزا لیمبرٹ ، ۱۳۱

بعض کتب احوال سری کرشن میں بہت اچھی شائع ہوئی ہیں۔

۱۹۱۷ برہمن بیبی (حسن نظامی)، ۲۲

اگر کسی شخص کی ... نہ ... غیر ...
... نہیں اس کا علم صرف اس
کے احوال کا ... ہو سکتا ہے۔

۱۹۳۲ ... ۱۳۰

۹ ۔ حقیقت امر ، اصلیت (معاملے یا سیر وغیرہ کی)۔

... احوال ... ائے
... اٹھے

۱۹۰۹ مظفر ... ۱۱۰

... احوال ہوں
نہ ... ہے ... کے ... ہوں

۱۸۰۸ ... ۱۰۲

احوال ... لا ...
معلوم ہوا ... تھا ...

۱۸۹۳ ... (خواجہ سید محمد میر) ...

جناب خاتون ... نے عرض کی کہ بابا جان
یہ احوال خدا اور رسول پر روشن اور ظاہر ہیں۔

۱۸۱۲ گل مغفرت ، ۱۲

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

۱۸۶۹ غالب ، د ، ۱۲۳

نہ پوچھو مرے والے دل کا احوال
خدا بخشے ... دیوانہ ... تھا

۱۹۲۷ ... (مخانۂ الہام) ، ۸۷

۷ ۔ خبر خیر ، خبر ، اطلاع ۔

بہار آئی خدا جانے کہ ... گزری اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کے برس احوال زنداں کا

۱۸۲۵ مصحفی: انتخاب رام پور ، ۲

احوال کس سے پوچھیے یاران رفتہ کا
وہ بھی نہ پھر کے آئے جو لینے خبر گئے

۱۸۳۲ دیوان رند ، ۱ : ۱۳۰

بادشہ سنتے ہی اس احوال کو
آپ آیا سر کے استقبال کو

۱۸۶۱ ... (نواب مرزا) ، خنجر عشق ، ۱۴

۸ ۔ خیریت ، خبر و عافیت ، حال چال ۔

اس وقت لازم ہے کہ اپنے یار کا احوال پوچھو
اور خدمتی و غم‌خوری کی باتیں آپس ... کہو ۔

۱۸۰۰ قصہ گل و ہرمز ، ۳۳۶ ب

۹ ۔ (تصوف) روحانی انبساط ، وجد اور سرمستی و سرشاری کی کیفیت جو حسن عمل کے اجر میں یا بطور الطاف خفی خداوند عالم کی طرف سے انسان پر وارد ہو۔

حقیقت ہے احوال ان ... مدام
دیکھو معرفت سب کیوانا ہے تمام

۱۸۰۵ معظم بیجاپوری (گنج مخفی) از قدیم اردو ، ۱ : ۲۶۱

احوال مجسم ہیں ... سحر ہے قرب ان کا
بس ڈھونڈیے ... جیسے رعنائی

۱۹۳۷ سہا ۔ ق ، ۱

[ع : ر ... : حال جس کی یہ جمع ہے]

——— پرسی (ضم پ ، سک ر) امث ۔

خیر و عافیت اور تکلیف و راحت سے متعلق حالات کی دریافت ۔

غریبوں اور عاجزوں کو دیکھیں اور ان کی احوال پرسی میں مشغول رہیں ۔

۱۸۰۲ گنج خوبی ، ۷۳

ہر چند جب ہوں لیک مرا حال ہے عجب
احوال پرسی تو نہ کرے تو عجب ہے اور

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۴۲۴

غیر سے احوال پرسی یار کرتا ہے مری
گوش گل بلبل کی سنتا ہے زبان خار سے

۱۸۴۶ آتش ، ک ، ۱۵۶

[ع : احوال + ف : پرسی (پرسیدن = پوچھنا) اسم کیفیت بر سبی]

ـــــ**گیر** (ی مع) صف ۔

دکھ درد خصوصاً بیماری میں خبر خبر لینے والا ، تیماردار ۔

بیمار عشق ہے دس جیتا رہے گا کیونکر
احوال گیر کم ہو پہنچے بہم دوا نہ

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۲۱۸

[ع : احوال + ف : گیر (گرفتن = لینا سے فعل امر) ، اسم فاعل ترکیبی]

ـــــ**نامہ** (فت م) امذ ۔

(فوج) وہ رجسٹر جس میں کسی سپاھی یا ملازم کی خاص خاص کار گزاری روز ملازمت سے آج تک درج ہو ، سروس بک (انگریزی اردو فوجی فرہنگ ، ۷۰)

[ع : احوال + ف : نامہ (فک اضافت بہ اضافت مقلوب)]

احوط (فت خف ا ، سک ح ، فت و) صف ۔

۱ ۔ دو یا زیادہ باتوں میں جو احتیاط سے قریب تر ہو ، جس میں غلطی سے بچنے کا زیادہ امکان ہو ، زیادہ موزوں یا مناسب ۔

حاصل ان سب تحقیقات کا یہ ہے کہ مذھب حنفیوں کا اس باب میں بہت احوط ہے ۔

۱۸۶۷ نور الہدایہ ، ۱ : ۵۰

مگر طریق احوط یہ ہے کہ آپ کے خطوط بھی بیرنگ روانہ ہوا کریں ۔

۱۸۶۹ خطوط غالب ، ۶۳۵

بلکہ احوط ہے ان سے اجتناب کیا جائے ۔

۱۹۲۳ اودھ پنچ ، ۹ ، ۲۲ : ۱۰

۲ ۔ (فقہ) رک : احتیاط (فقہ) جس کی یہ صفت ہے ۔

اگر عورت اجتناب کرے احوط ہے ۔

۱۸۴۵ خلاصۃ الاعمال ، ۱۰۵

احوط یہ ہے کہ پہلے وضو کرلیوے پھر تیمم کرے ۔

۱۸۶۷ نور الہدایہ ، ۱ : ۶۶

وضو کرے پھر تیمم کرے جب نہ غالب ہو اس کی رائے پر کذب اور یہ احوط ہے ۔

۱۸۴۳ کتاب معدن الجواہر ، ۳۱

آٹھ قول آئے ہیں اس میں باسند
ان میں احوط ہے یہی اے معتمد

۱۸۹۱ کنز الآخرہ ، ۱۳۴

[ع : اسم تفضیل (ح و ط) بر وزن افعل]

احول (فت خف ا ، سک ح ، فت و) صف ۔

۱ ۔ وہ شخص جس کی ایک پتلی ایک طرف پھری ہوئی ہو جس کے سبب ایک کے دو نظر آئیں ، کج نظر ، بھینگا ۔

خدا کی ذات میں ہور اس کو کج جدائی نیں
جدا خدا تھے جن اس دیکھیا سو ہے احول

۱۶۷۸ غواصی ، ک ، ۶۴

ایک ہیں احمد و حیدر داؤد
بے شک احول ہے جنے دو دیکھے

۱۷۵۴ داؤد اورنگ آبادی ، د ، ۸۶

اس کے خیال میں کوئی دیکھے جو اپنے آپ کو
احولوں کی طرح اسے ، آوے نظر تمام دو

۱۷۸۰ سودا ، ک ، ۱ : ۲۲۵

خلقت حق میں غیر یک مخلوق
نہیں مخلوق دیگر اے احول

۱۸۰۹ شاہ کمال ، د ، ۱۰۱

احول میں ایک جسم تو دو دیکھے ہیں وہ
قائل ہو اس کے دین کی سچائی کے ہم ہیں
۱۸۵۷ دیوان اسیر ، ۳ : ۲۵۷

چند امراض ایسے ہیں جن سے آدمی احول
ہوجاتا ہے۔
۱۸۸۲ رسالہ علم طب ، ۱ : ۳۱

دیوں بندہ تیوں میں بندہ ہوں تیا
تھا احولوں کے واسطے دھوکہ حجاب کا
۱۸۹۶ دیوان شہیر ، ۱ : ۶۰

یک احول اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر آیا
۱۹۰۵ لطائف عجیبہ ، ۲ : ۲۱

۲۔(مجازاً) ایک کو دو دیکھنے والی آنکھ
یا نگاہ۔

واہ وہ شے اک رس سوں سے دیسہ ابل
خوبی دیکھیں گل دیکھے تو ہو احول
۱۸۱۰ میر ، ۱۲ : ۹۱ - ۱

دیکھے جو دوئی سے جلوے وہ چشم ہے احول
دمڑی بھی ہے کی
وحدت کو ترے قد سے نظر آتا ہے ساماں
ہے سرو بھی حیران
۱۸۶۱ کلیات اختر ، ۹۱۵

ہوسکتا ہے نہیں محبوب خدا غیر خدا
اک ذرا دیکھو سمجھو تو مری چشم احول
۱۹۰۵ محسن ، ک ، ۱۱۷

سوں کی احول آنکھوں میں نہیں روشن سو چراغ
غور سے دیکھا تو ہر داغ تمنا تخم نہ تھا
۱۹۲۶ فغان آرزو ، ۲

[ع : صفت مشبہ (ح و ل) بر وزن افعل]

—— چشم (فت ح ، سک ش) صف۔
جس کی آنکھ سیدھا نہ دیکھ سکے ، بھینگا۔

سیج کہن ۔ ۔ ۔ احول چشم ، دبلے پتلے ،
سچی آدمی نہیں۔
۱۹۱۰ سجاد حسین ، کایا پلٹ ، ۵۳

[ع : احول + ف : چشم (رک) ، اسم فاعل
ترکیبی]

احولی (فت خف ا ، سک ح ، فت و) امث۔
بھینگا پن۔

کے موجد بوجھ یوں وحدت یوں
احولی سوں صاف دھر تکہ دید کوں
۱۷۵۴ ریاض غوثیہ ، ۵۷

[ع : احول (رک) + ف : ی (لاحقہ کیفیت)]

احیا (فت خف ا ، سک ح) امذ ، ج۔
۱۔ **بقید حیات لوگ۔**

بتاؤ اتے ابھے احیا کتیں
نہیں کنیں کرو اس میں سوتی کنیں
۱۷۷۱ ہشت بہشت ، ۵ : ۸۰

احیا ہوئے موتی تری شیریں سخنی سے
سودا دم عیسی ہے تری نالے قلم میں
۱۷۸۰ سودا ، ک ، ۱۱۳

موتی کو بھی کرے کرے احیا پیام لب
عیسی سخن کو سن کے کرے ہو غلام لب
۱۷۹۸ میر سوز ، د ، ۹۲

موجب فخر و مباہات احیا دنیا میں ، اور
سبب رفعت درجات موتی عقبی میں ہوگا۔
۱۸۵۱ عجائب القصص : ترجمہ ، ۲ : ۲۸

تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو
احبا سے مرسوم و معمول ہیں۔
۱۸۶۳ خطوط غالب ، ۸۳

۲ - قبیلے ، خانوادے۔

وہ بھاگ کر بعض احیائے عرب میں چلا گیا۔

۱۸۰۳ مطالع الدھور ، ۷۸

(ع : اَحیاء ، حی (ح ی ی) کی جمع بر وزن اَفعال)

اِحیا (کس خف ا ، سک ح) امذ۔

۱ - مرے ہوئے جسم میں ازسر نو روح پھونکنے کا عمل ، زندہ کرنے یا جلانے کا کام۔

عالم دوں عین حق لیے تو گویا حق تعالی الوہیت کے صفات ۔ ۔ ۔ احیا ہور اماتت سے انکار کیا۔

۱۷۴۲ انتباہ الطالبین ، ۷۹

کرے تقریر سے احیائے اموات
ہمارا یار وہ معجز بیاں ہے

۱۸۳۶ سہر (آغا علی) ، د ، ۲۸۸

جو تیرے لب نہ ہلنے اور کے احیا سے کیا ہوتا
ترا مقتول زندہ حضرت عیسی سے کیا ہوتا

۱۸۷۵ تمہید ، د ، ۵۰

نہیں تعلیم بے علموں کی کم احیائے موتیٰ سے
جہاں تک تجھ میں دم باقی ہے مردوں کو جلاتا رہ

۱۹۰۵ کلیات نظم حالی ، ۲ : ۶۴

۲ - کسی خیال ، عقیدے ، جذبے وغیرہ کو نئے سرے سے ابھارنے کی تحریک ، تازہ قوت بخشنے یا ازسر نو رواج دینے کا کام۔

احیائے مراسم ملت ابراہیمی میں شرط التفات اور حسن اہتمام بجا لاوے۔

۱۸۵۱ عجائب القصص : ترجمہ ، ۲ : ۳۳

ہے جس کی اذاں صبح گاہی
احیائے نو بعثت الہی

۱۸۸۳ کلیات نعت محسن ، ۱۴۰

جانشین ابراہیم ۔ ۔ کا سب سے مقدم فرض توحید خالص کا احیا اور حرم کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا۔

۱۹۱۱ سیرۃ النبی ، ۱ : ۳۶۶

ہے ساقیا معشر اسلام اب اک قالب بے جاں
ابھی عزم جہاں پیما کا پھر سلسلہ میں احیا کر

۱۹۳۷ نغمۂ فردوس ، ۱ : ۶۳

کانگرس کے بعض گوشوں میں فرقہ پرستی ۔ ۔ ۔ اور احیائے ماضی کے جراثیم متحرک ہورہے ہیں۔

۱۹۴۹ آثار ابوالکلام ، ۱۷۶

۳ - دبے ہوئے احساس یا جذبے میں جان ڈالنے اور اسے ابھارنے کا عمل۔

جی اٹھا دشنام سے حرکت جو اس لب کو ہوئی
قم بادبی میں کہاں ہے قوت احیائے دل

۱۸۸۲ ریاض صابر ، ۱۳۵

سمجھتا ہے تباہی تو جسے اسلام والوں کی
وہ دراصل اک نیا انداز ہے احیائے ملت کا

۱۹۳۱ بہارستان ، ۶۳۶

۴ - زندہ و برقرار رکھنے کا عمل۔

ترکوں نے ان کو بغرض احیائے امن و امان روکا۔

۱۸۹۹ بست سالہ عہد حکومت ، ۳۱۰

معارف کے ساتھ مباحث کا احیا و استیعاب مقصود تھا۔

۱۹۵۶ مناظر احسن ، عبقات : ترجمہ ، ۳۲۲

ف: کرنا ، ہونا ۔
[ع : احیا ، مصدر (ح ی ی) بروزن افعال]

--- شعبہ میں شبا (صف نفی) امد ۔
رات کو عبادت کی غرض سے جاگنے کا عمل ، شب بیداری ، رات بھر کی عبادت گزاری ۔
وقف ہیں بہر سلی قرآن میں مصحف حجاز
محو ہوں احیائے شب میں عابد شب زندہ دار
۱۹۳۳ نظم طبا طبائی ، ۲۵
[ع : احیا + ف : ے (اضافت) ، شب (مع امب اضافی)]

اِحْیاز (فت ا ، سک ح) امد ، ج ۔
(ف: حیز (فت ح ، سک ی) ، جس کی یہ جمع ہے ۔
پہلی بیں سے لازم آتا ہے کہ ہر ایک جسم جمع احیاز میں ہو ۔
۱۹۲۵ حکمۃ الاشراق ، ۹۲
کرۂ عالم جس حیز میں واقع ہے وہ لامتناہی احیاز کا ایک نقطہ ہے ۔
۱۹۵۹ تفسیر نبوی ، ۲۶
[ع : حیز (ح و ز) کی جمع جو اردو میں مستعمل ہے (عربی میں نادرست)]

اِحْیان (فت ا ، سک ح) امد ، ج ۔
اوقات ، ساعات ۔
علاوہ موفور احسان مختلفہ میں حکام کی طرف سے وقوع میں آیا ۔
۱۸۴۹ تذکرۂ اہل دہلی ، ۷
احیان مسعود آگئے اعیان موجود آگئے
راحت کے دن زود آگئے تازہ ہوا عہد کہن
۱۸۷۶ سہید (گلدستۂ سہید) ، ۱۰

[ع : حین (ی م) (= وقت) کی جمع بروزن افعال]

اَحْیاناً (فت ا ، سک ح) مف ۔
۱ ۔ اتفاقاً ، اتفاق سے ۔
اگر احیاناً خلاف تیری مرضی کا ہوا تو تیرے سامنے آکر پشیمان اسے لیے تر ہوئے ۔
۱۷۷۲ انباء الطالبین ، ۵۳
اگر احیاناً خط بگڑا جاوے تو موجب فتنہ و فساد نہ ہو ۔
۱۸۰۱ گلستان ہندی ، ۵۷
ان میں لطافت و نزاکت بیشتر ہے خصوصاً پیڑے میں تو ایسی کہ احیاناً جو ہاتھ سے چھٹ پڑے تو ٹکڑے ہوجائے ۔
۱۸۰۵ آرائش محفل ، افسوس ، ۲۰
پس اگر احیاناً بمقتضائے بشریت سہو یا خطا یا ناسر بوطی عبارت کی پائی جاوے تو اصلاح دیں ۔
۱۸۲۳ سیر عشرت ، ۴
احیاناً ہم نے بھی سامنے سمجھ کر آدھ آنے کی اسامی لگا دیا ۔
۱۸۵۴ نادرات غالب ، ۲ : ۶۵
احیاناً اگر کوئی شک آئے گا تو پیر لکھوڑ نہ سکے گا کہ شرعاً گناہ ہے ۔
۱۸۶۲ شبستان سرور ، ۳ : ۔
اگر احیاناً و سہواً کوئی خطا صادر ہوئی ہو تو معاف فرمائی جاوے ۔
۱۸۸۱ انشائے داغ ،
اگر احیاناً مجھے اپنے بنی نوع یا خاص اپنی ذات کی عزت کا لحاظ کبھی نہیں رہا تو میں بہت ہی پشیمان ہوا ۔
۱۹۳۰ اودھ پنچ ، ۱۵ : ۳۰۶

۲ ـ (i) کبھی، گاہے ۔

گر احیاناً اس کے جلس بال و پر
سو گل گیر لے شمع کا کاٹ سر

۱۷۸۶ میر حسن، ۲۰۳

اگر احیاناً ایسا اتفاق ہو جاوے . . . نہ وہ دھیٹکا مانع ہووے۔

۱۸۲۷ سنہٗ شمسیہ، ۱ : ۹۷

اٹھانا ہاتھوں کا اکثر با تکوش اور احیاناً با بدوتر ہوتا تھا۔

۱۸۵۱ عجائب القصص، ترجمہ، ۲ : ۳۹۶

نگہ کرم سے دیکھیے وہ اگر احیاناً
موم کی طرح سے ہو نرم دل روئیں تن

۱۸۰۳ مظہر عشق، ۶

احیاناً برسبیل فرمائش ایک اچاری اناس کے مربے کی . . . یا حلوا سوہن خاصگی بھیج دیا گیا۔

۱۹۰۰ شریف زادہ، ۳۱

اگر احیاناً اس کے ترجمے میں . . . کچھ بھی جوہر طبع کی جاتی حسن قصہ ہر گز باقی نہ رہتا۔

۱۹۳۷ فرحت، مضامین، ۳ : ۲۰۷

(ii) کبھی کبھی، گاہے ماہے ۔

اکثر سماع قرآن سے اور احیاناً نماز شب میں روتے تھے۔

۱۰۶ نورالہدایہ، ۲ : ۱۳۷

. . . ایک جوڑے کپڑے . . . اکثر کلوار . . . اور احیاناً بنیے کی دوکان پر بطور امانت رہتے ہیں۔

۱۹۰ شریف زادہ، ۱۵۲

[ع : احیان + اً (علامت مفعول فیہ یا ظرفیت)]

اَخ (۱) (فت ا، سک خ، نیز گاہے بصورت اضافت شد خ) امذ۔

۱ ـ باپ ماں چچا ماموں یا خالہ کا بیٹا، بھائی ۔

اے سرِ خدا اخ رسول الثقلین
والے فاتح جنگ احد و بدر و حنین

۱۸۰۱ جوشش، د، ۲۲۷

غم خوانہ کیوں نہ سبخ جی کی اونگھتی رہے
جوں اخ موت نوم ہے یہ اخت نوم ہے

۱۸۱۸ انشا، ک، ۱۵۲

اور اگر مذکر ٹھہرائیں اخ لاب ہو۔

۱۸۲۷ علم الفرائض، ۶۵

۲ ـ ساتھی، دوست، عزیز، ہر شخص بطور کلمۂ تخاطب ۔

حق کے نزدیک رہو ہی اے اخ
معرفت کا مقام ہے اسمخ

۱۸۰۹ شاہ کمال، د، ۱۵

۳ ـ (مجازاً) اوصاف یا شکل و صورت وغیرہ میں ملتا جلتا۔

اپنی نیند سے جو اخ الموت بھی اٹھتے تھے۔

۱۸۶۹ قصہ اصحاب الکہف والرقیم، ۱۰

[ع : اخ (= بھائی)، اصلاً اخو بر وزن فعل]

احیاناً کسی عرب سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا تو بھلے ہی جملے میں سٹی بھول جاتی ہے۔

۱۸۹۳ لیکچر (نذیر)، ۱ : ۳۰۳

اَخ (۲) (فت ا) فجائیہ ۔ آخ ۔

(الف) حکایت الصوت ۔ مث ۔

۱۔ گلا صاف کرنے یا کھنکارنے کی آواز
(امیر اللغات ، ۲ : ۹۱)

(ب) اسم مذ۔

۲۔ نفرت ظاہر کرنے کا کلمہ ، مترادف : تف ، تھو ، لعنت وغیرہ (" ہے " کے ساتھ مستعمل)۔

دم ہے مری اس عقلی پر اور اخ ہے
نا معقولیت پر۔

۱۸۹۲   حیرت‌ساز کی سوانح عمری ، ۹۹

نفرت ہے ہماری اس حمیت پر اور اخ ہے
ہماری اس مسلمانی پر۔

۱۹۲۸   حسرت دہلوی ، نصاب نشہ ، ۳۹

(ج) اسا۔

۳۔(مجازاً) کف ، پھوک۔

اپنی صورت کا نظارہ ہو دریا کی سبیل
اخ حباب بحر احمر مانک موج رود نیل

۱۸۸۹   لیل و نہار ، ۳۶

[ا : حکایت صوت]

——تھو (و مع) فجائیہ ۔ آخ تھو۔

(الف) حکایت الصوت (مذ)۔

۱۔ کھنکارنے اور تھوکنے کی آواز (امیر اللغات ، ۲ : ۹۱)

(ب) اسم ، مف۔

۲۔ کھانے پینے کی چیز سے اظہار کراہت یا نفرت کے مقام پر۔

اخ تھو ، دودھ میں مکھی نکل آئی۔

۱۸۹۳   امیر اللغات ، ۲ : ۹۱

لوگ لڈو لیتے اور منہ میں رکھتے اخ تھو اخ تھو کرنے لگتے۔

۱۹۲۵   اودھ پنچ ، ۱۰ ، ۱۳ : ۵

۳۔ لعنت و ملامت یا نفرین کے موقع پر۔

گول پگڑی نیلی لنگی مونچھ منڈی تکہ ریش
پھر وہ رومال اور اخ تھو ناس دانی آپ کی

۱۸۸۱   انشا ، کلیات ، ۱۴۶

دو چار ہمیں باتیں کرکے بس رو
نہ سٹھوں کی صاف بند نہ اخ تھو

۱۸۱۸   نیرنگ خیال (مثنوی) ، ۱۶۱

محبوب کی بھول کر نہ ڈالو خو
جھوٹ دنیا کی بات ہے اخ تھو

۱۹۱۱   کلیات اسماعیل ، ۶۴

۴۔ حریف کو چھیڑنے یا ابھارنے کے موقع پر
(امیر اللغات ، ۲ : ۹۱)
[ا : اخ + تھو (تھوکنے کی آواز]

——تھو کرنا محاورہ۔

کراہت یا نفرین کرنا۔

منہ ہے سنداس کی طرح بدبو
لوگ کرتے ہیں دیکھ کے اخ تھو

۱۸۰۱   گلشن ہند ، لطف ، ۳۶

ہم تو ان پر اور ان کی صورت پر اخ تھو کرتے ہیں

۱۸۹۳   امیر اللغات ، ۲ : ۹۱

——تھو کھٹے ہوتے ہیں کہاوت۔

کسی چیز کے ملنے سے مایوس ہوکر بات بنانے یا خجالت مٹانے کے لیے اس میں عیب نکالنے کے موقع پر مستعمل۔

اخ تھو کھٹے ہوتے ہیں کہ کر اٹھا محفل سے شیخ
جب نہ صہبائے ولا کا اس کو اک قطرہ ملا

۱۸۹۴   سجاد رائے پوری (مجموعہ سلام) ، ۳

ـــــ تھو ہونا محاورہ۔

تھڑی تھڑی ہونا ، ملامت اور نفرین ہونا۔

برے کام کا یہی نتیجہ ہے کہ چار طرف سے اخ تھو ہو رہی ہے۔

۱۸۹۳ امیر اللغات ، ۲ : ۹

اَخا (فت ا) امذ۔

ر ک : ''اخ'' جس کی یہ (بصورت اضافت) **نصبی حالت ہے۔**

پاس جا کے پوچھا یا اخا العرب تمہارے پیچھے کیا ہے۔

۱۹۰۰ نام عرب ، ۲ : ۵۸

[ع : ''اخو'' کا ''و'' مبدل بہ الف (علامت نصب)]

اَخّا (فت ا ، شد خ) فجائیہ۔

ر ک : **اخاہ جس کی یہ تخفیف ہے۔**

اَخّاذ (فت ا ، شد خ) صف۔

اخذ کرنے والا ، لینے والا (مفہوم یا نکات کو)، تیز و طباع۔

طبیعت تھی اخاذ ، حرفوں کا پہچاننا تھا کہ چند روز میں اٹکل سے سوالات کا طریقۂ حل سمجھنے لگا۔

۱۸۸۸ ابن الوقت ، ۷

مستعد و اخاذ دماغ نے . . فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا۔

۱۹۱۰ معرکۂ مذہب و سائنس ، ۱۰۷

ابواب یا سبق کے مطالعے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ عورت کا دماغ کس درجہ اخاذ و خلاق واقع ہوا ہے۔

۱۹۰۶ گہوارۂ تمدن ، ۲۳۱

[ع : صیغۂ مبالغہ (ا خ ذ) بر وزن فعال ـ لینے والا]

اَخّاہ (فت ا ، شد خ) فجائیہ۔

کسی غیر متوقع امر پر حیرت و مسرت کے اظہار کے لیے مستعمل۔

کہنے لگا وہ مجھ سے کہ سودا ہزار حیف
اخاہ میں نے تجھ کو نہ سمجھا تھا یاں تلک

۱۷۸۰ سودا ، ۱ : ۲۴۸

اخاہ یہ خم و جم ، یہ دعوی ، واہ بی واہ۔

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد ، ۱ : ۱۰۲

اخاہ اب تم ایسا کانا جانتی ہو کہ ان کانوں کو . . . بے سرا بتاتی ہو۔

۱۸۹۰ طلسم ہوشربا ، ۳ : ۲۰۶

اخاہ آج تو بڑے ٹھاٹھ ہیں زعفران۔

۱۹۲۲ انار کلی ، ۱۱۳

اخاہ بھئی خوب . . . بہت ملے۔

۱۹۵۴ محل سرا ، ۵

اَخْبار (فت ا ، سک خ) امذ ، نیز امث۔
(الف) جمع۔

۱ - **خبریں ، واقعات۔**

تصریح کرنے حکایتوں اخبار حضرت امام حسین علیہ السلام کی میں ، مائل و راغب رہتا تھا۔

۱۷۳۲ کربل کتھا ، ۳۶

یہ قصہ عجیب و غریب اس قابل ہے کہ مثل وقائع اور اخبار کے لکھا جائے۔

۱۸۳۲ الف لیلہ (عبد الکریم)، ۱ : ۳۰

منکشف ہے جو ... احوال خرابات مغاں
میرے آگے ... میخانے کے اخبار ...
۱۸۴۶ آتش ... ۶۸

... دربار ... ہے ... نے
... اخبار امام ...
۱۸۰۷ ... ۱۶ : ۱۷۸

... کے اخبار و آثار ہی سے معلوم
ہوتے ہیں -
۱۸۹۷ البرامکہ ، ۳۴

۲ - (ک) احادیث -

مومنین کے لیے ایک لحظہ ہے اور زیادہ سے
زیادہ ... ہزار برس ، جیسا کہ اخبار سے مفہوم
ہے -
۱۸۶۵ مذاق العارفین ، ۴ : ۲۱۳

یہی قول ابی حنیفہ کا ہے اور اس میں بہت
سی اخبار آئی ہیں -
۱۸۷۳ مطلع العجائب ، ۳۰

اخبار و کلام خدا سے ثابت و متیقن ہو چکا
کہ مرنا ایک روز لابد ہے -
۱۹۱۷ گلستان باخبر ، ۳ : ۲۲۲

بعض اخبار میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے -
۱۹۰۹ تفسیر ... ، ۱۵۰

۳ - روایات ، قصص -

یہ سب اخبار یہود ہیں -
۱۸۴۵ احوال الانبیا ، ۱ : ۳۵۵

کبھی میں حل معما و نعز میں ذی ہوش
کبھی اخبار و تواریخ میں صاحب خبرت
۱۸۵۴ ذوق ، د ، ۳۱۲

ان کے آثار و اخبار کو ملیا میٹ کر دیا -
۱۹۰۳ مقدمہ ابن خلدون : ترجمہ ، ۲ : ۴

(ب) واحد -

۴ - روایت ، بیان (کسی مصنف یا مورخ وغیرہ
کا) ، داستان -

پر اس احوال کو راوی نے یوں اخبار میں لکھا
کہ جب تک پہنچے ہی پہنچے سرور ... زہرا
۱۷۸۰ ودا ، ۲ : ۱۵

زاغ نے کہا ... اخبار میں آیا ہے کہ
ایک شخص دوست رکھتا تھا -
۱۸۳۱ بستان حکمت ، ۲۰

تاریخ و اخبار اس قول کی بنا سوائے ... اور
حسد کے دوسری نہیں پائی جاتی -
۱۹۲۰ رسائل عماد الملک ، ۲

۵ - پرچہ نویس مخبر یا جاسوس ، پرچہ
یا روز نامچہ جو ڈاکخانے کے نظام سے پہلے
خبر رسانی کا ذریعہ تھا -

ایسے احوال کی اخبار کہ جس سے بادشاہ کو ...
حرکتوں پر آگاہی ہو ... جس میں معمول ...
۱۸۳۸ تاریخ ممالک چین ، ۱ : ۹۳

بیکسی میں تو نہ تھے کاتب اعمال بھی ساتھ
کس نے اخبار لکھا عالم تنہائی ؟
۱۸۵۲ دیوان منیر (تنویر الاسعار) ، ...

داخل حلقۂ بیعت ہوئے جس ہزار
حاکم شام کو مخبر نے لکھا یہ اخبار
۱۸۵۵ ...

کہنے لگا سب سمر کہ ...
اخبار میں یہ ماجرا ہر ...
۱۸۷۳ ...

اخبار نکل کو گزر جکا ...
۱۹۰۲ طلسم نوخیز جمشیدی ...

۲ - **خبروں کی اشاعت کے لیے چھاپ کر تقسیم کیا جانے والا پرچہ ، عموماً روزانہ یا مقررہ وقفے سے شائع ہونے والا ورق یا اوراق کا مجموعہ جو خبروں نیز دیگر مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔**

پنچی سری رسوائی کی ڈونکر خبر اس کو
اس شوخ نے تو دیکھنا اخبار بھی چھوڑا

۱۸۴۹ کلیات ظفر ، ۱ : ۲۰۶

انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں اور دیسی اخبار بھی ان کا تتبع کرتے ہیں۔

۱۸۸ فسانۂ آزاد ، ۱ : ۳۶۲

انگریزی اردو اخباروں میں اس پر اعتراض ہوئے۔

۱۹۰۰ الحقوق و الفرائض ، ۲ : ۱۵۰

صبح کے اخباروں میں عجیب و غریب عنوانوں سے . . . مضمون نکلے۔

۱۹ افسانچے ، ۱۹۳

۶ - **وقوعے کی اطلاع ، خبر۔**

مچا شور کوئی تار . . . یوں اٹھے یہ اخبار۔

۱۸۰ نو سرہار ، ۱۵ ب

... دار گھڑی نشست ہوتی ہر شہر و دیار ... اخبار بیان کر اٹھ جاتا۔

فسانۂ عجائب ، ۱۹۰

... جب یہ اخبار فرحت اثر
... رات بھر انتظار سحر

صبدیہ (صبا) ، ۹۸

... دل میں ذکر آہ کر ہوتا نہ خوبی
... ان اخبار سے جاسوس اڑ جاتا

کلیات اختر (واجد علی شاہ) ، ۹۴

گر مدینہ میں اس اخبار کا چرچا پہنچا
یعنی دلبند رسول عربی قتل ہوا

۱۸۰۵ مونس ، ۳ : ۲۹۸

... بلکہ بلند افروز اس اخبار وحشت ناک سے زیادہ تر پریشانی و حسبہ خاطر ہوئی۔

۱۸۶۹ بوستان خیال ، ۶ : ۳۶۶

[ع : جمع خبر (مس خ ، ب) ، واقعہ]

---بینی (ی مع) امث۔

---**روزنامے وغیرہ کا مطالعہ ، اخبار کی خبریں اور مضامین وغیرہ پڑھنے کا شغل۔**

پر دست آپ ہی کی ڈاک سے دوف اخبار بینی کی دارد ترم کروں گا۔

۱۹۲۴ اودھ پنچ ، ۹ ، ۴۴ : ۶

[ع : اخبار + ف : بینی (دیدن = دیکھنا) اسم کیفیت ترکیبی]

---**دیکھنا** روزمرہ۔

رک : **اخبار بینی۔**

اسی امید پہ اخبار دیکھتا ہوں میں
کسی طرف سے تو دل کی مرے خبر آئے

۱۸۷۰ دیوان مہر (الماس درخشاں) ، ۲۸۱

---**کا ہرکارہ** (فت ہ ، سک ر ، فت ر) امذ۔

ڈاک خانے کے نظام سے پہلے محکمۂ خبر رسانی کا پیک جو اخبار نویس کے ماتحت ہوتا تھا۔

خواب میں بھی یار تک ممکن نہ تھا دخل رقیب
جن دنوں اپنا خیال اخبار کا ہرکارہ تھا

۱۸۱۶ دیوان ناسخ ، ۱ : ۱۸

دل رہ چشم سے آنا ہے خبر دیتے ہیں
طفل اشک اسے اب اخبار کے ہرکارے ہیں

۱۸۴۲ مظہر عشق ، ۱۲۱

—— کے فرشتے (ف: ... میں ... تک نو) آمد۔

رک: " ڈراما کا بیں "۔

[illegible] اخبار کے [illegible]

۱۸۶۷ رسالہ ... ۱۰

—— نکلنا: روزمرہ۔

روزنامہ یا مقررہ وقفے سے شائع ہونے والا اخبار جاری کرنا، اخبار کی اشاعت کا کاروبار کرنا۔

اخبار نکالنا کوئی آسان کام ہے ... ہر اخبار نکالنا چاہیے۔

۱۸۹۳ امیر اللغات، ۲: ۹۲

قاہرہ میں بیٹھا ہوا ترکی اصلاحات کی تائید میں اخبار نکال رہا ہے۔

۱۸۹۹ ... سالہ عہد حکومت، ۲۸

——نویس

۱۔ روزنامے وغیرہ میں تحریر و انشا کا کام کرنے والا اڈیٹر یا نامہ نگار، صحافی، جرنلسٹ۔

تمام ہندوستان کے اخبار نویس ... کی نوبت حد کمال تک پہنچا چکے

۱۸۷۳ اخبار مفید عام، ۵ جنوری، ۲

کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے ان کا دوست ہوا تو انہوں نے اپنے دل کے غصے کو جھوٹ سچ باتیں حساب کر کے چھپوا کر نکلوا دیا۔

۱۸۷۳ تہذیب الاخلاق، ۲: ۵۱۰

ہندوستان کا اخبار نویس ان لوگوں کے عزم اور کوشش کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔

۱۹۲۲ نقش فرنگ، ۳۵

ترکی اخبار نویسوں کا جو وفد دلی آیا تھا وہ بار بار بڑے فخر سے اپنے آپ کو یوروپین کہتا تھا۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۲۳۳

۲۔ خبر رساں یا پیک جو ڈاک خانے کے نظام سے پہلے خبریں پہنچانے پر مامور ہوتے تھے۔

یمن میں اخبار نویسوں نے یہ حال لکھا۔

۱۸۲۴ فسانۂ عجائب، ۱۳۹

یہ جو دو چار ظفر ان کے ہیں اخبار نویس
تم بھی خط لکھ کے روانہ کرو ان کے خط میں

۱۸۳۹ کلیات ظفر، ۲: ۶۶

ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں۔

۱۸۵۹ خطوط غالب، ۱۲۵

قلعے میں جب پہنچا اخبار نویس تو غلط کر کے ترجمہ لکھ دیا۔

۱۸۸۸ طلسم ہوشربا، ۳: ۶۳۶

جچتے ہیں کس کی نظر میں ترے حکام و رئیس
حکم دے جلد کہ لکھ دیں ابھی اخبار نویس

۱۸۹۳ ریاض شمیم، ۱: ۲۱۳

ایک فرمان اعتراض آمیز اور احکام تہدید آمیز تمام اخبار نویسوں کو لکھے۔

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۸: ۳۱۵

[ع: اخبار + ف: نویس (نوشتن لکھنا) اسم فاعل ترکیبی]

—نویسی: اسم کیفیت۔

محمد ریحان علی خاں کو خطاب سے سرفراز فرما کر اخبار نویسی کی خدمت سپرد کی۔

۱۹۱۴ محل خانہ شاہی، ۵۵

اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔

۱۹۳۵ ہم عصر، ۲۰۰

اخباری (فت ا، سک خ)

(الف) صف۔

۱۔ اخبار (روزنامہ وغیرہ) کی طرف منسوب۔ جیسے: اخباری کاغذ۔

یہ نظم در اردو اخباری زباں
اس زمانے میں جو رائج ہے یہاں

۱۹۳۰ اردو گلستان، ۱۶

(ب) امذ، صف۔

۲۔(جعفری) غیر مقلد فرقہ جو صرف قرآن و احادیث کو قابل استناد سمجھتا ہے، نیز اس فرقے کا فرد یا افراد۔

عمل ہو اپنا جو اخباریوں کے مذہب پر
تو دھوکے . . . کریں خشک آفتاب سے ہم

۱۸۳۲ جرئین، ۱۶

اخباری وہ ہیں جو مسائل شرعیہ میں مجتہدین کی رائے کو بالکل دخل نہیں دیتے۔

۱۸۵۰ جامع الاحکام، ۲:۱۲

مولوی مرزا جعفر علی بنارسی جو شیعہ اخباری تھے، عظیم آباد آئے ہوئے تھے۔

۱۹۲۶ حیات فرہاد، ۱۲۶

[ع: اخبار + ف: ی (لاحقہ نسبت)]

اخبار (کس ا، سک خ) امذ۔

خبر دینے یا پہنچانے کا عمل، خبر رسانی، پرچہ نویسی، نامہ نگاری۔

قاصد اس سے حال میرا کہیو بے خطرہ ہو سب
کام ہے تیرا یہی پیغام اور اخبار کا

۱۸۵۸ کلیات تراب، ۲۳

غیر سے رسم بڑھانے کا عبث ہے انکار
آج کل شہر کا مجھ سے ہے تعلق اخبار

۱۸۶۸ واسوخت عیش، از نسخہ جوالہ، ۲:۶۵۵

اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات . . . دو اجزائے نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے۔

۱۹۲۳ سیرۃ النبی، ۳:۹۳

[ع: مصدر (خ ب ر) بر وزن افعال]

—— ہونا محاورہ۔

خبر دی جانا۔

دی امان اس کو ڈبونے سے جھول
یہ حدیث آیات میں اخبار ہے

۱۸۷۳ مطلع العجائب، ۵۲

اخبث (فت ا، سک خ، فت ب) صف۔

خباثت اور شرارت سے بھرا ہوا، حد کا خبیث۔

او بد ذات شریر . . . اخبث تیرا تیری جواں مردی اور اولوالعزمی کا بھی تقاضا تھا۔

۱۸۹۲ عمر و عیار کی سوانح عمری، ۳۲

جو آپ کی صاحبزادی کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے اخبثوں کا ایک اخبث ہے۔

۱۸۹۸ روزا لمبرٹ، ۱۳۷

[ع: اسم تفضیل (خ ب ث) بر وزن أفعل]

اخت (ضم ا، سک خ) امث۔

رک: اخ جس کی یہ تانیث ہے۔

ہمخوابہ کیوں نہ شیخ جی کی اونگھتی رہے
جو اخ موت نوم ہے یہ اخت نوم ہے

۱۸۱۸ انشا، ک، ۱۵۲

یہاں عمل دو اگر سونت ٹھہرا دیں تو وہ اخت
لاب ہو۔
۱۸۲۴ علم انفرائض ، ٦٥
——بند (ف ب ، غ ہ) (قدیم)
وہ گرہ جو بہناپا جوڑتے وقت لگائی جائے ، بہن بنانے کی رسم یا متعلق ، بہناپا۔
بمن سل ملا ممت لون مبت سات
اخت بند لے ھدوی رتن سات
۱٦٩٥ دیپک سنگ ، ۵۵ الف

اختبار (کس ا ، سک خ ، کس خف ت) امذ۔

امتحان ، آزمائش ، جانچ ، پرکھ۔
متعدد اختبارات کی بنا پر یہ امر قابل وثوق ہے۔
۱۹۱۸ تحفۂ سائنس ، ۱۳
اختبار و امتحان ھی سے علت کی غلطی یا صحت کا ادراک ہونا ہے۔
۱۹۲۸ اودھ پنچ ، ۱۳ ، ۴۷ : ۹
یہ کسی ایسے واقعے یا صورت حال کا بیان نہیں جس کو مشاہدے یا اختبار کا معروض بنا سکیں۔
۱۹۳۷ مقدمہ اخلاقیات ، ۲۵
[ع : مصدر (خ ب ر) بر وزن افتعال - حقیقت حال سے واقف ہونا ، آزمانا]

اختتام (کس ا ، سک خ ، کس خف ت) امذ۔

تمام ہونے کا عمل ، خاتمہ ، ختم ، آخر۔
نہ ہے ثنا کے لیے تیری اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لیے تیری انتہا و اخیر
۱۸۵۴ ذوق ، د ، ۳۲۴
چھوڑا نہ کوے یار کو دیوانگی میں بھی
مجنوں کے بعد ہم سے ہوا اختتام شوق
۱۸۷۲ مظہر عشق ، ۹۵

اس کے فضل بربر کا اختتام اور غایت نہیں ہے۔
۱۸۷۳ مطلع العجائب ، ۲
خلافت کا اختتام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تیس برس کے بعد مذکور ہوچکا ہے۔
۱۸۹۸ سرسید ، مضامین ، ۵۳
افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل ہی راہی ملک بقا ہوگئے۔
۱۹۳۵ چند ہم عصر ، ۳۳
ف : ڈرنا ، ہونا۔
[ع : مصدر (خ ت م) بر وزن افتعال - ختم ہونا]

اختتامی صف۔
وہ شاخیں جن پر اولین بیضے ہوتے ہیں ، اختتامی تارے کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔
۱۹۳۸ عملی نباتات ، ۱۷۰
چونکہ وہ ویدوں کے اختتامی حصے ہیں اس لیے ان کے ویدانت نام قائم رہے۔
۱۹۴۵ تاریخ ہندی فلسفہ ، ۱ : ۵۴
——پانا روزمرہ۔
پایۂ تکمیل یا خاتمے تک پہنچنا ، ختم ہوجانا۔
ایک ہزار دوسو تین بیس (بینتیس) میں . . .
اخبار رنگین اور مجالس رنگین نے اختتام پایا۔
۱۸۳۵ رنگین ، دیباچۂ دیوان ریختہ ، ۲

اختر (ف ا ، سک خ ، ف ت) امذ۔

۱ - ان چھوٹے چھوٹے نقطوں میں سے ہر ایک جو شب میں آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں ، ستارہ ، تارا۔

صفا مکھ نھیں پیتا ھوں سے ارغوانی
تو دندیاں سوں لڑتا ھے مریخ اختر
۱۶۱۱ قلی قطب شاہ ، ک ، ۲ : ۱۲۰

یہ زخم ناوک دل دوز ھیں مرے تن پر
کہ نہ فلک یہ نہ ھوئیں گے اس قدر اختر
۱۷۸۰ سودا ، ک ، ۲ : ۳۰۳

دیکھا جو کوئی اختر تابندہ ابر میں
یاد آیا زیر زلف بتا گوش سا ڈھکا
۱۸۳۵ کلیات ظفر ، ۱ : ۱۰۳

اللہ رے سرکی سب عرصہ کی اے صبا
چمکا کوئی فلک پہ نہ وہ اختر تمام رات
۱۸۵۴ دیوان صبا (غنچۂ آرزو)، ۳۶

سارے نہال نیض قدم سے ھوئے نہال
اختر بنے جو پھول تو صاحب بنیں نہال
۱۸۷۴ انیس ، ۱ : ۱

تابع جو اختروں پہ نشان سحر ھوا
ھر شمع گل ھوئی یہ قضا کا اثر ھوا
۱۹۱۲ شمیم ، ف ، ۱

۲ - (مجازاً) ستاروں کی گردش کے مقررہ حساب سے معلوم کیا ھوا طالع کا حال ۔

دیکھیو میری طرف سچ کہیو اے اختر شناس
کیوں فلک کو تونے دیکھا میرے اختر دیکھ کر

پھر دیکھنا اختر مرے تو ، بھلے منجم
تقدیر کا لکھا تو مٹا میری جبیں سے
۱۸۷۷ درۃ الانتخاب ، ۱۵۳

[ف: اختر ، اوستا: اخترہ ، پہلوی: اختر – قب ، س: نکشتر]

—— چمکنا محاورہ ۔
نصیب پھرنا ، قسمت کا یاوری کرنا ، دن پھرنا ۔

یا شاہ وہی یہ آپ کی دلبر کا نور ھے
اختر چمک رھا ھے کہ دختر کا نور ھے
۱۸۹۳ شمیم ، ف ، ۱۴

—— سوختہ کس صف (و ، ج ، سک خ ، فت ت) امذ ۔
بدقسمتی ، بدبختی ، بد نصیبی ۔

خال سرپے کا نہیں چاھیے زیبائش کو
اختر سوختہ ھے اپنا ھی زیبا ھم کو
۱۸۵۴ ذوق ، د ، ۱۵۱

[ف: اختر + (اضا) + سوختہ (سوختن جلنا) ترکیب توصیفی]

—— **شمار** (ضم ش) امذ ۔
رک : **اختر شناس** ۔

هنر مند عاقل تھا اختر شمار
انے جواب یوں دیا با کامگار
۱۶۳۹ خاور نامہ ، ۲۶۷

[ف: اختر + شمار (شمردن — گننا) اسم فاعل ترکیبی]

—— **شماری** (ضم ش) امث ۔
تارے گنتے رهنے (مجازاً) رات بھر جاگنے کا عمل ، شب بھر بے چینی اور اضطراب ، کروٹیں بدلتے رهنے کی کیفیت ۔

عجب حالت رھی ان سب پہ طاری
نہ تھا کچھ کام جز اختر شماری
۱۷۸۰ سودا ، ک ، ۲ : ۹۴

کیا کہیں کس شغل میں گزری ھمیں فرقت کی رات
کرتے تھے اختر شماری بستر غم پر پڑے
۱۸۵۶ کلیات ظفر ، ۳ : ۱۲۷

کس طرح کاٹے کوئی شب ھاے تار برشگال
ھے نظر خو کردہ اختر شماری ھائے ھائے
۱۸۶۹ غالب ، د ، ۱۳۹

تھتی تھی بانو نہ کیوں اختر شماری میں کروں
داد آنے ہیں سری آنکھوں کے تارے رات کو

۱۹۲۷ معراج سخن (جلیل)، ۷۳

نہ آہ و زاری کی ضرورت نہ اختر شماری کی حاجت۔

۱۹۳۱ رسوا (اختری بیگم)، ۲۵۹

[ف: اختر شمار (ر ک)+ی (لاحقہ کیفیت) ۔ تارے گننا۔]

——شمری (ضم س، فت م) امث۔

ر ک: **اختر شماری جس کی یہ تخفیف اور قلیل الاستعمال ہے۔**

تھا روز نخستیں غم شب ہائے دراز آہ
طفلی سے ہے اختر شمری مشغلہ اپنا

۱۸۵۱ مومن، ک، ۳۳

[ف: اختر+شمر (شمردن ۔ گننا) ۔ ی (لاحقہ کیفیت) = تارے گننا]

——شناس (کس ش) صف، امذ۔

ستاروں کی گردش کے مقرر حساب سے حالات و واقعات پر حکم لگانے والا، نجومی، جوتشی۔

میں دل کے ابر دھرتا ہوں بھی ہراس
جو بولیا ہے او مرد اختر شناس

۱۶۳۹ خاور نامہ، ۲۳۶

اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
ہو چھو اگر زمیں کی کہے آسمان کی

۱۸۱۰ میر، ک، ۵۷۱

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

۱۸۵۱ مومن، د، ۲۲

وہ علم جفر میں فخر زمانہ
بنے اختر شناس اس کے نشانہ

۱۸۶۲ طلسم شایاں، ۶

اس کو ہندوستان کے اخترشناسوں کی راست گوئی کا یقین ہوا۔

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۵: ۳۲۶

[ف: اختر + شناس (شناختن ۔ پہچاننا)، اسم فاعل ترخیمی]

اَخْتَرا بَخْتَرا امذ۔

ر ک: **اختر بختر۔**

اپنا اخترا بخترا سنبھالنے لگے، طنبورے بر غلاف چڑھانے لگے۔

۱۹۰۳ آفتاب شجاعت، ۴: ۱۳۵

ایک شخص دنیا سے منہ موڑ، اعمال کا اخترا بخترا سمیٹ سماٹ، سیدھا جنت کی راہ لیتا ہے۔

۱۹۲۵ اودھ پنچ، ۱۰، ۱۷: ۶

ادھر بہار رخصت ہوئی اور ادھر اس نے بھی اپنا اخترا بخترا سنبھالا۔

۱۹۲۶ شرر، مضامین، ۱، ۲: ۶۶۷

اِخْتِراع (کس ا، سک خ، کس ت) امذ۔

۱۔ ایسی چیز دریافت یا ایجاد کرنے کا عمل جو پہلے سے خیال میں نہ ہو، ایجاد، (کسی نئی بات کی) تخلیق۔

ہے سحر سامری تری آنکھوں کا اختراع
ترا حریف توکوئی کاہن نہ ہوسکے

۱۸۰۱ جوشش، د، ۱۸۰

یہ مشہور ہے کہ گاڑی خاص اختراع اہل ہند کا ہے۔

۱۸۰۵ آرائش محفل (افسوس)، ۳۲

طلا و نقرہ کا تنکہ جہانگیر کا اختراع تھا۔

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان ، ۶ : ۱۱۰

لوگ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ ایجاد و اختراع کرتے رہے۔

۱۹۰۶ الحقوق و الفرائض ، ۲ : ۸۹

ہر مشہور حکیم نے وجود عالم کے متعلق ایک جدید نظریے کا اختراع کیا۔

۱۹۲۵ فلسفیانہ مضامین (عبدالماجد)، ۳۰

قدرت کے . . اختراع و ابداع . . . کا قیاس بھی انسان نہ کرسکتا ، اگر عورت کی آفرینش نہ ہوتی۔

۱۹۴۲ مذاکرات نیاز فتحپوری ، ۱۳

۲۔ فنکارانہ ایجاد ، جدت ، اپج۔

اس شعر کی نہ طرح نکالیا ہے جب ولی
تو اختراع سن کے رہے دل میں سب عجب

۱۷۰۷ ولی ، ک ، ۵۷

یہ سادگی یہ وضع بھلا تو ہے کون شخص
جس بات میں کہ دیکھیے ہے تازہ اختراع

۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۷۱

ان میں ایجاد و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔

۱۹۰۱ حیات جاوید ، ۲۶

بعض تاثرات کے اظہار کے لیے . . ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے۔

۱۹۲۶ مکاتیب اقبال ، ۱ : ۱۴۵

انہوں نے صدہا محاورات و الفاظ کے اختراع میں دلچسپی لی۔

۱۹۳۶ ہنر مندان اودھ ، ۳۶

آرٹ کی تکمیل بغیر قوت ابداع و اختراع ہو ہی نہیں سکتی۔

۱۹۵۰ جہان بین ، ۵۵

۳۔(مجازاً) من گھڑت ، جھوٹ۔

سلطان علاؤالدین خلجی ، سلطان دھلی سے پدمنی کی آرزو کو منسوب کرنا سر تا پا افترا اور اختراع ہے۔

۱۹۳۹ پدمنی ، ۱۳۸

ف : کرنا ، ہونا۔

[ع : مصدر (خ ر ع) بر وزن افتعال]

فائقہ کس صف (کس خف ، فت ق) امث۔

وہ ایجاد جو فن یا سائنس میں شاہکار ہو ، ماسٹر پیس۔

ایک مضمون خالص فلسفیانہ رنگ میں ہو جسے جامعیت اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراع فائقہ کہہ سکیں۔

۱۹۲۱ مہدی ، مکاتیب مہدی ، ۹۹

اردو ادب میں یہ اختراع فائقہ ہوکر رہے گی۔

۱۹۳۲ اخوان الشیاطین ، ۶

[ع : اختراع + ف : ــ (اضا) | ع : فائق (رک) + ہ (علامت تانیث) ۔ فوقیت اور برتری رکھنے والی ایجاد]

اختراعات (کس ا ، سک خ ، کس خف ت)

امذ ، نیز امث۔ ج۔

نئی دریافت یا ایجاد کی ہوئی چیزیں یا باتیں ، ایجادیں۔

کچھ نہیں آگے تیری حکمت کے
اختراعات چرخ گردانی

۱۹۰۰ دیوان تسلیم (نظم دل افروز)، ۳۰۵

اختراعات جدیدہ نے سیکڑوں اور ہزاروں قدیم مستبعدات . . . کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا ہے۔

۱۹۲۳ سیرۃ النبی ، ۳ : ۶۷۰

آپ کے اختراعات کسی عجمی شاعر کو دکھائے جائیں۔

۱۹۲۴ اودھ پنچ ، ۱۹ ، ۳۹ : ۶

[ع : اختراع (رک) کی جمع (اردو میں مستعمل، عربی میں نادرست)]

اختراعی (کس ا ، سک خ ، کس ت) صف۔

"اختراع ،، (نمبر ۱ تا ۳) سے منسوب یا متعلق۔

جو قدرت اختراعی . . . ملک انگلستان میں دیکھی ہے یہاں عنبر عسیر بھی اس کی نہیں پائی جاتی۔

۱۸۴۷ عجائبات فرنگ ، ۱۶۲

نامہ بر تجھ نہیں دیا اس نے
تری باتیں سب اختراعی ہیں

۱۸۷۰ دیوان اسیر ، ۳ : ۲۷۷

اعراب چند اختراعی علامات کے ذریعے سے دکھایا جاتا ہے۔

۱۸۹۷ تمدن عرب : دیباچہ ، ۶۱

شام و کوفہ کے خطیبوں کو یہ دے حکم کہ جائیں اختراعی جو حدیثیں ہیں وہ لشکر کو سنائیں

۱۹۳۶ مراثی محب ، ۱۵۶

ایسی صورت میں یہ اختراعی معلوم ایک کلی مبہم شے ہونے کی نوعیت اختیار کر لے گا۔

۱۹۵۶ مناظر احسن ، عبقات : ترجمہ ، ۱۰۸

[ع : اختراع + ی (لاحقۂ نسبت)]

اختر بختر (فت ا ، سک خ ، فت ت ، ب ، سک خ ، فت ت) امذ۔

ساز و سامان ، اسباب ، برتن بھانڈا اور کپڑا لتا وغیرہ۔

وہ اپنا اختر بختر لے کر کوہ جود پر روانہ ہوا۔

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان ، ۲ : ۲۴۲

غالیچہ ، قالین ، دری ، رومال ، کوئی چیز بچھالیتی تب اپنا اختر بختر کھولتی۔

۱۹۰۸ صبح زندگی ، ۱۵۹

اگلے اسٹیشن پر اپنا اختر بختر لے کر اس درجے سے باہر چلا گیا۔

۱۹۱۴ راج دلاری ، ۹۶

[س : آستر (ستر = بچھانا) + وستر (کپڑا)]

اختزال (کس ا ، سک خ ، کس خف ت) امذ۔

رموز کے ذریعے کتابت کا طریقہ (جیسے خط سرو (رک) (مضامین سلیم ، ۱۳۵)

[ع : مصدر (خ ز ل) از افتعال = کاٹنا]

اختصار (کس ا ، سک خ ، کس خف ت) امذ۔

۱۔ کم یا کوتاہ ہونے یا ہوجانے کی کیفیت ، گھٹاؤ ، قصر ، (طول کی ضد)۔

وعدہ ہے وصل یار کا واہ رے بخت نارسا
اول شام سے ہوا پہلے ہی اختصار شب

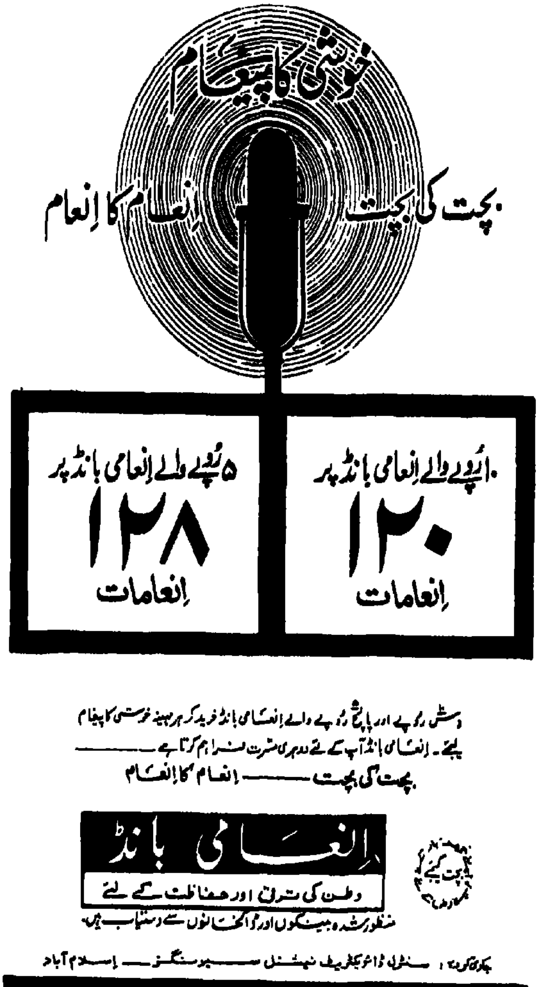
۱۸۶۴ نسیم دہلوی ، د ، ۱۱۷

طول حیات ہے سبب کثرت گناہ
عاقل وہ ہیں جو چاہتے ہیں اختصار عمر

۱۸۷۰ دیوان واسطی ، ۷۵

دماغ کا اختصار اور بھیجے کی کمی ان کی گفتگو کو بے معنی سا کر دیتی ہے۔

۱۹۴۷ فرحت ، مضامین ، ۳ : ۱۳۱


خوشی کا پیغام
بچت کی بچت انعام کا انعام
۱۰ روپے والے انعامی بانڈ پر
۱۲۰
انعامات
۵ روپے والے انعامی بانڈ پر
۱۲۸
انعامات
دس روپے اور پانچ روپے والے انعامی بانڈ خرید کر ہر مہینے خوشی کا پیغام لیجئے۔ انعامی بانڈ آپ کے لئے دوہری مسرت فراہم کرتا ہے ———
بچت کی بچت ——— انعام کا انعام
انعامی بانڈ
وطن کی ترقی اور حفاظت کے لئے
منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے دستیاب ہیں
بچت کیجئے
جاری کردہ : سنٹرل ڈائریکٹوریٹ نیشنل سیونگز ——— اسلام آباد
ORIENT